اُلجھے راستے

جرم و سزا کی ایک کہانی

عنایت اللہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پیش لفظ

بہت عرصے کی بات ہے، میں چند ایک ادیبوں کی محفل میں بیٹھا تھا۔ بات افسانوی ادب کی چل رہی تھی (ذکر جرم و جاسوسی کا آگیا۔ ایک ادیب نے کہا کہ جرم و جاسوسی اردو ادب کا حصہ نہیں بن سکتی کیونکہ اردو میں اس صنف کی اس معیاری کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی جیسی انگریزی میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے ادیبوں نے اس کی تائید میں کہا کہ اردو ادب میں اگر جرم و جاسوسی کا اضافہ کرنا ہی ہے تو چینی ملکی کہانیوں کے ترجمہ کا سہارا لینا پڑے گا۔

ایک ادیب بولے کہ جرم جاسوسی کی کہانی کا بننا یا بننے کے لیے تجربے مشاہدے کی ضرورت ہے مگر جس چیز کا وجود ہی نہ ہو وہ مشاہدے میں کیسے آسکتی ہے!

مجھے یہ دلیل اس لیے پسند نہ آئی کہ ہمارے معاشرے میں نہ صرف یہ کہ جرم کا وجود ہے بلکہ ہمارے ہاں جرم کا اس قدر عمل دخل ہے کہ جرم و جاسوسی پر غالب آگیا ہے۔ یہاں تک کہ مجرم و بنیت کے افراد معاشرے کے باعزت افراد بن جاتے ہیں اور دوسرے سرکاری مشینری کے کل پرزوں کو اپنی مٹھی میں لے لیتے ہیں۔ اس اونچے۔ بلند سے نیچے اگر دیکھو تو ہمیں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو ہتھکڑیوں کو زیور، پولیس والوں کو اپنے بدلیاں سمجھتے اور جیل خانے کو سسرال کا گھر سمجھتے ہیں۔

میں نے اس محفل کے ادیبوں سے کہا کہ غیر ملکی ادب میں جرم و جاسوسی کو ایک خاص مقام دیا گیا ہے۔ اردو ادب میں بھی اس صنف کی معیاری کہانیاں لکھی جانی چاہئیں میرے ادیب دوست چونکہ رومانی کہانیوں کو مسل سمجھتے ہیں اس لیے وہ محنت اور مشاہدے کے کھٹ بھٹ سے بچنے کے لیے یہی کہتے رہے کہ ہمارے معاشرے کے پس منظر میں ایسی کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔

لکھی تو کبھی میں نے بھی نہیں تھی لیکن میں نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور کہیں کہیں افسانہ نہیں، پورا ناول لکھوں گا جس میں ان کرداروں کو پیش کروں گا جو پیشہ ور مجرم ہوتے ہوئے "اونچے درجے کے افراد کہلاتے ہیں اور سرکاری حلقوں میں بھی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جرم و جاسوسی ایک مہم صنف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں ترجموں کے ذریعے آئی ہے اور صرف ان کہانیوں کے ترجمے کر کے شائع کیے گئے ہیں جن میں فحش، رواں انگیزی اور کردار سوز لذت پائی جاتی ہے۔ انہی دلچسپیوں کی بدولت ہمارے ہاں بڑا ہی گھٹیا ادب مقبول ہوا اور اچھے ذوق کے لوگوں نے اسے دھتکار دیا۔

میرے سامنے یہ ناول لکھنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ادبی ذوق رکھنے والوں کو قائل کر سکوں کہ جرم و جاسوسی بھی ادب کی ایک صنف ہے۔ البتہ اس کے لیے گہرے مشاہدے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس میں حقیقت کا رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔

چنانچہ میں نے مری کے گھنے جنگلوں، بیچ در بیچ سبزپوش وادیوں، گھنی جھاڑیوں اور لمبے لمبے پیڑوں میں ڈھکی چٹانوں کے بیچ منظر میں یہ کہانی لکھی ہے۔ کہانی کا تانا بانا معاشرے کی متضاد قوتوں کے خوبرو تصادم سے بُنا ہے۔ مجرم اور معصوم، مخلص اور عیار، امیر اور غریب، آقا اور غلام، اپنی اپنی راہ چلتے ایک دوسرے کے راستے میں آ جاتے ہیں اور ان کے راستے یوں الجھ جاتے ہیں جیسے کئی پتنگوں کے پیچے لڑ گئے ہوں۔

الجھے راستوں، بیاباں کیتے کو متضاد ذہنیت کے انسانوں کی الجھی ڈوروں کو سلجھانے کے لیے پولیس آتی ہے تو پولیس کی اپنی پتنگ ڈولنے اور کٹنے لگتی ہے، پھر ایک ایسے ذرائے سے پردہ اٹھتا ہے جسے میں نے محبت کے خون اور نفرت کی سیاہی سے لکھا ہے۔

ایسے ڈراموں کی سٹیج کو ہم اپنے ہاتھوں سجایا کرتے اور تماشہ دیکھا کرتے ہیں۔

میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں؟ ـــــ اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

ساونے کی دوراہے کی کہانی

مری کی ترائیوں سے بلند یوں تک کھڑے لانبے لانبے پیڑوں کے جھنڈ بڑی زور سے چیخ رہے تھے، بھیروں کی چیاں اور دھی میں بکھر کے اڑی جدھر بھی تھیں۔ شاہ بلوط، ناشپاتی اور جنگلی اخروٹوں کی گھنی شاخوں اور سنتھے کی گندھی گٹھی بھاری جڑیں ہوا کے غول چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو لہو لہان کر رہے تھے۔ گھونسلوں کے تنکے بادلوں سے لدی آندھی کے ساتھ کبھی کے اڑ گئے تھے۔ بیچ کھچ کھوہوں، کھدروں اور گرے پڑے جھونپڑوں کے کھنڈروں میں جا چھپے تھے۔ کچھ رہی گئے تھے اور ندیوں کے گہرے مٹیالے تیز پانی میں بہے جا رہے تھے۔

چاند گھناؤں کی دبیز تہوں میں دبک گیا تھا اور گھٹائیں وادی میں اُترا اُتر کر برس رہی تھیں۔ مری شہر کی سلیٹی اور سرخ چھتوں پر بارش کا وہ شور جیسے لوہے کے پل پر لسی لسی، پل گاڑیاں، ایک دوسری کے پیچھے، آندھی کی رفتار سے تیز گزرتی جا رہی ہوں۔ طوفان باد و باراں سے دیواریں اور کواڑ لرز رہے تھے۔ بھیری ہوئی نرمال پہاڑوں کا دل چیر رہی تھیں۔ پتھر بجے جا رہے تھے۔ دور نیچے مری کی ترائیوں میں ناول جھیل کی نیلی نیلی وسعت مٹیالے پانی سے گدلی ہو کر پھیلتی جا رہی تھی۔

ایسی ہی طوفانی رات ایک جواں سال آدمی۔ خاکی رنگ کے موٹے کھدر کی شلوار اور قمیض، سر پر کافانی ٹوپی اور پاؤں میں کرتے تلے کی چپل پہنے۔ مری سے خوانہ اور کلاڈ اور کوئلہ روڈ کے چوراہے کے قریب ایک صدی پرانی ٹوٹی کے کھنڈر میں کھڑا تھا اس کے قریب اس کی سیاہ کالے رنگ کی گھوڑی کھڑی تھی۔ طوفان کی تندی اور بارش کے دنانے دار جھینٹل سے گھوڑی بدک بدک جاتی تھی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

وہ پہاڑوں کے بیچ ۶۰ برس کا رہنے والا تھا لیکن وہ اُس ویس کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا مری کی سبز پوش وادی میں وہ اجنبی تھا۔ گھڑی ساتھ نہ ہوتی تو وہ کسی صحیح میں ہی جا مرچھپا تا۔ مری میں اسے طوفان تھمنے تک رکنا تھا۔ رات کے اندھیرے اسے کل رات بھی نہیں روک سکے تھے۔ پرسوں رات اس کی گھڑی نے کیس دم لیا تھا۔

ویران کوٹھی کے جس کمرے میں وہ گھرا تھا اُس کے کواڑ کسی نے کھا لیے تھے، باقی انسان اکھاڑ لے گئے تھے۔ چھت پنک کھ اور بہزاد ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ سے سلیٹیں اکھڑ کے گڑیوں تھیں گیٹ اندھیرے کمرے کا فرش پانی میں ڈوب جاتا تھا۔ یہ انگریزوں کے زمانے کی دو کانکان معلوم ہوتا تھا جو شاید بعد میں انہیں کیلوں کے مرنے یا نکلنا ان چلے جانے کے بعد آسیب زدہ جان کر کسی نے اُنہیں گرا دیا تھا۔

گھٹا میں یک بارگی گرج اٹھیں۔ ساتھ بجلی چمکی تو گھڑی جرک کے منسنائی اور بھڑ اٹھنے لگی۔ اجنبی نے اسے گلوں پر تھپکی دی اور گال اس کے منہ سے رگڑ کر پیار سے بولا۔ "ہاں تمہاری ہی ہوتی ہے تو ذرا بلا سفر باقی ہے"

گھڑی نے اجنبی کو یوں سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ سفر ابھی تمہاری منزل کہاں ہے تیری؟ اجنبی کے پاس ایسے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اسے بنی نوع کا کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے ویس سے چلا آیا تھا لیکن اپنی دوا کے بھی نہ ہو سکا تھا کہ اُس ویس کو جا رہا ہے۔

گھڑی ایک بار پھر منسنائی تو اجنبی کا وہ گھڑی ٹھوکی سے اور اسے پانی پہ بیٹھ گئی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ وہ گھڑی کی باگ تھامے کمرے سے کل کر برآمدے میں آیا۔ برآمدے کی چھت پر دو بجلی پلیٹیں بڑی تھیں۔ بارش کا زور ذرا تھم گیا تھا لیکن ہواؤں کی تندی ابھی ویسی ہی تھی۔ اجنبی کو معلوم تھا کہ تھوڑی ہی آگے مری شہر آباد ہے۔ مگر اسے یہ احساس بھی تھا کہ ایسی طوفانی رات شہر کا کوئی فرد اس کی دستک پر نہیں کھلے گا۔

ٹھوکر پہ پہ کی گھڑی تھوڑی ہے سوار کے کندھے پر۔ کوہ دھیمے سے منسنائی تو جیسے کوئی خیال گیا ہو وہ خود بھی نہ جانتے پیاسا بھی اور تھکا ہوا بھی ہے۔ اسے خدشہ تھا آنے کا لیکن گھڑی کی ٹھوکر اور بیاس نے اسے مجبور کر دیا۔ اُس نے اپنی گھڑی کو کبھی یوں ٹھوکا نہیں رکھا تھا لیکن آدمی اور بارش نے اسے تین گھنٹوں سے اس کھنڈر میں قید کر رکھا تھا۔ اس لئے کال گھڑی کی ٹھوکتی سے لگائیے۔ جنریٹروں کی چھت تک گھڑی بارش میں منسانی بڑی تھی اور اب پانی پینے لگی تھی۔

وہ جیسے اپنی بے بسی پر تڑپ اٹھا۔ بارش، پانی پر نی طلب تھی تھی چیزیں بھی تھیں لیکن وہ گھڑی کو اور زیادہ ٹھوکا اور پیاسا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بیلا کی گھڑی کی طرف اس کھنی سفر میں اس کا ہمسفر نہیں تھی بلکہ یہ اس کے لوگوں کی ساتھی تھی۔ وہ گھڑی کی باگ تھامے برآمدے سے باہر نکلا اور بجلیوں کو ماند ہوتا دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ دو کیس سے گھڑی کے لیے دو کنی دانہ حاصل کی جا سکتا تھا۔ گھڑی بجلیوں سے گزر تے قدم قدم پر کپکپ تھی اور بر بلی میں منہ مارتی تھی اور اپنی آگ کھینچ کر اسے پکارتا تھا۔ وہ پہاڑوں کا باسی نہ تھا۔ جانتا تھا جنگلی بھیڑیوں کی چیخ کبھی بھی سوتی ہے اور خونی سانپ بھی نہ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔

وہ سڑک پر چل پڑا مگر ٹھوکی گھڑی کی سمت کا ہی تھا۔ اس کے کپڑے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے اور تیز ہوائیں اس کی کھال نوچ رہی تھیں۔ پہاڑوں کے پتھر اس کے گرد ٹھوکروں کی طرح خراب ہے تھے۔

اس جیسے تاک شہر میں اسے سال کی پیدا بھری اتنا سنائی دینے لگی۔ روٹھی ٹھوکھی کھا کے گزر ہو رہی ہے بیٹا پر ویس نہ جا جانے کیوں دو سالگانے سے جیل جانا نہ ہوتا؟

گھر سے نکلنے سے ایک دن پہلے۔ کوئی چاند ان گزرے۔ ماں نے اسے ایک طوفانی رات کی ہنسیوں اور دادت سنائی تھی یہ سہ سترہ برس پہلے کی واردات تھی جوان سے۔ اتنی مدت سے بیتنے دن گر کبھی تھی مگر رات کو میں بلی چھتا بیوں کی طرح نکلتی رہی تھی۔ اور چار روز گزرے اس نے اپنے بیٹے کو یوں بتایا ہی سنا ہی جیسے سکتی چھتا۔ ہاں تمہیں بھی کرینے تو جلا کے نکل تھی ہوں۔ وہ شاید اب بھی اُن انگاروں کو بیتنے میں دیا کے بکتی لیکن جیل جوان ہو گیا تھا اور کہتا تھا کہ کسی شہر میں جا کر نوکری یا کوئی ایسا کام کرے گا جس سے وہ ماں کو محنت مشقت سے نجات دلا سکے۔ انگاروں اسے رکھتی تھی کہ جیلیا پر ویس جا نہ جا جیل قیس ان نا تھا۔ ماں نے اپنے کو دو ہاتھ مرنے پاؤں کا دہشت میں تبدیل کرنے کے لیے جیل کو ایک پرانی واردات سنا دی تھی۔ فراس کا اثر اُلٹا ہوا۔

جس وقت سے ماں نے اسے یہ بھیانک کہانی سنائی تھی جیل اُٹھ اٹھ کر باہر کو بھاگنے لگا تھا اور احتقام کے شعلے اسے بھی پانچنے نہ دیتے تھے۔ سولہ سترہ برس پہلے تو وہ نکھا سا تھا لیکن آج وہ گٹھا ہوا گھبرو جوان تھا ٹھوکا ہوں سے بنوا زادہ ہو ہوتا تھا اور احتقام بھی کے ملکے تھا جو گرگاں نے آلی تھی وہ دیتے نے گل ہی تھی اور اس کی طلبیں اسے آج رات بھی کو ادوی کے نکلاں میں لے آئی تھی لیکن اُسے ابھی معلوم نہ تھا دراس کی منزل مری سے بائیں اور اور منزل جہاں کس بھی سے کتنی دور ہے وہ سڑک پر جا چلا جا رہا تھا اور اسے سال کی سنائی ہوئی کہانی یا آج کی جو ایسی ہی ایک طوفانی رات کی جزیرہ داستان تھی۔ اس کے جسم سے باہر تھا مگر سترہ برس پہلے کی داستان یا آج تو اسے بارش کے قطرے، انگاروں کی طرح جلا رہے تھے گھڑی اس نے پیچھے پیچھے چلی ابھی تھی۔ دخت سے نکلتی ایک بیل نے اندھیرے میں اس کی راہ روک لی۔ اس نے بیل کو پکڑ لیا اور اس نے بیل کو ٹھوکر پر پھینک دی۔ اس کے سامنے چٹان آ جاتی تو اس سے بھی ٹکرا جاتا۔

وہ مری کے قریب پہنچ چکا تھا اور سڑک کے کئی موڑ کاٹ کر کشمیر پوائنٹ سے گزر رہا تھا کبھی کبھی تو اسے بلند ہی پر غیر ٹھک کے سفارت خانوں کی کھیلیاں نظر آتی تھیں۔ وہ بھی مری شاید کوئیوں کی بستی ہے جہاں اس جیسے مسافروں کے لیے خوشبو نہیں بجلی نے ایک بار پھر سڑک کو اسے ایک راستہ دکھا دیا جو دور نیچے اترتا تھا۔ وہ اسی راستے نیچے اترنے لگا۔ وہ اس چہرہ پر اس راہ پر چل رہا تھا کہ نیچے کوئی گاؤں ہوگا۔ گھڑی قدم جما جما کر اتر رہی تھی مگر اس کے اپنے پاؤں پھسل رہے تھے۔ وہ گھڑی پر قدم بیٹھا رہے گھڑی اسے دو نیچے سے کئی جہاں سیلابی پانی کی لہریں بہی جا رہی تھیں۔

وہ ایسے ہی بھاگتی طلاتے کو جانتا تھا۔ پہاڑوں کی بلندیاں اور پستیوں سے اور نشیب فراز سے واقف تھا۔ سیلابی ندیوں سے بھی نا تھا۔ مری کے دامن میں جس سیلابی ندی نے اُسے روک لیا تھا۔ اس کا شور خوفناک تھا۔ کوئی نا واقف ہوتا تو آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرتا لیکن جیل لہروں اور موجوں کے اس شور سے نہ ڈرا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صرف شور ہے اور ندی کی گہرائی اتنی نہیں ہوگی جس میں وہ دب جائے گا۔

اس نے لگام کو کسا جھٹکا دیا گھڑی منہ زور میں کے ساتھ لگا کر چل پڑی اور اس نے پانی میں قدم رکھے۔ گھڑی جیسے

www.pakistanisociety.com

پانی کو سونگھ کر بدلی اور سیلاب کی تندی کا اندازہ کر رہی تھی۔ موجوں نے اس کے پاؤں اکھاڑنے کی بہت کوشش کی، پانی میں اس کی ٹانگیں ڈوب گئیں لیکن گھوڑی ثابت قدم رہی۔ پانی گہرا ہوتا چلا گیا اور دریا چلی گھوڑی جمیل کی طرح گھوڑی بھی کوہستانی نہروں سے واقف تھی۔

پار جا کر جمیل رک گیا۔ بارش کی شدت اختیار کر گئی لیکن جھکڑ کی تندی اور تیزی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا جنہیں ایسی جھیلوں میں بین کر رہی ہوں اور گرج کی شدت سے چیخ بھی رہی ہوں جمیل کو اپنی چہاڑی جس تیاری کو بہاں کوئی کوئی ضرور ہوگا، وہ جانتا تھا کہ جس کی گھاٹ میں اسے پناہ مل سکتی ہے وہ کسی نیستی میں ہی ہوگا۔ بلندیوں پر رہنے والے پستی میں اور ایسے مکانوں میں رہتے ہیں جن کا بلیہ آندھیاں اور بارشیں کچھ نہیں بگاڑ سکتیں بلکہ وہ باد و باراں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہی ان بلندیوں پر آتے ہیں۔

جمیل اُس (ہا) کا باسی تھا جو تہذیب جدید کا نمونہ بن گئی۔ اپنا اور اپنا وہ کھلاتی ہے۔ اس دنیا کا یہ دستور ہے کہ کسی مسافر کے کیس رات آجاتے تو قریب کے گاؤں کے کسی بھی دروازے پہ جا دستک دینا ہے۔ دروازہ کھل جاتا ہے اور مسافر وہاں کا مہمان ہو جاتا ہے۔ بیرونی مہمانوں کو اہل گھر آپس میں ٹھہراتے ہیں۔ ظلمی سے دشمن بھی آجائے تو اس کے آگے بھی آنکھیں بچھاتے ہیں جو کسی کے دروازے پر پہنچ کر بھی کسی رات کو دستک نہ دیتی تھی اور وہ مسافر کے اور تھکے ہوئے مسافر کو رات بھر اپنے گھر میں ٹھہرا کر اور اسے کھانا کھلا کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔

آج رات جمیل اپنے گھر سے دُور کسی گاؤں کی تلاش میں دریا اُبور سے اتنی پیچھے گیا تھا۔ اسے گھوڑی کا پیٹ بھرنا، اس کا جسم خشک کرنا اور اسے آرام دینا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ توقع بھی تھی کہ گاؤں میں اسے اپنے جیسے لوگ مل جائیں گے جو اس کی دلجوئی کریں گے کہ اسے نوکری کہاں مل سکتی ہے یا کیسی نوکری مل سکتی ہے۔

اونچی نیچی زمین پر اس کی گھوڑی چلتی رہی۔ اونچی چٹانوں کے دائیں بائیں سے مڑتی رہی۔ بجلی چمک چمک کر جمیل کو راستہ دکھاتی رہی۔ وہ جھکڑ کی تندی میں آنکھیں میچ میچ کر دیکھتا رہا۔

تھوڑی ہی دُور آگے جمیل کے لاہے پتوں اور بیل بوٹوں سے لدی ہوئی ٹیکریں، چٹانوں اور ان کے پیچھے پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں ایک جگہ نیچے سے اوپر تک جھکے ہوئے درختوں اور جھومتے ہوئے پہاڑی ڈھلانوں پر کچھ سے ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ہری بھری کھیتیاں سبز ہیروں کی طرح نیچے سے اوپر تک چلی گئی تھیں۔

کچے مکانوں اور پکے گھروں کی اس بستی میں رات تاریک تھی اور طوفانی زناٹوں اور بجلی کی چمکوں سے ذھوز بکھر رہا تھا۔ ایک مکان میں اخوداد کھاٹ پر بیٹھا زاہل کا حقہ پی رہا تھا۔ کمرے کے وسطا میں لوہے کی انگیٹھی پر کیتلی رکھی تھی۔ نیلو ہ اخوکش لکار لرزتی محبت کی طرف، پھر دیکھتے گاؤں کو بے چینی سے دیکھ رہا تھا چھت پر بارش کی ریل گاڑی بھاگی جا رہی تھی۔

اخوداد زاہد سی سے چھین ہو گیا۔ اس نے کیتلی سے نکلتی ہوئی بھاپ کو دیکھا اور گہرے پھیپھڑوں کا تمام تر دھواں نکال چلایا ــــــ

"ساجی!" اس نے مختصر اور بے چین نگاہوں سے بند دروازے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر چلایا۔ "ساجی بیٹا!"

کلاڈھا کے سے کھلے اس کے ساتھ باد و باراں کے بُرزہ تھپڑ سے اور ایک نوجوان پہاڑی اندر آئی بال بکھرے ہوئے کپڑے

www.paksociety.com

ڈھانپ رہے تھے اور سر کی اوڑھنی نڈھال سی تھی۔ وہ آئی تھا مگر لمحہ بھر پہلے ہی دادا کی کھاٹ تک پہنچ جاتی۔

"تو نے کھول کی بھی دادا!" ــــ ساجی نے ہاتھوں اور چہرے کے دھکے سے کواڑ بند کر کے کواڑوں کو زنجیر سے جکڑ دیا اور اوڑھنی سینے کے اُبھار پر پھیلا کر بولی۔ "جنگلوں کی رسیاں چھوٹی کر آئی ہوں۔ ہم تو بچوں کی طرح بلکتے پھرے ہو دادا!" ــــ اس نے چہرے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا اور پک کر سگریٹوں کا گول ڈبہ اٹھایا۔

"بہت بڑھا ہوگیا ہوں بیٹا" ــــ دادا نے بیٹھ کر بھرپور گھر دل سے لہجے میں کہا۔ "قصہ نہ سنو تو نیند کہاں آتی ہے؟"

ساجی نے سگریٹوں کے ڈبے سے سبز چائے کی پتی سنبھال پرانڈیل کیتلی میں ڈال دی اور کہا۔ "رات ابھی تو گزری بھی نہیں ہوئی دادا، تم تو اتنی جلدی سو جی جاؤ گے؟"

"سو ہی جاؤں تو اچھا ہے بیٹی!" ــــ دادا نے آہ سے کہا۔ "ایسی طوفانی رات کو بھولی بسری باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ دل ڈھکنے لگتا ہے ساجی بیٹی!" ــــ اُس نے طویل آہ بھری اور چہرے سے مٹھے کا کش لگا کر بولا۔ "اُس رات بھی بادل بڑی زور سے گرجے تھے جس رات تیری دادی کو اس کٹیا میں ڈلمن بنا کے لایا تھا اور میں رات بھر سے اُتنے خبر لیا تھا۔ اُس رات بھی آندھی اور بارش چھینں بلا رہی تھی۔ جنگلوں کے کونے کھدرے آتی تھی جیل کا شہتیر تو رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا۔"

اُس نے ایک اور کش لیا اور حقہ ساجی کے ساتھ آیا لیتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ رات بھی طوفانی تھی میں رات میں تیری ماں کی ڈولی لایا تھا ــــ اس کی آواز رندھیا گئی پھر ہلکی سی لے کے بولا۔ "تو کیل ان سب کی نشانی رہ گئی ہے۔"

"بھول بھی جاؤ دادا!" ــــ ساجی نے کیتلی میں الائچی کے دو دانے پھینکتے ہوئے اُن سی جھنجلاہٹ سے کہا۔ "جو رہ گئے وہ دل سے ہی اتر جائیں تو اچھا۔ طوفان آتے ہیں جو جاتے ہیں جو جاتے اپنے ساتھ کیا اُڑا لے جاتے ہیں۔ کوئی کس کس کو یاد کرے۔ تم تو ماضی کی رٹ لگائے رکھتے ہو۔"

اخوداد عمر کی آخری منزل میں تھا اور ساجی نے ابھی جوانی کے راستے پر قدم رکھا تھا۔ اسے بھی اپنی دادی، اپنی ماں اور اپنا باپ یاد آتے تھے۔ اس کا دل اداس ہو جاتا تھا مگر اس کے خوابوں اور تصورات میں کبھی اُداسی نہیں آئی تھی۔ اخوداد پیچھے دیکھتا رہتا تھا اور ساجی کی پُرشباب نگاہیں آگے دیکھ رہی تھیں۔ اسے تصوروں میں دور ستارہ نظر آ رہا تھا جس پر اس کی ماں اتارے گی اور اس کی ڈولی جا سکے گی کہیں اسے لیجا معلوم نہیں تھا کہ وہ کون اور کیسا ہوگا۔ وہ جیسا کیسا بھی تھا، اس کے تصوروں میں جب آتا تھا تو شہزادہ لگتا تھا۔

"پر ایک بات تجھے معلوم ہے بیٹا!" ــــ دادا نے رنجیدہ سے پیار سے کہا۔ "دیکھتے ہیں طوفان آتے ہیں تو بچھڑے ساتھی مل جاتے ہیں یا پہلے ساتھی بچھڑ جاتے ہیں۔"

ساجی کو جھنجلاہٹ سی ہوئی۔ دادا ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ ساجی نے دادا کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اسے کہنا چاہتی ہو کہ دیکھ میری لڑکی ہے۔ کوئی ایسی بات کیا کرو جو مجھے بھی بھی لگے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

مگر اندر کھٹکے میں صدا!

Scanned By Nisar Ahmed

"وہ تو شام سے کھٹک رہے ہیں" — ساجی نے انگیٹھی سے کیتلی اتارتے ہوئے کہا۔ "رات بھر کھٹکتے ہی رہیں گے۔ یہ بھاگ آتی جلدی کیسے سمجھتے تھے!"

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

"دیکھ تو لے ضیا! یہ ہوا تو نہیں..... دیکھ لے شاید کوئی آیا ہو!"

"ہمارے ہاں کیسے آتا ہے دادا!" — ساجی نے اکتا کر کہا۔ "پہلے بھی کسی نے ہمارے ہاں دستک دی ہے کبھی؟"

ساجی جیسی کے جھونے سے پیالے میں قہوہ ڈال رہی تھی کہ باہر سے گھنڑی کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ قہوے کی دھار رک گئی۔ دادا کا حقہ خاموش ہو گیا۔ ساجی کی شرمگیں آنکھوں میں بھاگنا۔ باہر کے ماحول میں باش اور شمند ہواؤں کے جھکڑ ہے تھے لیکن کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

گھنڑی ایک دم پھر ہنہنائی تو دادا جو پہلے ہی چونکا ہوا تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے عمر کے ستر کچھ برس ٹھوڑی تھجکتے گزار دیئے تھے۔ ان بے زبانوں کی زبان سمجھتا تھا۔

"ساجی بیٹا!" — اس کے لہجے میں تیزی اور ضروری پن تھا کہنے لگا۔ "دروازہ جلدی کھول دے۔ کوئی مسافر ہے گھوڑ گھڑا آواز بتاتی ہے کہ بھوکا ہے۔ گھبرایا ہوا ہے۔"

ساجی بھاگ کے دروازے تک پہنچی اور بیکر کھول دی۔ مدہم کک جھکڑ کے بے قابو تھپیڑوں نے کواڑوں کو ایسا پٹخا کہ ساجی کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس کے ریشمی بال جو گلابی چہرے پر بکھر آئے تھے، اور منی کے ساتھ پیچھے گزار نے لگے اور تند ہواؤں نے ساجی کے شباب کے نشیب و فراز کو بے نقاب کر دیا۔

دروازے میں ایک اجنبی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی کالی گھنڑی کھڑی بے چینی سے کھر مار رہی تھی۔ دونوں کے جسموں سے پانی بہہ رہا تھا۔

اپنے گاؤں کے سبھی مرد جوان بھی اور نوجوان بھی، ساجی کے دیکھے بھالے تھے۔ ان میں قریب بھی تھے، کم خرچ بھی۔ ان میں گورے بھی تھے، دبیز سانولی رنگت والے بھی لیکن ساجی نے کبھی کسی کی طرف دھیان نہیں دیا تھا حالانکہ ان سب کا دھیان ساجی پر لگا رہتا تھا لیکن اجنبی کے بارش سے دھلے دھلائے چہرے سے پانی ٹپکا نے کی قربت اور چہرے کے تھکے تھکے رہ گئے سے ساجی کو جانے کیا نظر آیا کہ وہ کھلا کے دم بخود ہو گئی۔

"کون ہے بیٹا؟" — بابا ہاں کے ہنگامے میں دادا کی بے چین سی آواز سنائی دی۔ ساجی چونک اٹھی اور اجنبی کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"مسافر ہوں!" — اجنبی نے پہلی آواز سے جواب دیا۔

"تو اندر آجاؤ نا!" — ساجی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "باہر باش میں کھڑے بھیگ رہے ہو!"

مگر وہ دل بھر کی بھوکی تھی اور پیاسی بھی! — مسافر نے ایسے لہجے میں کہا جس میں التجا کم اور متانت زیادہ تھی۔

"اندر کیوں نہیں چلتے؟" تب ساجی بولی! — دادا نے جلا کر کہا۔ "تیرے اوپر ہاں جو کوئی بھی ہے کوئی بندہ کر دو!"

مسافر — کچھ کہے بغیر ساجی نے اس کے ہاتھ سے گھنڑی لی گلے لی اور مسافر کو اندر بھیج کر خود باہر نکلی اور باہر سے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ وہ مرجیسیوں کے کمرے میں جلتی جب گھنڑی اندھیرے کمرے میں پہنچی تو جانی ہے ہنسنا نہ چاہے کی نوٹ سے دو بے قرار شرمگیں جاری تھی۔ ساجی نے آگ کچھ تیز کی اور خول کو دیوار کے سوراخ تک پہنچا دیا۔ جہاں ماچس اور منی کا دبا رکھا تھا اس نے دیا جلایا اور دیکھا، گھنڑی جلیس کی ٹھرلی پر طبل بول چکی تھی۔

دیسنے کی زرد نوں میں ساجی کو اپنی کالی سی گھنڑی بڑی ہی پیاری لگی اور اس پر کسی بھوکی زین دیکھ کر بے اختیار اس کے جی میں آتی کہ چھلانگ کر گھنڑی پر سوار ہو جاتے۔ دادا کے برعکس بھی گھڑیاں جھک کے کک کتی جیسے گھنڑی کا خبرہ سوار زین پر بیٹھا مسکرا رہا ہو۔ گھنڑی بے صبری سے کھیتر کا بچا کچھ چارہ کھا رہی تھی۔

ساجی جا کے گھنڑی کی گردن کے لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کے ہاتھ بھیگ گئے گھنڑی جیسے دیا سے نکل کے آئی تھی۔ ساجی نے زین پر ہاتھ رکھا تو اس نے لوہے ہاتھ کھینچ لیا جیسے اس نے زین پہنیں سوار کی ران پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ زین کی کھیلی پھیلی ملائمت نے اس کی رگوں میں لو کھمی سی لہر دوڑا دی اور ساجی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ جوان ہو گئی ہے۔

اس نے مجرے کے کونے سے اس قدر گھاس اٹھائی جس قدر اس کے بازوؤں کے گھیرے میں آسکتی تھی اور گھنڑی کے آگے ڈال دی۔ دوسرے کونے میں رکھے پانی کے بڑے سارے مٹکے سے بالٹی بھر کر گھنڑی کے پاس رکھ دی اور ایک بار پھر ہاتھ گھنڑی کی گیلی کمر پر پھیرنے لگی۔

آدمی کا رازنامہ کواڑ کھلیں کر چیتا اندر آگیا اور دوسرے لمحے کو ایسے خود ہی جم گئے۔ ساجی نے گھوم کے دیکھا، اجنبی کو اندر دوسرے آگے پتھر بنا تھا۔ اس نے ساجی کے دادا کا دیا ہوا بدا پہن رکھا تھا اور شلوار کل بکھرا کل چار بار ہی ہوئی تھی وہ اتنا ہی لمبا نہ تھا جتنا اور اس کے بال شرمگیں ڈال پیشانی پر بچھے ہوئے تھے۔ اس کی شرمگیں آنکھوں میں نیند تھکن اور جوانی کا خمار جا جوئے کی زرد روئیں اور زرد و پیلا رنگ تھا۔

ساجی سے کچھ کہے بغیر وہ گھنڑی کی زین اتارنے لگا۔

"تم نے زندگی دی تو تمہارا احسان چکاؤں گا" — اس نے بند ڈھیلے کرتے ہوئے کہا — "میں بھی پہاڑوں کا رہنے والا ہوں نا کی! پہاڑیوں کے دل پہاڑوں جیسے....."

"اس میں بھلا احسان کی کیا بات ہے؟" — ساجی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چٹخوں لہجے میں کہا اور پوچھا — "کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ رات نہیں ہو گئے نا! جھلو تو شاید رات بھر نہ تھمے!"

"لاغان سے آیا ہوں!" — مسافر نے زین پر رکھ دی اور لگام اتارتے ہوئے بولا — "گرو ہی شیر خان میرے گاؤں کا نام ہے..... اور..... اور..... معلوم نہیں کہاں جا رہا ہوں۔ بارش نہ رکی تھی تو صبح کے سمے سے اتر گیا ہوتا۔ نیچے شاید راولپنڈی شہر بستے ہیں..... گھنڑی نے تو حق ادا کر دیا تھا مسجد میں گزار لیتا۔ میں تو اوپر ہی سے گزر رہا تھا لیکن اوھر اتر آیا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی شاید دروازہ نظر آیا تو اس نے پناہ دے دی!"

"تمہارا اپنا گھر ہے" — ساجی نے کہا — "مسجد میں کیوں رہتے!"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"خاندانِ لوگوں کو خوش رکھے۔" اجنبی نے کہا۔

اُس کے لب و لہجے میں وقار خود اعتمادی اور نہ جانے کیا بات تھی کہ ساجی کو یہ انداز بڑا ہی بھلا لگا اور ایک خواہش سی اس کے دل میں بیدار ہوئی کہ وہ بولتا رہے اور وہ سنتی رہے۔

وہ نیرنی سے بندھے تھیلے سے لوری کا کوئلہ نکال کر گھوڑی کا جسم پونچھ رہا تھا۔ ساجی کی نظریں اس کے کرتے پر گئیں جو دادا نے اسے پہنایا تھا۔

دادا نے یہ کرتا بڑے پیار سے لکھ شہاب۔۔۔ ساجی نے دکھے ٹوٹتے لہجے میں کہا۔ "کبھی کبھی صندوق سے نکال کر اس کی تہیں کھولتا ہے اور کتنی کتنی دیر روتا رہتا ہے۔"

"کیوں؟"

"میرے بڑے بھائی کا ہے نا!" ساجی نے اجنبی کو تشنہ اور متجسس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ جوانی میں مر گیا تھا۔ میں چھوٹی سی تھی تب اس کی شکل و صورت اور قدوقامت ہماری طرح تھا۔ اس کے بال بھی تمہاری طرح تھے۔"

"میری ایک بہن تھی۔۔۔ ایک بہن تھی میری۔۔۔" اجنبی نے آہولی اور ٹوٹی سی مسکراہٹ سے بولا۔ "آج ہوتی تو تمہیں جیسی ہوتی۔"

"مر گئی تھی؟"

"نہیں۔۔۔ اس کے چہرے کا تاثر یکبارگی بدل گیا اور وہ اکھڑی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "کون جانے! شاید مر ہی گئی ہو لیکن دل کہتا ہے وہ زندہ ہے۔"

ساجی نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا دونوں کی نظریں ٹکرائیں، رات کے گزرتے لمحے رک گئے موسیقیوں کے جذبوں کے سمندر کے لہر چیر سکتی ہوگئی۔ گھنٹیاں بجا رہی گرج اٹھیں، جھیل پر ارتعاش کا شور زیادہ ہو گیا اور آدمی کی چیخیں کرخت ہو گئیں۔ آنکھیں آنکھوں میں جذب ہونے لگیں۔

نگاہیں نگاہوں میں کچھ دھونڈنے لگیں۔

کاٹھ کے نیم دار پیچھے سے ٹنک چھو ہنکا گیا۔ مٹی کا دیا ٹھٹھر کر بجھ گیا اور موسیقیوں کے کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔

بیج ہوتی۔ شب ہجر کے قصے مذہب بادلوں کے سپید سپید ٹکڑے وادیوں میں اترتے اور گھنے پیڑوں میں ستارے تھے۔ کچھ ہریالی پیڑوں رنگ رہے تھے جیسے رات بھر بن بن کر تحفہ کر چکے ہوں۔ سورج کی کچھ کچھ تازگی سمان کی پوجا میں کو اور تیز کر رہی تھی۔

ساجی کے گالوں میں مرد زد طوفان کے بعد کی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ دھوڈ نگر باہر نکل آتے تھے۔ لوگ طوفان نمودہ چھتوں میں سلیٹیں ٹھیک کر رہے تھے۔ خردہ چادریں، مٹی، سرکنڈے اور سنتھے کی شکست شاخیں جمع رہے تھے۔ درخت جو اکھڑ کے لیسل گئے تھے پھلوں میں جلنے کے لیے کھٹ رہے تھے۔ پتنگے گرے درختوں کے ٹالوں پر جھولے جھول رہے تھے۔

اجنبی دادا کا سکان جوں کا توں کھڑا تھا۔ وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کھاڈ ہمارت بھر بیٹھے رہے تھے ثابت و سالم تھے۔

تیں اپنی جگہ قائم تھیں۔ اس کی بھینس کھا گئے، دو بکریاں اور ان کے سمان کی کالی گھوڑی باہر کی کھرلی میں چارہ کھا رہی تھیں۔ ان کے بال ذرا تبدیلی آئی تھی کہ رات ان کے ہاں ایک مہمان آیا تھا جس نے اپنا نام جمیل بتایا تھا اور ابھی کل ہی تو تھا اور ان کے ہاں رہتیں یہاں کبھی کوئی مہمان نہیں آیا تھا جمیل رات آیا تھا دادا نصف شب سے جھنک اس کی باتیں سنتا تھا اور اسے اپنی ماں اپنے بیٹے اور بیٹے کی باتیں سناتا رہا تھا۔

اب اس نے جمیل کو پاس بٹھا رکھا تھا۔ ساجی نے تھوڑی دیر پہلے چھوڑی بھینس کے تھنوں میں تھی ہوئی روئی قرم دودھ کے ساتھ جمیل کو کھلائی تھی اور جمیل بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ اس منزل کو زمانہ ہو جانے تک بالا سے کچھ علم نہیں یا اخود دادا کی ماں نے نہیں رکھ جانے۔ وہ کہیں رکھنے کے لیے تو گھر سے نہیں نکلا تھا کیں رات ساجی اور اس کے نوزمے دادا نے اُسے ملوص اور بے لوث پیار سے اپنے پاس رکھا تھا اسے پاگل کر رہا تھا۔

دادا نے رات اس سے پوچھا تھا "بیٹا! آخر جا کہاں رہے ہو؟"

اس نے ایک طویل داستان کو مختصر سے چند جملوں میں سمیٹ کر کہا تھا۔ "باپ بچپن میں مر گیا تھا اور ماں نے گھر گھر کی محنت گزاری اور محنت مزدوری کر کے مجھے پالا۔ لیکن دو بھی پال ہی سکی دو بیاہ جائیں پڑھا نہ سکی دو رکھیں اچھی نوکری مل جائے ماں نے اپنی جوانی مجھ پر قربان کر دی ہے دادا! اب میں اس کی خاطر جنت لے کر جانے کیسی ایسے شہر کو جا رہا ہوں جہاں میں اپنی بڑھاپے کو سکوں کا اچھے دامن فراخت کر سکوں۔ مزدوری تو کا فان میں بھی مل جاتی ہے لیکن خون پسینے کے ہر قطرے کی قیمت ہوتی ہے بعض قطرے صرف ایک وقت کی روٹی کے عوض بہا دیتے ہیں اور میں تو پیسے لیے جاتے ہیں:

جمیل نے کھڑکی پر بندھی گھوڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ گھوڑی نہ دادا تھی جب آخر تک بھی بڑی ہوئی تو اسے کرائے داری کے لیے استعمال کرنے لگا جاتا ہے اس باہر کے لوگ سیر سپاٹے کے لیے آتے ہیں۔ اچھے پیسے دے جاتے ہیں کیں اتنی اچھی نسل کی گھوڑی برباد ہو رہی تھی۔ میں نے یہ کو رہا چھوڑ دیا۔"

دادا جانے بوڑھا تھا، اسے جمیل کے تاثرات اور انداز سے شک ہوتا تھا کہ وہ صرف نوکری کی تلاش میں نہیں جمیل میں بات مزید تھی جس نے دادا کا دل موہ لیا تھا اور دادا اسے پردیس میں خوشیوں کھانے سے باز رکھنا چاہتا تھا دادا کا خان کے اپنا زرد ہیدلوں کی گلشن اور مصنوعی ماحول میں گم ہو جانے اور اس کی ماں اس کی تلاش میں بھٹک بھٹک کر مر جانے۔

اجو دادا نے جمیل کو رات کہا تھا۔ "مجھے بنیا اور نہ پڑھ ہو شہروں کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ وہاں سونے کی دکانیں نہیں بہت طاقتور کیڑی ہی جاتے گی۔ یکسی دفتر میں چپڑاسی بن جاؤ گے۔ رات بھر جاگو گے یا دن بھر بند سے بندھے رہتے۔ بھاگتے، دوڑتے جھوٹ بولتے اور اپنے لوگوں کی خدمت گزاری کرتے گزرنا ہو گے جو شکل و صورت اور کالا ہے ستارے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ تم غریب جی سی، پردیسی سی ہو۔ ان پڑھی سی لیکن اچھے دل کے بنا دادا سوچ کر اپنے دل میں نہ جیو جمیل بیٹا! واپس چلے جاؤ۔ اپنی ماں کے پاس پلٹ جاؤ۔ ان لوگوں کو تھوڑی کی سیر گراؤ جو شکل سیر سپاٹے کے لیے آتے ہیں۔"

میں انہی لوگوں سے بھاگا ہوں دادا۔" جمیل نے جواب دیا تھا۔ "تم کہتے ہو کہ میں ان لوگوں کی خدمت گزاری میں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مگر گورا رنگ، شکل و صورت اور جسم کے لحاظ سے میرے پاؤں کی خاک بھی نہیں، اگر یہ تجربہ سے تو میں اپنے پیدا کرنے والے پروردگار سے معافی مانگتا ہوں۔ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے دادا! میں نے کالا خان میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سوچا تھا کہ جو جسم اور چہرے کے لحاظ سے میرے پاؤں کی خاک بھی نہیں لیکن پروردگار نے انہیں اتنا پیسہ دیا ہے کہ وہ اس کو خرید لیتے ہیں....

"ایک روز ایسے ہی ایک امیر زادی نے جو ایک جوان لڑکی کو ساتھ لیے میرے آیا تھا۔ میری گاڑی میں بیٹھ کر اس لڑکی کو سوار کیا کے پیچھے سوار ہوئیں۔ دونوں نشے میں تھے۔ انہوں نے گھومنی پر بڑی گندی حرکتیں شروع کر دیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا میں نے آگے سے ہو کر گھومنی روک دی اور انہیں کہا کہ گھومنی سے اتر جاؤ۔ اس آدمی نے مجھے گالیاں دیں۔ میں نے گالیوں کا گالیوں سے دیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے مجھے زدوکوب کیا پھر پولیس کا پہرا لگا دیا۔ اس نے مجھے کہا کہ تھانے چلو۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں اس نے مجھ سے دو روپے لے کر مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے اسی روز یہ کام چھوڑ دیا۔"

رات بادو باراں کے ہنگامے میں جمیل کو روتی اور قہقہے لگاتی ہوئی اس پہاڑ جیسا کھنڈر کھنڈر اور بزرگ آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی رعشہ گیر آواز دل کش تاثر میں کوئل کے گرد بنتی جا رہی تھی۔ ایک بار تو جذبات نے اندر اور بھی لیا تھا نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ اس کا باپ زندہ ہوتا تو سے اسی طرح پیار سے سمجھاتا۔ اسے سمجھاتا کہ گھر سے چلنے نے بھی اسے زندہ جانی آواز میں کہا تھا۔ "بیٹا! پولیس نہ جاؤ۔" رات دادا نے باتیں کیں تو جمیل کا ان باتوں میں باپ کو اور ماں کے پیار کی بو آنے لگی تھی۔ دادا نے کہا تھا۔ "بیٹا! پولیس نہ جاؤ۔"

"پھر پیسے کہاں جاؤ بیٹا؟" ــــ دادا نے کہا تھا ــــ "ماں کو بھی بلا لو۔ وہ آ جائے گی؟"

"وہ کابل جائے گا؟" ــــ جمیل نے پوچھا تھا۔

"وہ کابل جائے گا" ــــ دادا نے سنگدلانہ سے لہجے میں کہا تھا ــــ "رہنے کو گھر مل جائے گا، جو چاہو کھا پیا؟"

"کہاں سے؟"

"میری اجڑی ہوئی کھیتیوں سے" ــــ دادا نے کہا تھا ــــ "میری کھیتیاں سونا اگلتی تھیں لیکن جرمانے نے دادا کی کھیتیاں ویران ہو گئیں۔ زیادہ نہیں چار کنال کے ٹکڑے میں لیکن زمین اتنی کمزور کہ کچھ پھیکو تو پھول اگتے ہیں جیسے بھی بنا لی پیدا کی اگ جائے گی۔ اپنے دھوکہ دیکر ہے چارے کو ترستے رہتے ہیں۔ ساری دنیا کے سوا اپنا کوئی نہیں.... تم کب بنا دوں گا اسی گھر میں رہنے دو جلد دوں گا، آدمی فصل تمہاری۔"

"ایک مہینہ ہے۔ ایک گائے ہے" ــــ سامی نے لیٹے لیٹے کہیں سے منہ نکال کر بچوں کی سی شوخی سے تھا ــــ "دودھ بکریاں ہیں۔ ایک تم لے لینا؟"

جمیل جو اتنی دیر سنیدہ بیٹھا تھا۔ ہنس پڑا اور اس نے لیٹے لیٹے سانحہ کہا تھا ــــ "تم جیسی کسی بھی لڑکی کو دیکھتا ہوں تو

ہمارا تو بھائی بھی جیسی لیا خدا نے!" ــــ سامی نے اداس سی شوخی سے کہا تھا ــــ "ہمارا لاکھ منتوں سے بھرا پڑا ہے ابھی وہ ہمیں نہیں کہتا ہو دیکھتا ہے گلو کے سی دیکھتا ہے:

جیسے دادا بھر ہے: "یہ کب جانے پر اکسلا تھا جمیل کو سامی کی بات یاد آئی تو اسے دھچکا سا لگا اور اسے معاً خیال آیا کہ سامی کس قدر حسین اور نوجوان لڑکی تھے اور اس کے دل کے نرم سے داداؤ رعشہ گیر صوا اس کی رکھوالی کرنے کی بجائے اس پر بار بنتا جا رہا ہے جمیل کے احساسات میں پچھلی پچھلی محسوس کی جو پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اسے سامی کی نسبت اور حقیقت کا بھی خیال آیا۔ اس نے بڑے پیار سے کہا تھا ــــ "ایک بڑی ترسے لیے ــــ جیسے وہ فی تنہا پکی بیچے کے سکے ــــ آؤ میری گیند تم لے اور بھر اسے کھیلو۔"

جمیل نے اپنی گھومنی کو بکھا کر کھڑی تھی۔ پھر سامی اور کی جو مویشیوں کے باڑے تھے خشک مٹی اور کھر بجری تھی۔ جمیل کی نگاہیں سامی کی بجر بجر جوانی کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے دل کی شمع کے نشیب و فراز پر بیٹھنے لگیں۔ اس کے ذہن سے بجلا سا اٹھا۔ اس نے سوچا کیسی ایسا ہو کہ اس پر چلا رہا تو قل جو دادا ملی ایسے ویسے دادا کو محرم رکھ لے۔ یہ لڑکی شوق تو سے گھر مطلوبہ ہو۔ ابھی سے جمیل نے ایک رات میں ہی کیا تھا کہ سامی جو خود ہی آ سے ہے، حرکت کر دیتی ہے لیکن مردوں کی چوب بانی کے ہم ہنگ نہیں تو ہم سے آشنا نہیں۔

جمیل کو یہ خیال بھی آیا کہ اس کا بوڑھا سیریان اسے اسی لیے تو نہیں روک رہا کہ اس کی پوتی جوان ہے جس کی عزت کی رکھوالی کے لیے نوٹی بھی نہیں؟ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس نے سامی سے کہا تھا ــــ "تم پر رہا تو یہ احسان چکاؤں گا۔"

"چند ماہ رک کے بکتا ہوں" ــــ جمیل نے آہستہ سے کہا ــــ "بھی جو مگر کیا تو ساری خدمت کر دادا کا فرنے مجھے اصل رات طوفانوں سے بنا دوں گی۔ دادا میں تم کی نام رانی تم پر قربان کر دوں گا۔"

سامی کمرا پہ نکلی ہوئی تھی سرعت سے کھلی اور پر مسرت لہجے میں بولی ــــ "سچ کہتے ہو؟ تم نہیں رہو گے؟ اور خوش ہو تو سامی یہ کہنے ہے...."

"دادا کی سامی!" ــــ دادا نے جھنجھلا کر کہا ــــ "مسافر نہ کہو۔ جمیل کہو۔ اب تو تم گھر میں ہے سفر میں تو نہیں۔ بھائی کہو۔"

سامی کی مسکراہٹ اور پھیل گئی۔ جمیل بھی مسکرا رہا تھا۔ سامی کہنے لگی "ہاں تو اگر یہ بھائی ہی تو ہے" ــــ لیکن دونوں کی مسکراہٹوں کا تصادم ہو جیسا تو سامی کے دل میں گدگدی سی ہوئی اور اس نے ہونٹ بھینچ کر زبان پر آئی بات دل کے پیالے کر دی۔

دن کے پچھلے پہر، جو دادا جمیل کو اپنی کھیتیاں دکھانے چلا تو سامی بھینس دوہ رہی تھی۔ بولی ــــ "دادا! تمہارے پر اور ہونٹ تک ہیں تو دودھ دینے جا چکی ہوں گی چاچی دیا پر اپنی جگہ رکھ جاؤں گی؟"

جمیل کا پہلی ہی مطلوبہ نہ کہا کہ سامی پر روز پچھلے پہر میری کی دو چار کھیلیں ہیں۔ "دودھ بیچے جاتی ہے۔ دادا کی لڑکی کا شہر میں جانا اچھا نہیں" ــــ جمیل نے کہا ــــ "دودھ میں ہی دے آئے گا۔"

"ایسی بھولی ہو سنتے" ــــ دادا نے دادا دینے کے لہجے میں کہا ــــ "پھر بھی میں بیٹا ہے۔ مگر کہ دیکھنا، اسے لی ہے۔ تم تو لڑکے ہی آ ہے۔ سیدھی گھر سے ہے سادی دنیا میری میں جمع ہو گئی ہے لیکن وہ نہیں ہوتی۔"

www.paksociety.com
Scan & Pdf Zeem Paksitanipoint

ٹیلوں کی سیدھیاں چڑھ کر اُوپر چلے گئے اور اُس راہ پر ہو لیے جو پہاڑی کو کاٹتا دوسری طرف چلا گیا تھا۔ تھوڑی دُور جا کر وہ ایک وادی میں چلے گئے جہاں شاہدی اور گنڈے کی جھاڑیوں نے گھر کیا تھا۔ ہر کار راہ روک کھڑی تھی اور ہر درخت لگا سایہ تھا۔ وہ پانی سے لدی جھاڑیوں میں رہنا سے کاٹتے ملاتے چلے گئے جہاں خُوبانی اور شیشلی اخروٹوں کے گھنے پیڑ بکھرے ہُوئے تھے۔ وادی کے دامن سے اُوپر اونچے ٹیلے سے پڑ بیٹھے دریا کی طرح نشان شاں کر رہے تھے۔ ان پہاڑوں یا ٹیلوں کے بخیرے بکھرے ہُوئے اُڑ رہے تھے۔ نیچے جو کھلا میدان سا تھا، اس میں جگہ جگہ گندلوں نے بارش سے بچنے کے لیے جھاڑیوں کو تراش تراش کر گنبد سی بنا رکھی تھیں جن میں بعض اس خدر ان تھیں، اور بعض پانچ آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

دو آگے گئے تو کھیتیاں نظر آنے لگیں جو پہاڑی کے دامن سے جوڑی ٹکے سیڑھیوں کی طرح بنی ہُوئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں علاقوں کی کھیتیوں کی طرح کناروں اور کیاروں کے حساب سے سیع و عریض نہیں تھیں۔ یہ ان لوگوں نے خود ہی پہاڑیوں کی ڈھلانوں کو کھود کھود کر کیارے سے بنا رکھے تھے۔ ان میں بعض کچھ زیادہ لمبے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی بیس گز ہو گی۔ ان میں یہ لوگ مکئی اور دھان اُگا کر رہتے تھے۔ یہ کھیتیاں کلاوٹی تھیں۔ ان ہی میں اخروٹ کی کھیتیاں تھیں جو پانی میں ڈوبی ہُوئی تھیں۔ وہ سوکھی کھیتیوں میں سے کسان پانی کے نکاس کی راہیں کھود رہے تھے۔

اخروٹ میں کب کل، وہیل سے کچھ کہنا چاہا کہ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اس کی بے لوث آنکھیں بند ہو گئیں۔

"میری جوانی کی یادگاروں میں — اخروٹ کے وہ کنڈ لمبے میں کہا — میں نے دھرتی کے ان ٹکڑوں کو خون کا خون پلایا ہے مگر آج خون خشک ہو گیا ہے۔ ہاتھوں میں اتنی ہی سکت نہیں جو اپنے آنسو قریب تک پونچھ سکوں!

"دادا!" — جمیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "یہ کھیتیاں پھر سے ہری ہوں گی۔ میں اپنے کھیتی باڑی کچھ نہیں کی، مجھے بتائیے رہنما کیا کچھ کرنا ہے۔"

ساجی دودھ کی گاڑھی سر پر رکھے اور چھ سات انڈے ہاتھ سے باندھے اور بھیگی گلی، روڈ پر بیٹھ چکی تھی جن کو مٹھیوں میں وہ دودھ دیا کرتی تھی وہ ابھی آگے تھیں، وہ دو نمبر کی چال چلی جا رہی تھی کہ اسے آواز سنائی دی — "ہری کرنا ذرا الو کی!"

وہ رُکی۔ گھوم کے دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔

"ہری اس طرف!"

اُس نے بائیں طرف دیکھا، ایک اوھیڑ عمر آدمی، گھر سے رنگ کی پتلون اور اُبلی ہوئی آنکھیں، یہ ہیرا سنگھ کلاوٹر تھا۔ وہ کلاوٹر تھا۔ اس کا پورا نام حبیب الرحمان کلاوٹر تھا لیکن اہلِ علاقہ اسے کلاوٹر اور سوشل حلقوں میں کلاوٹر کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ وہ امیر ترین وزیروں میں اُٹھنے بیٹھنے والا آدمی تھا۔ مری میں اس کی اپنی کوٹھی تھی۔ ایک کوٹھی راولپنڈی میں اور ایک لاہور میں تھی۔ اس نے اسلام آباد میں بھی دو پلاٹ خرید لیے تھے۔ سرکاری، غیر سرکاری اور فوجی سفارت خانوں کی تعمیرات اور پلاٹوں میں اسے خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ چندے دینے والوں میں اس کا نام سرِ فہرست ہوا کرتا تھا۔

مری و پنڈی والوں کو معلوم تھا کلاوٹر بارہ خانہ والے سے اور اس کے بارہ خانہ سے لاہور میں بھی۔ لاہور والوں کو معلوم تھا

اور اس کی چھوٹی کوٹھیاں اور دس بارہ دکانیں پنڈی اور مری میں کرائے پر بھی ہوئی ہیں اور سیمنٹ کا ایک کارخانہ کراچی کے مضافات میں ہے۔ تینوں شہروں میں بیچی شنو کا وہ جاگیردار ہے۔ بیکڑوں ایکڑ زمین بنجر ہی اور سرگودھا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی بنجر ہی ہیں لیکن اس کے کارخانے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ لاہور والوں نے اس کی پنڈی اور مری والی چھ سات کوٹھیاں کبھی نہیں دیکھی تھیں اور تینوں شہروں والوں نے اس کی جاگیر کبھی نہیں دیکھی پھر بھی سب کو یقین تھا کلاوٹر کارخانہ ضرور بھی ہے۔ جاگیردار بھی کیونکہ وہ شہزادوں کی طرح رہتا تھا اور سرکاری حلقوں میں اس کا سکہ چلتا تھا۔ وہ گرمیاں مری میں گزارا کرتا تھا۔

اگست کا مہینہ تھا اور گرمیاں گزار کر اسے مری آیا ہوا تھا۔ اس نے ساجی کو دودھ کی گاگر اُٹھاتے جاتے دیکھا تو وہ اسے چند ثانیے دیکھتا ہی رہا۔ اس کے ہاتھ میں بلا کا جیسے مری کی مخمل پوش وادی کا تمام ترشن اس پہاڑی کے دھوئیں سمٹ آیا ہو۔ اور تو برسوں سے گرمیاں مری گزارتا تھا۔ اس نے سیکڑوں بہاری لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن جو دل کشی ساجی میں تھی وہ کسی میں نہیں دیکھی تھی۔

اس کی آواز پر ساجی اس کی طرف چلی۔ وہ اپنی کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا۔ گھنے درختوں اور پھولدار بیلوں میں اس کی کوٹھی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن بیلیا کے ہر سے پتوں اور سرخ پھولوں کی چھت نے جیسا دو منزلہ محل بھی بنی ہُوئی تھیں۔ دائیں اور بائیں دو سیڑھیاں تھیں۔

"کیں دودھ دینے جایا کرتی ہو؟" — اس کے ساجی سے خفا خفا لہجے میں پوچھا۔

"ہاں صاحب جی!" — ساجی بولی — "وہاں اُوپر کے دو بنگلوں میں"

"مجھے دودھ تو تمہیں کی ضرورت ہوتا ہے" — کلاوٹر نے بیل پہ جست سے کہا جیسے وہ گھونٹ دودھ کی بھیک مانگ رہا ہو۔

"لے لیا کرو، صاحب جی، کتنا چاہیے؟"

"جتنا دے دیا کرو" — اس نے زیرِ لب مسکراہٹ سے ساجی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "آؤ" — اور وہ کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

ساجی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ کوٹھی کے سامنے کلاوٹر کی سرخ رنگ کی سپورٹس کار کھڑی تھی۔ کلاوٹر کار سے آگے جا رہا تھا لیکن ساجی کو دو سیڑھیوں والی چھوٹی سی برآمدی اچھی لگی۔ وہ رکھ کر کار کو مخملیں کر، بیٹھنے لگی۔ کلاوٹر کے لمس سے ساجی کو بڑی تشنہ لذت محسوس ہُوئی جو اس نے رات جمیل کی گھوڑی کی گردن پر ہاتھ پھیرنے سے محسوس کی تھی۔

کار کی چھت اُتری ہُوئی تھی۔ ساجی سنیہ تک پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ایک جگہ اس کا ہاتھ ذرا زور سے پڑ گیا۔ "ہاں آں" کی سریلی آواز اُبھری۔ ساجی نے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے سر پر لگی چھت گر گئی۔ وہ ذرا کر پیچھے ہٹی مگر اس کا دل ایک بار پھر اسی جگہ ہاتھ رکھنے کے لیے بے قرار ہونے لگا جہاں سے "ہاں آں" کی آواز آئی تھی۔

اس بار کلاوٹر کا ظلم طاری ہو ہی رہا تھا کہ کلاوٹر کی ہنسی نے اسے چونکا دیا۔

"کاہیں بھاگے کے سر پر لاؤں ہو" — اس نے ساجی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "آؤ بیٹھو!"

"جتنا ہی جیسے صاحب جی!"

www.paksociety.com

Scanned & Moder Azeem Iqbal Khan

"اپنی جی جیجو" — کاردار نے جو ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تھا واپس کر ساجی کی گردن بلک چلا گیا۔ گردن پر مولتے انگلیوں کے لمس نے ساجی کو کار کے طلسم سے نکال لیا۔

"نہ صاحب جی!" — ساجی نے شگفتہ سے لہجے میں کہا — "تم دودھ لے لو، دیر ہو رہی ہے۔ آگے دودھ ملے گر گھر بھی جانا ہے۔"

"کہاں ہے تمہارا ہاتھ؟" — کاردار نے اسے ایک کمرے میں لے جاتے ہوئے پوچھا — "یہیں کہیں ہوگا؟"

"ہاں، دودھ تو نہیں ہے" — ساجی گاڑھی لیس پر رکھتے ہوئے بولی — "وہ سامنے نظر آتا ہے نیچے۔ اترتے چڑھتے ذرا وقت لگ جاتا ہے۔"

"تمہارا کوئی بھائی نہیں ہاتھ بٹوانے کو؟"

"کوئی نہیں صاحب جی!" — ساجی نے بے تاثر لہجے میں کہا — "بس ایک دادا جی دادا اسے۔ ماں بھی تھی، باپ بھی تھی، بہن بھی، بھائی بھی تھی، خاوند بھی جو ہاتھ سے تو دادا مر گیا۔ ساجی اسے یاد کرنے لگتا ہے۔"

"تمہارا نام ساجی ہے؟" — کاردار نے شیشے کا جگ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"ہاں صاحب جی!"

ساجی بھگتیں میں دودھ ڈال رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ سر سے سرک کر اس کے بھورے بھورے ریشمی بالوں کو بے نقاب کر رہا تھا۔ کچھ بال بکھر کر گالوں پر جھول رہے تھے۔ کاردار دشمن کی مظلومیت اور دل کشی سے مسحور سا ہو رہا تھا۔ بے لاس طرح تھوڑی سی دیر پہلے ساجی اس کی کار کے طلسم میں الجھی تھی۔ کاردار نے شدت سے محسوس کیا جیسے اسے اپنی دولت سے ذرہ بھر احساس کمتری نہیں رہی اور وہ تمام عمر اسی بیابان و دشت کی حسین پری کی سرپرستی دائیں میں بھٹکتا رہے۔

"ایک سیر ڈال دیا ہے صاحب جی!" — ساجی نے کہا — "اور تو نہیں ہو گا!"

"تمہی ساجی!" — کاردار نے جیسے عشق کے جنون میں آدمی ہو، بولا — "گل بھی آ گئی نا!" — اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر ساجی کو دیا — "یہ لو گل آ گئی تو اور لے جاؤ!"

ساجی ہنس دی۔ بولی — "دودھ ہمارا آنے سیر ہے صاحب جی! پانچ روپے آٹھ کیرل اور کیوں لے جاؤں؟" — وہ قسیق کی ہنڈیا والی جھلسے پڑی ہوئی کھال کو رگڑنے لگی۔

"میں باقی پیسے واپس نہیں لوں گا" — کاردار نے آواز میں محبت کا رس بھر کے کہا — "یہ دودھ کی قیمت تو نہیں ہے" — اس نے مسکراتی ہوئی سی ہنسی دی اور کہا — "کس قدر پیاری لڑکی ہو تم!" اس کی کچھ بھرے عشق نے ہونٹوں کی نظروں سے گھل کر کہا۔

لیکن ساجی جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ دیا روپے چار آنے تو سے کرنے میں مصروف تھی۔

"میں کہہ رہا ہوں میں باقی پیسے واپس نہیں لوں گا" — کاردار نے جھک کر اس کے تاثر کو کھلا اور اس کی ہنسی بند

Scanned By Waqar Azeem Pansitanipoint

اس کی جوانی کا آغاز تھا جب ایک دن جاجی زور سے چلتے چلتے اس کا ہاتھ دبا دیا تھا۔ ساجی نے وہ بے لگی سنائی تھیں کہ جاجی کا گلشن ہوا جسم نرسے لگا تھا۔ اگر تین چار عورتیں ساجی کو گرفتار کرتیں تو پتھر ان کے انتظار تھا۔ وہ جاجی کے سر پر جا کر اسے لفظ مالی کو دیتی۔ وہ بزدلی شیر نی کی طرح جنگلا ہوتی تھی اور سارا گاؤں صبح ہو گیا تھا۔ اس نے سارے گاؤں کو ناراد ہا تھا ختم سمجھتے ہوئے میری عزت کی رکھوالی کے لیے میرا کوئی جاجی نہیں۔ رباب سے اور بڑھا دادا تمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو آؤ جسے مرادانی نماز ہے۔

راجہ اشرف خان اور پیش امام نے بڑھ کے اس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور جاجی جس سے گاؤں کے گھبرا گھبرا کے تھے کاؤں سے بھاگیا اور کوئی دن بعد لوٹا تھا۔ اس روز کے بعد ساجی کا سینہ اور زیادہ چوڑا ہو گیا تھا اور گردن پہلے سے زیادہ اونچی ہو گئی تھی۔ اس کی چال ڈھال میں نڈری خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی جس نے اس کے حسن میں اضافہ کر دیا تھا۔ مراد اسے اور دور سے چھیڑنے سے باز تو جب بھی رہتے نہ تھے لیکن اس کی نظروں کا سامنا بھی نہ کر سکتے تھے۔

صبح جب دوگیلی گھاس پر نیم دراز ساجی کو جمیل نے پھول سے نظریں ہٹا کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کی عمر شرقی اتھوں اور گلابی گالوں نازکی کا مقابلہ پھول کی نزاکت سے کر رہا ہو۔ ساجی کی نظریں جھک گئیں اور گاؤں کے وہ سارے لونڈے اور جوان سال مرد اس کی نظروں کے سامنے جھوم کر آگے جو اسے اور دور سے پھر اکر تے تھے۔ اس جھوم میں اسے جمیل کی صورت بھی نظر آنے لگی۔ اسے کوفت ہوئی جو جمیل اس حالت سے انبوہ سے متعلق نہیں۔ اس کی نظریں ان کی طرح اسے گھورتی تھیں۔

ساجی کے پاس کوئی وجہ اور کوئی دلیل نہیں تھی جو اسے قابل گردن زدنی جمیل نیک پاک انسان ہے لیکن اس کا دل ایک ایک کر جمیل کو گاؤں کے سنڈوں کے جھرمٹ سے گھسیٹ کا تھا جن سے اُسے نفرت ہو گئی تھی۔ ساجی کو دادا ایک دل رات بھی دادا نے پاس بیٹھے جمیل نے وہ رکھا تھا ایسی ہی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے ذہن میں تھے سانچیاں آیا کہ دادا نے اس آدمی کو گھر کر کر شاید پھلی کی بے لیکن دل کو تسلی دینے کی خاطر اس نے اپنے آپ سے کہا کہ دادا زیادہ تر جاسد ہے، وہ اچھے ترے کی پہچان کر لیتا ہے۔

جمیل تو اسے اچھا لگا تھا لیکن اسے یہ عادت اچھی نہ لگی۔ اس نے سینے میں تیمی سی محسوس کی اور دادا کو منع کیا۔ دیکھا جمیل کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے سر ہلا دوبارہ کے تنے سے لگا لیا تھا اور اس کی پلکوں نے وہ آنسو تھام لیے تھے۔ ساجی کو اچھا لگا۔ اتنی اور جمیل کے قریب جا بیٹھی۔ جمیل نے آنکھیں کھولیں اور ساجی کے حیرت زدہ چہرے کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

"تم کا ہے یہ ہو؟" ساجی نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

"اوں ہوں" جمیل نے مسکرانے کی ایک ادا کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دل اداس ہو گیا تھا" اور اس نے ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"مال یاد آتی ہو گی؟" ساجی نے پوچھا۔

"ہوں" جمیل نے کہا۔

"تم نے کھانا تھا وہ شاید مرگیا ہے؟"

کون جانے؟" جمیل نے آہ لے کر کہا اور ساجی کو سر سے پاؤں تک دیکھ ڈالا۔ وہ سراپا سوال بنی بیٹھی تھی جمیل کی نظلیں

میں پیاسی سی خسبو تھی اور سبھی کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"جس رات میں تمارے اس سنیا تھا!" جمیل نے نیلے پھول کی ایک پتی توڑ کر مسلتے ہوئے کہا۔ "اس سے چار ماہ پہلے کی بات ہے کوئی باہر سے ہمارے گھر آیا۔ دیکھا میری ماں چولہے کے پاس بیٹھی سکیاں لے لے کر رو رہی تھی میں نے ماں کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس روز اسے روتے دیکھا تو میں نے گھبرا کر اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے سننے کی کوشش کی میں پوچھ تو نہیں رہا تھا کہ منہ سے نکل جاتا۔ میں پیچھے پڑ گیا تو بھی اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ میں غصے میں چیخ کر بولا۔ "کیوں رو رہی ہو ماں بھی؟ کیا میں بے بھر بغیر جیسے دوں گا؟" میرا ذلیل تھا کہ ماں، اس لیے رو رہی ہے کہ میں نوکری کی تلاش میں گھر سے جانے کی ضد کرتا۔ بتانا تھا لیکن ماں نے ایک کہانی سنا دی جو اس نے سولہ سترہ برس سے سینے میں چھپا رکھی تھی۔"

جمیل نے مجوس آلود اپنی گھڑی کو دیکھنے لگا جو چرتے چرتے اس کے قریب آگئی تھی۔ اس نے تشنہ سی نگاہ سے ساجی کو دیکھا اور کہا کہ اس نے سنایا۔ "برسوں گزرے جب میری عمر سات آٹھ برس تھی میری ایک بہن تھی جس کی عمر چار برس تھی۔ ماں کہتی ہے کہ وہ بہت ہی پیاری اور بھولی بھالی بچی تھی۔ اُس وقت ہمارا کوئی ایک ٹھکانہ نہ تھا ہم کشمیر کے بنے والے تھے لیکن برف پڑنے لگتی تھی تو ہم میلوں میں اتر آتے تھے اور گرمیوں میں واپس لوٹ جاتے تھے۔ ماں باپ دونوں محنت مزدوری کرتے تھے اور زندگی مزے سے کٹ رہی تھی۔"

"ماں نے سنایا کہ سردیوں کا آغاز تھا اور ہم کشمیر سے پاپیادہ کاغان کی طرف آ رہے تھے۔ شام کو سخت آندھی چلنے لگی۔ ایک گاؤں دور پیچھے رہ گیا تھا اور اگلے گاؤں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ماں باپ نے سمجھے اور میری بہن کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ سردی سے دانت بج رہے تھے اور رگوں میں خون جم رہا تھا۔"

"تمیں دو رات ہو گئی؟"

"بالکل نہیں۔۔۔ ماں نے سنایا کہ چٹانی راہوں میں ایک ٹھوہ نظر آ گئی۔ رات وہیں بسر کر لے کو باپ نے دراسے کھنچ کو کھوہ میں بٹھا دیا۔ آندھی تند اور تیز تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی اور رات گہری ہو گئی تھی۔ ہماری نیل تھا بدن پر تن، دو بیل، دو کھیس اور دو لحاف تھے۔ مجھے اور میری بہن کو کھوہ میں بٹھا کر ماں نے جسم کو لحاف میں لپیٹ دیا اور خود آگ جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کرنے چلے گئے۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔ ماں نے سنایا کہ انہیں زور اور سو گئی تو ہم بہن کو اکیلا چھوڑ کر ان کے پیچھے جا لگا۔ وہ خشک گھاس اور لکڑیاں جمع کر کے نواد نکل گئے تھے۔ میں ماں جی، ماں جی چلاتا ان تک پہنچا تو انہوں نے گھبرا کر کہا۔ "تجھ کو چل بیٹے!۔۔۔ مٹی کیسی ذرتی ہو گی لیکن میں شاید خود ڈر رہا تھا۔ ماں کہتی ہے کہ آندھی کی چیخیں سونا کر تھیں۔۔۔"

"ہاں باپ بہت سی لکڑیاں جمع کر چکے تھے وہ مجھے ساتھ لیے کھوہ تک آئے۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ماں نے مٹی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ باپ نے لکڑیاں پھینک کر ہیں جلانی تو فٹ دیں پڑا تھا۔ مٹی نا تھب تھی۔ ماں نے سوکھی گھاس کو ہل لگا دی۔ آندھی میں شعلے بیکلی کر بھڑکے۔ کھوہ کا ذرہ ذرہ نظر آگیا لیکن مٹی نظر نہ آئی۔ ماں اور باپ نے چیخ چیخ کر مٹی کو پکارا لیکن آندھی کی چیخوں کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ ماں پاگلوں کی طرح بھاگی اور باپ مٹی کو بچانا دوسری طرف دوڑا۔۔۔"

"ماں کہتی ہے کہ آندھی کے بھیانک شور میں اسے یوں آواز سنائی دی جیسے قریب ہی کہیں مٹی بڑی زور سے رو رہی ہو

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لیکن یہ آواز جیسے اچانک اٹھی تھی اچانک ہی خاموش ہو گئی۔ ماں اور اطہر دونوں گھر طبیلے کی طرف نکل گئے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں جانے کہاں سے آنے لگیں۔ گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ جس لمحے بھی چیخی تو ماں نے دیکھا کہ اس سے تھوڑی ہی دور دو گھوڑے بھاگے جا رہے تھے۔ ایک سوار کالا سیاہ اور ایسا تھا جیسے اس نے نئی کالی بھجنگ اوڑھ رکھا ہو۔۔۔

"باپ نے بھی گھوڑے دیکھے تھے اور اسے شاید یقین ہو گیا تھا کہ شی او ہی ہو۔ اچانک اٹھائے گئے ہیں۔ وہ ان کے پیچھے دوڑا۔ اس نے پیچھے میری ماں اور شی پندہ کو قدم روکنے کا حکم دیا۔ ہوا کا جھونکا تھا۔ ایک دہشت کا منظر تو دیا اور شی پندہ میرے باپ کے سر پر گرا۔ جب ماں نیچے کی طرف شی تھے دم توڑ چکا تھا اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی ہیبت سے تحلیل ہو گئے تھے۔"

پھر؟

"پھر خدا ہی جانے یہ دیوتا خاموشہ میرے ہی سے کب کھل گیا۔۔۔ جمیل نے غم سے بوجھل آواز میں کہا۔۔۔" اتنا ہی یاد ہے کہ ہوش سنبھالنے کو دیا میں ماں جن ماں تھی جس نے کاغان کے ایک گاؤں میں ہی کٹیا بنالی تھی اور محنت مشقت کر کے مجھے پالتی رہی۔

"میں حیران ہوں ماں نے یہ بات اتنا عرصہ غم سے چھپا کر کیوں رکھی؟" ساجی نے کہا۔ "اور اب کیوں بتا دی؟"

"وہ شہید اب بھی یہ اذان میں ہی کہتی۔۔۔ جمیل نے کہا۔۔۔ میں نے تمہیں اور دادا کو سنایا تھا، مگر میں نے گھر ہی کی سوئی کو سنبھالنے کا عزم چھوڑ دیا تھا۔ ماں سے کہنے لگا تھا میں کسی شہر میں جا کر نوکری کروں گا اور ماں کو بھی وہاں طاعون کا مال نہیں مال۔۔۔ ہی تھی میں مانے گی، مگر بنا دیا کر نکلنا تھا۔ خدا کے بھید بھاں کا واحد سہارا میں ہی تھا۔ تم جانتی ہو گی۔ ماں کا اپنے دیکھے بیٹے کے ساتھ کتنا پیار ہوتا ہے۔ ماں میرے نہ سنے گھر سے جانے کا سن کر اکثر رو پڑتی تھی۔ اس روز بھی (میری اسی عذر پر) رو رہی تھی۔ کہنے لگی کہ روزگار کی تلاش نے مجھ سے تیرا باپ چھینا اور تیری پھوپھی کی بہن بھی چھین لی تھی۔ تو وہ گیا تھا۔ تا کہ میں جا رہا ہے میں اس کے پیچھے پاگل کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا تھا۔ میں نے تیرے سامنے میں تیرے دل و ان غموں سے آزاد رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اتنی خبر کی کہ اس نے مجھے یہ کہانی سنا دی۔

جمیل نے دکھ درد آلود اور چنے خلاؤں میں گھور کر بولا۔ "جب سے ماں نے یہ قصہ سنایا ہے دل تڑپنے لگا ہے۔ جی رو رہا ہے کہتا ہے میری بہن زندہ ہے لیکن کہاں؟" ۔۔۔ اس نے ساجی کو ترسی ٹوٹی نگاہوں سے دیکھا اور تشنہ سے لہجے میں بولا۔ "ساجی! تجھے کسی لڑکی کو دیکھتا ہوں تو دل کہتا ہے یہ تیری بہن ہے۔ میں کل رات سے تمہیں اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے تم ہو تیری کھوئی ہوئی بہن ہو۔"

ساجی کو دھچکا لگا۔ وہ خوشی بھی ہوئی تو تمہیں دے ان لفظوں میں اس نے جس سے اسے گاؤں کے صنعتوں اور سری کے آوارہ رنڈیوں سے دیکھا کرتے ہیں۔

"ماں نے مجھے ہنستا کھیلتا رکھا اور میری خوشیوں کی خاطر یہ زہر کا گھر اپنے سینے میں دبا لیا۔ کہا۔ دوسری شادی بھی نہ کی اور گھر کی نوکری کرتی رہی۔" ۔۔۔ جمیل نے لہجے میں عزم فاتر پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں کہیں نوکری کر کے اس کی محنت کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور۔۔۔" اس نے رک رک کر کہا۔۔۔ "اور کیا پتہ ساجی! زندگی کے کسی دوراہے پر مجھے کھوئی ہوئی بہن بھی

ماں ۔۔۔ ساجی نے آہ لے کر کہا۔۔۔ "میں بھی کبھی کبھی اپنا دل بہلانے کے لیے کہہ کر کہتی ہوں کیا پتہ میرا جو بھائی مر گیا ہے۔ زندہ ہو کہیں چلا گیا ہو۔ واپس آجائے غم بھی اسی امید پر دل بہلانے کو کھوئی ہوئی بہن تمہیں مل جائے گی۔"

ساجی نے نظریں جھکا لیں وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ سامنے آ بھی گئی تو پہچانو گے کیسے؟ ہاں نے تنکلیں جمیل کو دیکھا۔ وہ خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔ جمیل تو اس کی نظروں میں پہلی رات ہی گیا تھا۔ یہ اب اس کی داستان سنی تو اسے یوں لگا جیسے وہ خود اس کا ساتھی ہے۔ وہ اکٹھے کھیلے ہیں اور بچپن سے ان وادیوں میں دھوم مچتی رہی ہیں۔

اس سے جی میں آئی جمیل سے کہہ دے کہ میں بھی تیری بہن ہوں شاید اسے قرار آجائے۔ وہ کہنے ہی لگی تھی کہ اسے یاد آیا سیلی وہ لگتی ہو اسے اک تھلک لے جا کر علاؤ خان کی باتیں سنایا کرتی تھی۔ اس کی سیلی کو علاؤ خان سے بے پناہ خلوص اور پہنچنے میں عیش میں ہنر میں بیگیری کرتا تھا۔ کبھی کبھار، مگر آتا تھا تو ساجی کی سیلی اسے چھپ چھپ کے لٹتی تھی اور چوری چھپے کی ملاقاتوں کی لذت آگیں اور نشہ آور تفصیلات اکثر ساجی کو سنایا کرتی تھی۔ ساجی بعض اوقات ان باتوں پر ہنس بھی دیا کرتی تھی اور کبھی کبھی سیلی کی گفت میں چوری کی ملاقاتوں کے تصورات کو نہیں میں آہستہ کرنے لگتی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس کی سیلی علاؤ خان اور بھلا کیا نہیں کہتی۔

آج جمیل کے قریب بیٹھ کر ساجی نے اس کا دکھ اسانا تو اس نے جمیل کو بیاختہ کہہ دینا چاہا کہ میں ہی تیری بہن ہوں میں وہ کہہ دیتی اور اور خوری اسے اپنی سیلی اور اس کی زلف گیلی باتیں یاد آنے لگیں۔ ساجی کی سہمی میں اپنی سے جذبے نے ہی اس کی دوسرے سی تھی۔ جمیل نے خدا بن گیا اور ساجی کے دل میں گھوٹی خواہش بیدار ہوئی کہ وہ جمیل کو وہیں سے لے جائے جہاں اس کی سیلی علاؤ خان کے بہلو سے لگ کے بنیاد کرتی تھی۔

جمیل بھول کی ایک چیز کی انگلیوں میں مسل رہا تھا۔۔۔ ساجی اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے اس کے چہرے پر سے نظر ہٹا رہی تھی۔ اس کو کیا تھا۔ غلط سی ایک اثر تھا جو اسے دنیا سے ہوش و حواس سے بیگانہ کر رہا تھا۔

کسی کے قدموں کی دھیمی آہٹ سرسراہٹ۔ سرسراہٹ نے ظلم توڑ ڈالا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔

ان کے قریب کا دار کھڑا تھا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کاردار کے گلے میں گوریاں گزارنے آتے ہیں اور یہاں برساتیاں بکرتے ہیں۔"

"ہماری تو بچے ہوتے ہی نہیں ——" ساجی نے سادگی سے کہا۔ "پریں ایسی تو نہیں، اسے دودھ دینے
یہ فائدہ ضرور ہے کہ دودھ بکتا نہیں، کوٹھیوں میں لگ جاتا ہے اور بازار کا پھیرا بچ جاتا ہے۔"

"اچھا" جمیل نے دریب کہا جیسے آدلی ہو —— اور گھنٹی جھاڑیوں اور اونچے اونچے پیڑوں کے اس جھنڈ
ضرور نے لگا جہاں کاردار گم ہو گیا تھا۔

اس نے دیکھا کہ کاردار دور بلند ہی پر سبزہ زار سے اُبھر رہا تھا اور مری شہر کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے پس منظر میں
ا کے پیڑوں سے مری کی کوٹھیوں اور بے ڈھنگے درمکان دکھائی دے رہے تھے جمیل کوٹھیوں اور بکے مکانوں کے
والا جہاں کوئوں دیکھنے لگا جیسے سرکولیس ہیں پر کھڑا آسمانوں میں رنگ کہاں منا تے دانوں کو گھورتا ہو۔

"آؤ جمیل گھر چلیں۔" ساجی نے اپنا بنت سے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "دادا کو دیکھ رہا ہوگا، پھر مجھے دودھ دینے
ی جانا ہے۔"

جمیل نے اسے یوں چونک کے دیکھا جیسے اس نے کہا ہو۔ "مجھے کاردار کے پاس بھی جانا ہے۔" —— وہ
ا چاپ اس کے ساتھ چل پڑا لیکن کاردار ایک کاشانا بن کر اس کے سینے میں چبھنے لگا۔

"تم چلے تو نہ جاؤ گے؟" —— ساجی نے پوچھا۔ "دل لگا نا میاں!"

"لگا تا بی بڑے کا ساجی!" —— جمیل نے ایسے انداز سے کہا جیسے کہنا چاہتا ہو۔ "تمہارے معصوم حسن
ہوا لاکی بھی نہیں میں ہی تو ہوں۔ اب میں رہوں گا۔"

شام کا صحب ساجی دودھ کی گاگر اٹھاتے تھے۔ تیز کھلی گئی تو جمیل نے اخبار وا ہے ایک بار پھر کہا کہ ساجی جیسی جوان لڑکی
ہو جاتا اچھا نہیں لیکن دادا کو یوں زیادہ ہی اعتماد تھا۔ تاہم اس نے جمیل کے حوصلوں کو بھی نظر انداز نہ کیا۔

"ساجی نہ جائے گی تو ہو کون جائے گا دودھ دینے؟" —— دادا نے بوجھل سی آواز میں کہا۔ "دو چار روز تم دے
ؤ پھر کھیتی باڑی کا دھندا شروع ہو جائے گا پھر بھی ساجی کو ہی جانا پڑے گا۔"

جمیل نے آنکھیں سکیڑ لیں اور ماتھے پر دو شکن نمودار ہوئے۔

"دادا!" —— اس نے دھیمے سے کہا۔ "تم نے کہا تھا اپنی مال کو بلاؤ!"

"بلاؤں!..... میں نے کہا تو تھا!"

جمیل کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "میں اُسے بلاؤں گا..... کسی سے خط لکھوا دیتا ہوں۔ وہ آ جائے گی تو
دادا سے آ کر کہے گی۔ اور بھی سوگا ہم۔ ساجی کا ہاتھ بٹایا کرے گی۔"

"میں تجھے مولوی جی سے خط لکھوا دوں گا۔" دادا نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "ایک آنہ لینے میں پڑھا بھی لکھتے
ہیں تم ایک بات بتاؤ تو وہ دادا نے پاس سے کو لینے ہیں..... میرا بیٹا، اللہ جنت نصیب کرے، رسالے میں ہاکی تھا۔
ہی صاحب اُس وقت جوان تھے جب بھی ان سے خط لکھوایا کرتا تھا۔ میرا بیٹا فوجا چھٹی لے کے آ جاتا تھا۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ساجی دونوں کوٹھوں میں دو دو سو کے کرداروں کے ڈرائنگ روم میں خالین پر بیٹھی تھی۔ وہ اتنی بڑی بیٹھنا نہ چاہتا لیکن سلاون کی گھٹنائیں بڑی زور سے برسنے لگی تھیں۔ کاروار نے تھوڑی سی دیر پہلے ڈھائی من کا چوتھا پیگ پیا تھا۔ بارش کی کھینی بھینی خوشبو اور مٹی کی بھیگی بھیگی عطر بیز فضا نے جن کے نشے میں شمشال دیگر خمار بھر دیا تھا۔ ساجی کا بے حسن اور زہر شکن جوانی خمار میں رنگین شراب کا ڈسپیا کر رہی تھی۔ خواب میں اور دولت اور شراب کے نشے میں انسان نہیں گرگٹ بن جاتا ہے۔ کاروار پر بہت کچھ گزرنے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے ساجی بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔

"تمہارے سے پیٹھ پر سے آنکھوں ساجی؟" تمہارے سے تم پر یہ کتنے مہربان سے لگتے ہیں۔" — کاروار نے گھڑ آواز میں کہا۔ اتر تیس ریشمی کی ساڑھی میں لپٹے کرکاس جلے سے باہر نکلوں تو مری میں آتے ہوئے اسرار اسے تیری راہ میں بچھانے لگیں۔ آہ — وہ مخمور آنکھ والے کے آگے کو جھکا اور ساجی کو کندھے سے تھام کر بولا۔ "پیچھے زمینوں یہاں یہاں شروع پڑا۔"

ساجی ہاتھ تھیں دی جیسے کاروار نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ ہنستے ہنستے اس کی نگاہیں کمرے کی دیوار پر لگیں۔ ساجی کی ہنسی یکایک بجھ گئی۔ تمام تصویریں مغربی عورتوں کی تھیں جن میں کچھ نیم عریاں اور تین بالکل برہنہ تھیں۔ ساجی کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے کاروار کو یوں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا جیسے وہ بھی تصویروں کی طرح برہنہ ہو گیا ہو۔

"یہ تو بڑی بے شرمی والی تصویریں ہیں صاحب جی! تم تو اچھے آدمی ہو۔" — ساجی نے سہمے ہوئے جواب سے — "تم نے کیوں لگا رکھی ہیں؟ یہ تو بڑا کفر ہے صاحب جی!"

"میں دنیا میں اکیلا ہوں ساجی!" — کاروار نے لمبی آہ لی اور اس نے لہجے میں مذہبیت اور اداسی پیدا کرتے کہا۔ "میری کوئی بہن نہیں، بیٹی بھی نہیں۔ ماں ہے نہ بیوی۔ تم نا سمجھو گی ساجی! تم کیا جانو مرد کے لیے عورت کا ساتھ ضروری ہوتا ہے۔ عورت خواہ بیٹی ہو، بہن ہو، ماں یا بیوی ہو۔" — اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ان کو دیکھ دیکھ کر تصویریں لگا رکھی ہیں۔ تم آ جایا کرو، گھومرو، دو گھڑی بیٹھا کرو، میری سنا کرو، اپنی سنایا کرو پھر میں یہ سیوڈو تصویریں پھاڑ کے پھینک دوں گا۔ تم بڑی پیاری لڑکی ہو ساجی!"

ساجی کو معلوم تھا کہ شراب سے بدمست ہو کر انسان کس لہجے میں باتیں کرتا ہے۔ کاروار کے لب و لہجہ شراب کا عادی تھا۔ اسے ساجی دکھ اور غم کا ایک مجسمہ۔

کاروار نے آواز میں اتنی تشنگی لا دکھ اتنا جذباتی اور اس کے الفاظ کا افسوں ساجی کے سادہ دل کو مسخر کر گیا۔ جمیل نے اسے اپنی داستان غم سنائی تھی تو بھی وہ دل ہی دل میں تڑپ اٹھی تھی۔ اب کاروار کی غم آلود باتیں سن کر دل کچھ زیادہ ہی پسیج گیا۔ کاروار اس سے کھڑی، دو گھڑی بیٹھنے کی بھیک بھی مانگ رہا تھا اور وہ بے اختیار سوچ رہی تھی۔ ساجی کے حسن اور بھولے پن کی تعریف کر رہا تھا۔ سپید بڑی سی دل ہی دل میں اور پھوٹے ہیں۔ بن بجا رہا تھا۔ کوئی لگن ہوتی ہے جھومنے لگتی۔ وہ تو سیدھی سادی دیہاتن تھی۔ وہ بھول ہی گئی وہ شام ہو چلی ہے اور اسے کبھی کا گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔

کاروار نے تیر نشانے پر لگتا دیکھا تو اس نے باتوں باتوں میں ساجی کو کندھوں سے تھاما اور اپنے پاس صوفے پر

بٹھا لیا۔ ساجی نے اپنے ہاتھ اس کے سے ہولے ہولے سہلنے لگا۔

"کیا ساجی؟ — کاروار محسوس اتنا کر رہا تھا۔ — تم تو بڑی اداس ہو گئی ہو چکی!... آ کیا کرو گی نا! میرے پاس بیٹھا کرو گی نا؟ تو کتنی پیاری ہے تیری خوبصورت لگتی ہے میرے لیے اندھیرے سے خاصے گھر ڈالا نہیں۔ تم آتی ہو تو مرے بھر کو روشنی سی آ جاتی ہے۔ چلی جاتی ہو تو تنہا اندھیرے میں بے قرار ہونے لگتا ہوں۔"

"آ کیا کرو گی صاحب جی!" — ساجی نے اثبات سے کہا۔ — "میرا کیا گھر ہی ہے۔ اب جاؤں... شام گہری ہو رہی ہے۔" اور وہ اٹھ کے چل دی۔ وہ رات نے میں ایک کو بولی۔ — "اوہ، بارش تو بڑے زور کی ہے۔"

"رک جاؤ تو اچھا ہے۔" — کاروار نے کہا لیکن ساجی نہ رکی۔

کاروار اچک کے اٹھا اور اسے روکنے کی ایک اور کوشش کی لیکن ساجی باہر نکل گئی۔ کاروار بولا۔ "جا ہی ہے تو چھوڑ دوں نہیں کار میں بیٹھی تو کاروار نے کینوس کی چھت چڑھا دی اور جب چھوٹی سی کار بستی بارش کو چیرتی فراٹے بھرنے لگی تو ساجی دیوں لگا جیسے ان بادلوں پر بیٹھی اڑی جا رہی ہو۔ مغربی پہاڑی راستے میں۔ وہ جانے کس دنیا میں جا پہنچی اور کاروار کا ہاتھ اپنے ہاتھ کو بڑے پیار سے سنبھالا رہا۔

"وہ کون ہے؟" — کاروار نے پوچھا۔

ساجی خیالوں سے چونک اٹھی۔

"وہ جو اس روز مقدمے کے ساتھ تھا۔" — کاروار پوچھ رہا تھا۔

ساجی نے اسے تفصیلاً سنایا کہ جمیل کون ہے اور ان کے ماں کس طرح آیا ہے۔ کاروار کو ایک گونہ سکون ہوا کہ اس کا کچھ نہیں کھٹا اور اسے راہ سے ہٹانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔

"کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے اپنی جیسے وقت زندگی کے ایک مقام پر رک گئے ہوں اور خواب جو دو دیکھ رہی تھی بارش میں ہو۔" اس نے دیکھا شام کا اندھیرا بارش سے زیادہ گہرا کر دیا تھا اور کار اس کے گاؤں کے ڈھلانی راستے پر کھڑی تھی۔ ساجی بے اختیار اپنی گھبراہٹ کی کار کو دیکھے بغیر ہی اتر گئی۔

اور پھسلن تھی اور بارش ابھی برس رہی تھی لیکن وہ بیابان تھی۔ بیابانی راہوں کے نشیب و فراز سے آگاہ تھی بلندی سے اتر چلی تھی۔ مٹی میں سے گزرتی اور جب گھر پہنچی تو سب سے پہلے اس کی نظر جمیل پر پڑی جو لالٹین کی زرد روشنی میں کسی خیالوں میں بیٹھا تھا۔ بجھ رہا تھا۔

ماں بولا — دادا نے سرد سے لہجے میں کہا۔ "جمیل ماں کو خط لکھوانے کا کام یہاں آ جائے پھر وہ دو دو دینے

ساجی نے یوں کہا جیسے جھنجھوڑ کر جگا دی گئی ہو۔

www.paksociety.com

Scanned by Azeem Paksitanipoint

اندر ہی اندر دو حصوں میں کاٹ دیا۔ وہ گھر میں تو آگئی تھی لیکن دل ابھی کاروار کی کار سے نہیں نکلا تھا۔ اس کی ہر حرکتوں میں بے دلی اور غیر حاضر دماغی کا پتا چلتا تھا۔

جمیل نے اسے نظر بھر کے دیکھا تو وہ یوں سہم گئی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ وہ کھسیانی سی مسکراہٹ مسکرا بولی ــ "تمہاری ماں آجاتے تو میں شہر جاؤں۔ چھوڑ دوں گی۔"

جمیل مسکرا اٹھا اور جو چیز ساجی کو دو حصوں میں کاٹ رہی تھی اس نے اسے گھسیٹ کر اپنی دنیا میں پھینک دیا اور کاول ایک بے جہت سی کار وار کی کار سے نکل آیا۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ دادا خراٹے لے رہا تھا ــــ ساجی گہری نیند سو رہی تھی لیکن جمیل جاگ رہا تھا۔ ذرا کی ذرا اس آنکھ لگی تھی لیکن خیالوں کی افراتفری نے اسے جھنجھوڑ کے جگا دیا تھا۔ اس کا ذہن رہ رہ کے ماہ و سال پھاند کے کراس کر کھوہ کے منڈیر پر جا رکتا تھا جہاں سے کوئی اس کی نیند سن کو اٹھا لے گیا تھا۔ جمیل سن کے خیال سے تڑپ تڑپ اٹھا اس نے سوچا۔ اگر وہ مر جاتی تو آج ذہن سے اتر چکی ہوتی۔ یہ دکھ تو نہ ہوتا۔

اس نے ذہن کو بہت روکا کہ ماضی میں اتنی دور نہ جائے لیکن ذہن ایک ایک کر کے جھرکے اٹھا اور تصورات ــ دل کش خدوخال کی ایک نوجوان لڑکی اس کے سامنے کھڑی کر دی۔ لڑکی مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی ــ "سن کو پہچانا؟"

جمیل تڑپ کے اٹھ بیٹھا اور اندھیرے نے خلاؤں میں بول نکلنے لگا جیسے اس کی سن دبے پاؤں آتی ہو اور اسے دیکھ کے پاؤں بھاگ گئی ہو۔ اس نے جھنجھلا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن سن کے تصور نے پلکوں کے اندھیرے میں سر کر ساجی کا روپ لیا۔ پھر ساجی اس کے ذہنی دل پر غالب آگئی۔ بے لگی تھنے لگی اور جمیل پر لذت کی غنودگی طاری ہونے لگی۔

رات کے لمحات جیسے جیسے اندھیرے میں سر کتے جا رہے تھے جمیل کا دل یکبارگی چل اٹھا اور اس بے اختیار چلا کہ باجلا کے ایک ٹکڑا ساجی کو دیکھ لے ــ نیند کے سیدھے خیالوں اور خوشنما تصوروں کی جھیل میں اس کا لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو ساجی کا سے دودھ سی تھی اور اس کی گھر سی کھرل میں چارہ کھا رہی تھی۔ دادا کھاٹ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور صبح کا اجالا کھڑکی تا جا رہا تھا۔

ساجی نے دوپہر کا کھانا معمول سے جلدی ہی تیار کر کے دادا اور جمیل کو کھلا دیا۔ دادا نے کہا بھی کہ بیٹا اتنی جلدی لیکن ساجی کے ہاتھوں پر دل میں آج نرالی سی پھرتی تھی۔ بولی ــ "دیکھو کھرل پر بندھے تنگ آجاتے ہیں دادا! باہر جاؤں۔ تازہ گھاس چرا چگ کے دودھ بہت زیادہ دیتے ہیں۔"

وہ جمیل سے کہتی بار کر چکی تھی ــ "گھوڑی کو باہر لے چلو۔ کھرل پر بندھی سی سوکھ جائے گی۔ اتنی اچھی گھوڑی ہے۔"

دادا اور جمیل کو کھانا کھلا کر موٹر لیشن کو آگے لگا کے وہ جمیل کو ساتھ لے کر اسی جگہ چل گئی جہاں دوپہر روز ہوا کرتی تھی۔ جمیل چوکی تک چپ چاپ تھا آج باتیں ہی کیے جا رہا تھا۔ اس نے راہ میں ساجی سے سینکڑوں باتیں ڈال لیں۔

"جمیل! تم نے دیکھا نہیں ــــ ساجی نے کہا۔ "میں تمہیں گاؤں سے گزرتے تین جا آدمی دیکھا رہی تھی لیکن تم باتوں میں تھے۔ وہ آدمی مجھے برابر چھیڑا کرتے تھے۔ کوئی کہا کھانستا تھا کوئی کھنکارتا تھا۔ کوئی مرزا صاحباں کے بول گاتا تھا ساتھ ساتھ تھے! کسی نے ہانکا سانس بھی نہیں لی ــ ساجی نے پھول کی طرح کا تھا نہ لیجیے میں کہا۔ "وہ تم سے ڈرتے ہیں وہ کچھ سے بھی ڈرتے ہیں پر چھیڑنے سے باز نہیں آتے تھے ... وہ مجھے چھیڑیں تو تم انہیں کیا کہو گے؟"

"میں انہیں جان سے مار دوں گا!"

ساجی کے وجود میں انوکھا سا احساس پیدا ہو گیا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ عورت ہے، کمزور ہے اور اسے مرد کی حفاظت کی شدید ضرورت ہے۔ جمیل کی مردانگی نے اس کے سینے میں عورت کو بیدار کر دیا اور اسے ایسا لذت سرشار کیا جس سے وہ ہمیشہ آشنا رہی تھی۔

گاؤں سے وہ رہ رہ پیڑوں اور جھاڑیوں میں چھپی نیکریوں کی اوٹ میں جا رہے تھے اور ساجی رہ رہ کے جمیل کی کالی وہ بوسی تھی جو جمیل کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

"میں گھوڑی پر کبھی نہیں بیٹھی" ــ ساجی نے انکار کیا۔

جمیل بیٹھ پڑا اور گھوڑی روک لی۔ اس نے بے تکلفی سے ساجی کو کمر سے پکڑ کر اٹھایا اور گھوڑی کی پیٹھ پر بٹھا دیا اور خود سواری کرتی تھی تو کچھ بتاتی میں زین ڈال لاتا"

گھوڑی چلا جا رہی تھی۔ جمیل رسی تھامے ساتھ تھا۔ ساجی پہلے تو ڈری لیکن گھوڑی کے ہچکولوں نے اس کی کوئی ایسی حس جگا دی کہ اس پر بیٹھ کر ہی سواری کرتی۔ جمیل کے لمس نے پہلے ہی اس کے جذبات میں ہلچل سی پیدا کر رکھی تھی۔ اس کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ محسوس کرنے لگی جیسے وہ کشتیاں پر تیرتے نیلے، دنیا کی نظروں سے اوجھل، سنسان جھیل میں بھی آگے نکل گئی ہو۔

جھنجھناتے گاتے اور بجریاں بکھرے پھرنے لگے لیکن جمیل گھوڑی کی رسی تھامے آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا۔ سامنے کو وہاں تک لے گیا جہاں اخروٹ کے چار درختوں نے بل جل کر سایہ کر رکھا تھا۔ ان کے ڈالوں پر خود رو بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور اندر گھنی جھاڑیاں دیوار بن کر کھڑی تھیں۔

جمیل نے گھوڑی روکی اور ساجی کو دیکھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ تنہائی، یہ حسن اور جوانی، پیار کی سرخ بڑی سے اپنی اور جمیل نے بے تابی سے کر بازو پھیلا دیئے۔ ساجی گھوڑی کی پیٹھ سے جھکی اور دوسرے لمحے وہ جمیل کے بازوؤں نے محبت سے بھر گئی تھی۔

ساجی کے پاؤں زمین پر تھے لیکن دل دھڑکتے دھڑکتے اتنی رفتار پر جا پہنچا جمیل نے بازوؤں اس کی کمر کے گرد حلقہ کیے تھے اور ساجی کے گٹھے ہوئے ان بازوؤں سے نکلنے کو ایک سی بھی کوشش نہ کی۔ اس کا سینہ بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ساجی محسوس کر رہی تھی کہ جمیل خوبرو ہے، دلیر ہے، اچھا آدمی ہے۔ گھوڑی جو چپ چاپ کھڑی تھی اس نے دیکھ لیا تھا کہ گردن جھکا کے گھاس چرنے لگی۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گھوڑی سے گھڑ ماڑ اتو طشتر ٹوٹ گیا۔ ساجی اور جمیل بیداری کے خواب سے جاگ اٹھے۔ دونوں کی نظریں ملیں ساجی کے ہونٹوں پر جواب آلود مسکراہٹ آئی لیکن جمیل کا دل بیٹھنے لگا۔ اس احساس نے اسے شرمسار کر دیا۔ وہ اجو ہ امانت میں خیانت کر رہے ہے اور اس بڑھے کے خلوص کو فریب دے رہا ہے۔

"سچ کہتے ہو تو مال کو بلا لو گے؟" — ساجی نے شرابی موتی سی لجاتی کی — "تم چلے تو نہیں جاؤ گے نا؟"

جمیل کا ذہن تاول اُبھر آیا۔

"تم رہے تو نہیں مینیا ساجی؟" — جمیل نے پوچھا — "تم اتنی اچھی ہو ..." اور اس کی آواز بیٹھ گئی۔

ساجی کے ہونٹوں پر ایک تبسم آیا جو اس کے ہونٹوں پر پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے جمیل کا ہاتھ تھاما، ذرا سا سنبھلا، پنے بیٹھنے پر رکھ دیا پھر لپٹنے ہوئے ہاتھوں سے سینے پر دبا لیا اور دادی سے گزرتے ساون کے ایک بادل کے کا۔ انہیں ملیٹی دھند میں چھپا لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کے بیٹھ تے بیٹھتے تھے۔ اور گرد کھڑی اپنی بھابیوں اور بہنوں نے انہیں دنیا کی نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ ساجی جذباتی انتشار کی لذت سے مخمور ہوئی جا رہی تھی اور جمیل اپنی جھجھوتی انگلیوں پر اپنی ہوتی جمیل کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں مسل رہا تھا۔ ایک برس گزرا اس نے یہ انگوٹھی ایک میلے سے چاندی کے میں خریدی تھی۔

اُس نے انگوٹھی اتاری اور ساجی کا ہاتھ تھام کر انگوٹھی اس کی درمیانی انگلی میں پہنا دی۔

"یہ کیا؟" — ساجی نے چونک کر پوچھا اور مسکرا دی۔

"پردیسی کا پیار" — جمیل نے پیار سے لبریز لہجے میں کہا۔

"تم؟" — ساجی نے روٹھنے کے سے انداز سے کہا اور انگوٹھی اتار کر بولی — "یوں نہیں ... کبھی نہیں ... میں انگوٹھی یوں نہیں ہونوں کی پیار کے بدلے پیار کیا ہے۔ انگوٹھی بھی انگوٹھی کے بدلے لوں گی۔"

"پگلی ساجی!" — جمیل نے انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لے کر اس کی انگلی میں پہنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "لو میں تو ..."

ساجی نے ہاتھ کھینچ لیا اور بولی — "جب تک انگوٹھی دے نہ لوں گی ہونوں کی نہیں۔" — اس نے مٹھی بند کر اور انگوٹھی دبا لی۔

آنکھیں آنکھوں کو چومنے لگیں، انگلیاں انگلیوں میں اُلجھ گئیں، ہونٹ تھرتھرانے لگے، گاؤں کی سرخی دک اٹھ — اور میں اس لمحے پیڑوں کی گھنی شاخیں، بھجاڑوں کی کھنیری ہریالی اور وادی کا حسن بندوق کے دھماکے سے از اُٹھا پرندے جہاں جہاں بیٹھے تھے سہمیت ہاکی پھر پھڑاہٹ سے اڑ گئے۔ کوؤں نے واویلا بکر دیا، پرندوں کے اس شور میں، بندوق کے دھماکے کے ساتھ ہی ایک چیخ بلند ہوئی اور دوسرے لمحے، بھاگ اور چیخ چیل سے پیڑوں کو

www.paksociety.com

نکاؤں کا ایک بادو تیر دیر کی لو بگلے پر ارکا اپنے بازو پہ ہاتھ رکھے اور سر گھٹنوں میں دیئے دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ ساجی نے بھاگ کر لڑکے کو اٹھایا، دیکھا، اس کے بائیں بازو کو بندوق کے چھرے سے چھرے گزر گئے تھے۔

جمیل نے ادھر اُدھر بھیڑ بکریوں کی بندی بزنگاہ دوڑائی، ذرا باقی ڈور پر نشان پر ایک شہری آدمی اور ایک جواں سال لڑکی کھڑی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ جمیل نے پیچھے قدم بڑھائے، اور ان کی طرف بھاگ اٹھا۔

وہ آفتاب تھا اور اس کے ساتھ اس کی جواں سال بیوی نیلوفر تھی۔ آفتاب ملک کے سمتی علقوں کا جواں سال بنکلا تھا۔ گرمیاں گزارنے مری آیا تھا۔ لاہور میں اس کی اپنی کوٹھی تھی۔ ایک کوٹھی مری میں تھی۔ راولپنڈی میں بھی۔ اس کا خاصی جائداد تھی۔

اس کے ساتھ بندوق اٹھائے، اس کی بیوی نیلوفر تھی۔ نیلوفر حسن اور دل کشی کی پوشاک لاہور، پنڈی اور مری کے سوشل حلقوں میں بہت مشہور تھی۔ اکثر ہی ہوتے تھے۔ علاوہ اس کی شہرت کی دو وجوہات اور بھی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ آفتاب جیسے بلند اور صاحب حیثیت آدمی کی بیوی تھی اور دوسری یہ کہ وہ ادا کی تھی بھی تھی، اس کا ادا رجسے ساجی دو دو دینے جایا کرتی تھی۔

انکل ماڈرنا میرے اس نیلوفر کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ بات کہیں کی بھی ہو، نیلوفر انکل کا ماڈرنا ہو میرے انکل ماڈرنا کر دو۔ میں نے آتی تھی بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کہ ماڈرنا کی بجائے نیلوفر انکل کہنے لگے تھے۔

آفتاب اور نیلوفر کی شادی چھ ماہ کو ہے۔ کار دار نے اپنے ہاتھوں اور ہیلیکوپٹر میں کرائی تھی اور انہیں ہنی مون منانے سوات بھیج دیا تھا۔

کل رات سے نیلوفر آفتاب سے کہہ رہی تھی کہ کل ناشتے سے فارغ ہو کر شکار کو چلیں گے۔ ان کے پاس دو نالی بندوق تھی جس سے مری آئے تھے۔ دو بیں بار شکار کو گئے تھے اور پنکی کبوتر اور فاختائیں مار لائے تھے۔

آج دو بندوق اٹھائے کشمیر پوائنٹ سے نیچے اتر گئے تھے۔ اور اب وہی کبوتر مارے تھے کہ انہیں نیچے ایک شاخ پر فاختہ بیٹھی نظر آئی۔ وہ خوبصورت کی بلندی سے بھی بلند کھڑے تھے۔ نیلوفر نے آفتاب سے بندوق مانگی اور جب فاختہ پر نشانہ باندھا تو آفتاب نے نیلوفر نے دسیان دلا کر فاختہ نے لیں منظر کا سے تھیں چڑیوں میں اور کھاس اور جھاڑیوں کی اوٹ میں کوئی انسان بھی ہو سکتا ہے۔ نیلوفر نے فوراً بندوق چلا دی۔ فاختہ تو اُڑ گئی لیکن چھرے نے ایک ہرا دیا تو کے کا بازو چھلنی کر دیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ تھا اور چھرے کچھ کم تھے۔ ورنہ پوری چھاتی اس کے سامنے چھرے کی چھلنی ہو جاتی۔

آفتاب اور نیلوفر کو تو طوطی زہر ہو گئے کا وہ ایک لڑکے کو زخمی کر چکے ہیں۔ لڑکا خطا جانے یہ وہ بیس سی سے تھے کہ آفتاب کے چہرے کا رنگ بدل گیا جس درخت پر فاختہ بیٹھی تھی اسی سمت سے جمیل لڑکے کو بازوں پر اٹھائے، دھلان پر اتر رہا تھا۔ ساجی بھی ساتھ تھی۔ آفتاب اور نیلوفر نے دیکھا کہ لڑکے کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ آفتاب نے بندوق نیلوفر کے ہاتھ سے لے لی۔

"کوئی نہ گھبرائے نیلوفر نا ہا" — جمیل نے اپنی بزرگی اور عقاب آلود آواز میں کہا اور دھلان پر کھڑے لوگوں کے سامنے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھی جو نیلوفر نے کسی صورت میں نہ کھائی تھی۔ اب رات کے اندھیرے میں جب اس کا مانع نیند سے بوجھل ہو رہا تھا، اس کی پلکوں میں جیسے کانچ اور ہر کنکر اتر رہا تھا۔

نیلوفر نے کروٹ بدلی تو اسے آہٹ سی سنائی دی جیسے برآمدے میں کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ قریب ہی بے خبر گیدڑ مل کر چیخ اٹھے۔ نیلوفر کو لگتا اور اسے خیال آیا کہ خالہ اماں بھی اور نوکر بھی رات بھر کی تھکی لے کر چلے گئے اور کوئی کی نگہبانی کے لیے کوئی بھی نہیں۔ دونوں خالہ اماں اور نوکر برآمدے میں سو رہے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے ایک ہی رات کے لیے چھٹی لے لی تھی۔

نیلوفر کو جو چیز اس کی صورت یاد آئی مگر وہی صورت جو اسے چند لمحے پہلے تک کسی افسانوی ہیرو کی طرح دل کش لگتی تھی اب اس کا سراپا اور کسی مذہب نسانی معلوم ہونے لگی۔

"آپ نے کہا کہ میں دروازے کو بند کر لیتے ہیں؟" — نیلوفر نے آفتاب سے پوچھا اور اسے یاد دلایا۔ "خاموش اور لیسہ آنا نہیں ہیں؟"

"کیا کیجیے ہیں... کیوں؟" — آفتاب نے ہنس کر پوچھا۔ "ڈرتا ہے؟"

"نکل کا راستہ کھلتے ہیں خوفناک ہیں میں رہنے والی مخلوق سے ڈرنا نہیں چاہیے" نیلوفر نے کہا۔ "لیکن جو اپنے کبھی بھی آسمانی مخلوق سے آتے ہیں ناں ایسی بات سے مجھے تو اس آدمی نے ڈرایا ہے تو"

"تم بزدل ہو نیلو!" — آفتاب نے کہا۔ "کہو تو بندوق میں کارتوس ڈال کر تمہارے پاس رکھ دوں؟"

"مجھے تو بندوق سے بھی ڈر آنے لگا ہے!"

آفتاب نے اسے اپنے قریب کر لیا اور وہ بچوں کی نیند سو گئی۔ اوس سے بوجھل رات گزرتی جا رہی تھی۔ بادل پھر برستے رہے تھے۔ میدانوں کی دھلائیں اور دلوں میں اگتے رہے تھے۔ تپتے میدانوں سے آئے ہوئے انسان نے سالی روایتیں اور مذہب پیتی کی نمائش کے لیے جو جگمگا کر رکھا تھا اور بھی کا چھٹ جاتا تھا۔ بند ہوٹلوں کے سامنے بھی سو گئے تھے۔ ایک ایک کر کے سب سو گئے تھے۔ تمام ہوٹلوں پر گھوم رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جنگل سے گیدڑوں کا واویلا بلند ہوتا جو جنگل کی سال سال میں بکھیں ہو جاتا تھا۔

نیلوفر نے سونے سے پہلے برآمدے میں جو آہٹ سنی تھی اور اسے گیدڑ، کتے یا کسی آہٹ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اب برآمدے میں سنائی دی لیکن نیلوفر اور آفتاب باہر کی آہٹوں سے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔ برآمدے کی آہٹ بھیجے کمرے کی طرف سے قریب آ گئی۔ دبے قدموں کی آہٹ کمرے میں تھی۔

کمرے کی کوٹھی میں نیلوفر کی دزدیدہ آہٹ آہستہ آہستہ ٹھنڈے لگے۔ برآمدے کی آہٹ کھڑکی کی راہ اندھیرے کمرے میں آ گئی اور تپتے کے ایک صندوق سے پاس جا رکی۔ کمرے کے اندھیرے میں جیسے کسی نامعلوم روشن سوئی اور اس کی سی روشنی کمرے میں گھوسنے لگی کمرہ کھلنے لگا اور آہٹیں اور اضافہ اور تیزی آ گئی۔

گیدڑ، ایک دو بچہ چلا رہے تھے جب یہ تیغ شعلہ وغیرہ خاصے تو پرانے صندوق اور دراز کیس اندھیرے میں اندھیرے سے

سے برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ کمرے کی دراز کا تالا جیسے آپ ہی آپ کھل گیا ہو۔ تاریک پھر روشنی ہوئی اور کاغذوں کا بند پلندہ دراز سے نکل کر برآمدے میں چلا گیا۔

روشنی کی لکیر دوسرے دروازے سے گزرتی نیلوفر اور آفتاب کے کمرے میں گئی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور دوسرے کمرے کی کھلی کھڑکی کے کواڑ دوسرے کھلے "آفتاب کی" آہٹ کھل گئی۔ اس کے آنکھ میں لکیر تاریک کی روشنی ایک ٹوٹ کے ہوئے سے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیتی تھی۔ آفتاب نے ہاتھ بجلی لیمپ کی طرف بڑھایا تو تاریخ جگمگی اور کسی نے ایک رومال جلتے کی نال اور منہ پر رکھ دیا۔

نیلوفر بڑا جوجال اٹھی۔ اندھیرے میں اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں دو تین آدمی خاموشی سے گھس گئے ہیں اور ان نے لپک کر بجلی لیمپ کا بٹن دبایا لیکن لیمپ روشن نہ ہوا۔ اس نے بار بار دبایا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ بٹن سوئچ آف ہے اور اس کے خاوند کے منہ پر کچھ رومال سے اور کپڑا رکھ دیا گیا ہے اور اس کے ممالک کی ہیئت بڑی کی اندھیری اور بے سرور رات میں گم ہو رہی ہے۔

نیلوفر اٹھی اور آفتاب کو پکارا۔ اس کا بستر ٹٹولا لیکن کوئی وزنی چیز بڑی زور سے اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ ہوش کھا رہستہ بے گر پڑی۔

جو آہٹ اس نے سونے سے پہلے برآمدے میں سنی تھی وہ اب کے خاصی بلند ہو گئی اور کوٹھی سے نکل کر بھاگنے مدھم ہو گئی۔ یہ بھاگتے قدم کا۔ کے زنانے میں تحلیل ہو گئے اور کار سامان کے جھنگے جھنگے اندھیرے میں بڑی کے اور نیچے نیچے تھکوں اور تہ در تہ ہریالی میں گم ہو گئی۔

اگلے روز کار دیگل سنوا جاتا تھا۔ آفتاب کی کوٹھی میں پولیس انسپکٹر خالد، ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہی برآمدوں اور کمروں میں ماپا سوال بنے گھوم پھر رہے تھے۔ خالہ اماں اور نوکر جو صبح واپس آ گئے تھے، ڈرے سہمے برآمدے میں بیٹھے تھے ان کے پاس ایک سپاہی کھڑا تھا۔

کار وارڈ رائٹ روم میں انسپکٹر خالد چائے پی رہا تھا۔ "دو روز میں سارا شہر خالہ تو میں بیڈی پولیس ہیڈ کوارٹر کو لاکر کہ فوں میں آ گئی اور ٹھنڈ کر سیل کیسی اوس گا... انسپکٹر خالد! میں تین رات سونے نہیں دوں گا بھین سے بیٹھنے نہیں دوں گا۔ بڑی عجیبی کا ٹھوٹ گیا ہے۔ اس کا۔ مال لوٹ کیا ہے؟"

انسپکٹر خالد کو معلوم تھا کہ کار اچھو گھو کر رہا ہے کبھی سکتا ہے۔ اس کی پولیس اور اشرو سوئچ سے دوا گا کا تھا اور وہ ناتھا کہ نیلوفر اس کی بھتیجی ہے اور کار وار نزلے پر کار دے گا لیکن پولیس کے ہوتے میں صرف خالہ اماں اور نوکر تھا۔ دونوں نہ چھٹی رہتے۔ نیلوفر جنسیاں میں ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر پر ڈنڈے کی ضرب کا نشان تھا۔ آفتاب لاپتہ تھا۔ سے یقیناً اغوا کر لیا گیا تھا۔ کوٹھی سے چھوٹے بڑا صندوق، دو ایک کیس جن میں نیلوفر کے بیش قیمت زیورات تھے اور سیر

www.paksociety.com
Scanned By World Azeem Paksitanipoint

"انسپکٹر خالد!" — کاردار نے کہا — "آپ مجھے تھیوریاں سمجھانے کی کوشش نہ کریں۔"

"مسٹر کاردار!" — انسپکٹر خالد نے تحمل سے کہا — "آپ میرے سر پر سوار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ اگر میں نے دیکھا کہ تفتیش میرے بس سے باہر ہے تو میں کیس ہی نہیں آتی۔ اسے کاردار کے دل کا۔ آپ کہتے ہیں کہ آفتاب کے فورٹ لیف آدمی ہیں۔ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ میں انہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

کاردار غصے سے اٹھا اور تھانے سے نکل گیا۔

دن کے پچھلے پہر ساجی دودھ لے کے کاردار کی کوٹھی میں گئی تو دل کا تالا لگا دیکھا۔ کوٹھی میں کوئی ملازم بھی نہیں تھا اور وہ کار بھی نہیں تھی جو ہمیشہ کوٹھی کے باہر کھڑی رہتی تھی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی سی دیر ہوئی تھی اور بادل سمٹ کر چل دیئے۔

وہ شام کا انتظار کرتی رہی۔ کیوں کہ اس کے گھر کے تمام برتن اور اثاثہ بھی ساجی نے اسے رام میں لیا اور وہ کچھ دیر میں لتھڑی ہوئی بارش میں نہائی ہوئی گھر پہنچی۔ بیل اسے دیکھ کر ہنسی۔ ساجی نے اسے بارش میں بھیگتے دیکھا تو اسے ایک بلڈیسی نوبیہ ہوئی تھی کہ کاردار کی کوٹھی بند تھی اور دوسری یہ کہ وہ پیسوں والی ڈولی ساتھ لے گئی تھی۔ وہ بیل کے لیے انگلی خرید نا چاہتی تھی لیکن بارش نے بازار تک جانے نہ دیا تھا۔

ساجی کو بچپن سے جیسے جیسے ڈرنے کا شوق تھا۔ اس نے مٹی کی جھوٹی سی ڈولی چھپا کے رکھی ہوئی تھی جس میں وہ پیسے ڈالتی رہتی تھی۔ اب وہ جوان ہو گئی تھی اور گھر کا سارا نظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈولی میں پیسے ڈالنے کی عادت ویسی ہی تھی جیسی بچپن میں تھی۔ اس کے گھر میں پیسوں کی کمی نہ تھی۔ بھینس، گائے اور دونوں بکریوں کا دودھ ملا کر شہر دے آتی تھی۔ مویشی باہر چراگاہ آتے تھے۔ دادا میں اہم تھا تو اپنی فصل ہو جاتی تھی۔ زمیں پہ لے بل تو ڈیا تو کاموں سے اناج سستے داموں طلب تھا۔ سبکتی اور باجرے کی کمی نہ تھی۔ جو فی خرچ تھا نہیں آمدنی زیادہ بھی خرچ کم۔ وہ پیسے دادا کو دے دیتی تھی اور دادا اسی کے بیاہ کے چندے دیکھتا نوٹ اور روپے زنگ میں کپڑوں کے تھیلے جمع کر دیتا تھا لیکن ساجی دادا سے چوری چھپے ایک اٹھنی جو ٹی یا روپیہ اپنی ڈولی میں ڈال دیتی تھی۔ ایک بار اس نے بچپن کے پیسے ڈولی سے نکال کر نوٹوں میں تبدیل کرا لیے تھے اور ڈولی میں خاصی جگہ نکل آئی تھی۔

کل جمیل نے اسے چیل کی انگوٹھی بنانی تو ساجی کو صلاحیتی ڈولی یاد آگئی تھی اور اس نے انگوٹھی جمیل کو لٹا کر ارادہ کر لیا تھا کہ پہلے وہ انگوٹھی بنائے گی پھر اس سے بچنے لگی۔ وہ بھی جمیل کو پیار کی نشانی دینا چاہتی تھی اور اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ جمیل یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی خریب لوگ ہیں۔

آج جب وہ دودھ دینے چلی تھی تو دادا اور جمیل سے چوری ڈولی نکال اور کھیس میں لپیٹ لی تھی۔ شہر کو جاتے راستے میں ڈولی توڑ کے پھینک دی اور پیسے رومال میں باندھ لیے تھے۔ جب بارش کی وجہ سے اس کے ساتھ واپس آ گئے تھے۔

کاردار نیلوفر کے پاس ہسپتال میں تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے جب نیلوفر کے بے سدھ جسم نے فحش جنبش کی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھا اور یکبارگی سر کو زور سے جھٹک کر آنکھیں بند کر لیں پھر جسم سخت ہو گیا۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ سر کی چوٹ اتنی شدید نہیں۔ دل پر صدمے کا اثر ہے۔ یہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں۔ آدھی رات کے بعد ڈاکٹر نے کاردار سے کہا کہ بلوفر کو راولپنڈی سی ایم ایچ لے جانا چاہیے تو بہتر ہے۔ ہو سکتا ہے صبح تک سدھر جائے لیکن بگڑنے کے امکانات بھی ہیں۔

صبح کا اجالا نکھرنے تک نیلوفر راولپنڈی سی ایم ایچ کے ایک ایمرجنسی کمرے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کے نرغے میں بیہوش پڑی تھی۔ وہ انجکشن لگ چکے تھے اور ڈاکٹر پُر امید تھے۔ انہوں نے کاردار سے کہا کہ یہ مریضہ تین تک سنبھل جائے گی۔

دن کے پچھلے پہر نیلوفر ہوش میں آ گئی۔ اس نے سب سے پہلے آفتاب کے متعلق پوچھا۔ کاردار نے جھوٹ جلا کہ وہ مری ہسپتال میں ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔ آفتاب کے متعلق یقین ہو چکا تھا کہ قتل ہو گیا ہے۔

جس وقت کاردار پنڈی ہسپتال میں نیلوفر سے باتیں کر رہا تھا مری میں ساجی دودھ کی گاگر اٹھائے اس کی کوٹھی کے سامنے کھڑی ہر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ دو ملازم ہو کر دوڑ سے چلنے جی تھی دو چوکیدار آ گیا اور اس نے بتا دیا کہ صاحب راولپنڈی چلے گئے ہیں۔ شاید تین چار روز تک آ جائیں گے۔

مری کے تھانے میں انسپکٹر خالد نے آٹھ دس منتخب آدمی بٹھا رکھے تھے۔ یہ مری اور راولپنڈی کے جسٹرڈ فتنہ ساز، بدمعاش، اُستاد جرائم پیشہ اور بسٹری شیٹر تھے۔ انسپکٹر صبح سے انہیں دھمکیاں دے رہا تھا لیکن بات منی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اتنے کچے نہیں تھے کہ یہ وارداتیں اگر ان میں سے کسی کی تھی تو وہ صرف دھمکیوں سے ڈر کر قبول جرم کر لیتا۔

یہ لوگ آدھی رات کے وقت تھانوں اور اڈوں سے گھر [illegible] میں لائے گئے تھے اور اب شام ہونے کو آئی تھی۔ انہیں سوائے پانی کے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔

وہ عرض کے لشتی تھے لیکن جو وہ بندہ گھنٹوں سے خالی سگریٹ کے کش کے لیے تڑپ رہے

www.paksociety.com

Scanned by Azeem Rajpoot

کر چوری چھپے اپنا کاروبار کرتی ہیں۔ پولیس نے انہیں کبھی نہیں روکا تھا کیونکہ مجرم ہمیشہ آدمیوں کی طرح یہ بھی پولیس کے کام کی چیز ہوتی ہیں۔

انسپکٹر خالد اس اسپیڈ پر ان سے ملا تھا کہ اتنی بڑی واردات کے بعد مجرم طوائفوں کے پاس ہی جایا کرتے ہیں، اور ان کی عورت ذات اور تمام لوگوں سے متعلق ہوتا ہے جسے سنجھی ہوئی طوائفیں خوب سمجھتی ہیں۔ اس لیے یہ کچھ چیلنجر گی۔ اگر طوائف ذکا تیاں ہو تو کسی کو بھی وہ چار پیگ پلا کر اور اس پر اپنے حسن کا سحر طاری کر کے اس سے کام کی باتیں اگلوا سکتی ہے مگر انسپکٹر خالد کو تینوں نے مایوس کیا۔ تینوں نے کہا کہ ایسا کوئی آدمی ان کے پاس آیا ہی نہیں۔ تینوں نے وعدہ کیا کہ وہ چوکس رہیں گی، اور جس پر شک گزرا اسے پھانس کر تھانے پہنچا دیں گی۔

ساجی کا کاروار کے چوکیدار نے بتایا کہ صاحب تین چار روز کے لیے پنڈی چلے گئے ہیں تو وہ بازار کی طرف چل دی۔ اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ کاروار کس چکر میں الجھ گیا ہے۔ اس نے گاؤں میں صرف اسی قدر سنا تھا کہ شہر میں ڈاکہ پڑا ہے۔

اس نے بازار میں ایک دکان پر دودھ پیا اور پیسے لے کر قوتِ بازو میں اتر گئی۔ وہ صراف کی دو دکانوں پر گئی۔ مردانہ انگوٹھیاں دیکھیں، لیکن کوئی بھی پسند نہ آئی۔ قیمت کی تو اسے پروا ہی نہیں تھی۔ اس کے پاس بیشمار پیسے تھے۔

دوسری دکان سے نکل تو اسے یاد آیا کہ آگے بازار سے چھوٹی سی ایک گلی مڑتی ہے جس میں تین چار دکانیں آگے چند مکان ہیں۔ انہی دکانوں میں ایک دکان ہے جس میں اس نے ایک بار اس راہ سے گزرنے کی لکڑی کے ہاتھ اور ہاتھی دانت کے گھوڑے اور بڑی پیاری پیاری چیزیں دیکھی تھیں۔ وہ دکان کے اندر چلی گئی تھی اور شوکیس میں اس نے رنگ برنگے موتیوں کے ہار، چاندی کے بند سے اور بیشمار زیورات دیکھے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہاں اس نے سونے چاندی کی انگوٹھیاں بھی دیکھی تھیں۔ یہ دکان ایک میمن سیٹھ کی تھی جس نے زیبائش اور آرائش کا متفرق سامان رکھا ہوا تھا۔

ساجی بازار سے نیچے اتر گئی اور اس گلی میں جا کر دکان میں داخل ہوئی۔ ادھیڑ عمر میمن نے اسے گھور کر دیکھا، وہ بھینچ گئی۔

"کیا چاہیے لڑکی؟" — میمن نے منہ میں رکھے پان کو ایک گال سے دوسرے گال میں منتقل کر کے پوچھا۔

"ہاں لکھا چاہیے!"

"انگوٹھی.... اچھی سی انگوٹھی" — ساجی نے کہا — "بہت بڑی خوبصورت ہیں وہ دکانوں پر دیکھ آتی ہوں پر نہیں آتی۔ سو نے کی ہو"

"چند تو تمہیں یہاں بھی نہیں آئیں گی" — میمن نے اس کے دیہاتی پن کو دیکھتے ہوئے کہا — "بڑے سیٹھ

"قیمت کی بات نہ کرو چاچا!" — ساجی نے کہا — "پیسے بہت ہیں تم میری پسند کی انگوٹھی دکھا دو"

میمن نے ایک ڈبہ کھول کر اس کے سامنے رکھا جس میں پچاس سے ایک سو تیس روپے تک کی انگوٹھیاں تھیں۔ میمن ساجی ان سے زیادہ اچھی انگوٹھیاں نا پسند کر آئی تھی۔ اس نے ڈبہ پرے سرکا دیا۔ دکاندار نے چاندی کی انگوٹھیوں کا ڈبہ آگے کر دیا۔

"چاچا! تم شاید مجھے دیہاتی سمجھ کر ٹرخا رہے ہو" — ساجی نے اکتاہٹ سے کہا — "کوئی اچھی انگوٹھی دکھاؤ۔ قیمت کی فکر نہ کرو"

میمن نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں پوچھا — "مری ہیں رہتی ہو؟"

"نہیں! تیرہ پارلیمنٹ میں" — ساجی نے کہا — "وہ سامنے پہاڑی پر کشمیر پرائمنٹ سے جاتا گاؤں نظر آتا ہے"

"ہوں" — دکاندار نے سر جھکا کر طویل "ہوں" کی اور ساجی کو نظر بھر کے دیکھا، کچھ سوچا اور بولا — "اندر والے کمرے میں تو تمہیں ایک انگوٹھی دکھاتا ہوں"

ساجی پہلے تو جھجکی لیکن دکاندار کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

یہ کمرہ کباڑ خانہ تھا۔ طرح طرح کی چیزوں کے بے ترتیب انبار لگے تھے۔ ایک طرف تپائی پڑی تھی جس پر ٹیلیفون رکھا تھا۔ میمن نے بوسیدہ سا ایک چوبی صندوق کھولا۔ ساجی دیکھ نہ سکی کہ اس میں کیا کچھ پڑا ہے۔ دکاندار نے صندوق سے ٹٹول کر ایک انگوٹھی نکالی اور ساجی کو دکھائی۔

ساجی خوانگوٹھی پسند آگئی۔ بظاہر سادہ سی ساخت کی تھی لیکن جاذبِ نظر تھی۔ اس میں نگینہ نہیں تھا۔ نگینے کی جگہ چھوٹی سی مخروطی ٹیوب لگی ہوئی تھا اور اس ابھری ہوئی جگہ کے پہلو میں چھوٹا سا سپید موتی تھا۔ انگوٹھی دزدی کی تھی۔ ساجی نے بڑی دیہاتی انگلی میں پہن کر اندازہ لگایا تو اسے یقین سا ہو گیا کہ اگلی میں فٹ آجائے گی۔

"کتنے پیسوں کی ہے؟"

"تیرے تو بہت دیتی لیکن تیس روپے سے دوں گا" — میمن نے کہا اور پوچھا — "ساتھ دو پیسے دے دو گی؟ بھلی سونا ہے جو آج کل کہیں نہیں ملتا"

"پچاس روپے لے لو"

"آخری بات" — دکاندار نے فیصلہ کہا — "پچپن سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔ یہ بھی تمہاری خاطر ہے۔ ورنہ سونے کی انگوٹھیاں ملتی ہی کہاں ہیں۔ جیسے روپے کا صرف میرا ہے"

ساجی کی بلا جانے کہ ہیرے اور مرنی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اسے تو انگوٹھی اچھی اور وزنی لگی اور اس نے سر ہلا دیا۔ اس نے کھیس میں لپٹے ہوئے رومال سے پیسے کھولنے چاہے تو دکاندار نے کہا کہ رومال کے حوالے کیے اور پھٹی رومال کے کونے میں باندھ لو۔

"کچھ اور دکھاؤں؟" — میمن نے ساجی کے رومال میں اتنے سارے پیسے دیکھ کر کہا — "بڑے خوبصورت

www.pakistanipoint.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہیں ہے۔ اگلے روز اعصاب سے صدمے کا اثر اور دماغ سے چوٹ کا اثر بہت کم ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے مری چلے جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ کاردار اسے اسی شام مری لے گیا۔

مری آ کر اسے بھوٹ کا تعلق نہیں کر سکتا تھا۔ وہ رہ رہ کے آفتاب کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ اور کاردار تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس قدر جان لیوا خبر اسے کیونکر سنائے۔ باتیں کرنے کے فن کا وہ ماہر تھا لیکن بات ایسی پڑی کہ کوئی نظر نہ آتی تھی۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیلوفر نے پاگلوں کی طرح اس کا گریبان پکڑ کر پوچھا۔ "انکل! خاموش کیوں؟ آفتاب کہاں ہے؟"

کاردار سنبھل نہ سکا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ آفتاب لاپتہ ہے اور اس کے خون آلود کپڑے جنگل میں بکھرے ہوئے ملے ہیں۔

دو روز نیلوفر ہچکیاں لے لے کر روتی رہی اور کاردار اسے مشفق باپ کی طرح بہلاتا رہا۔ لوگ بچوں کو کھلونے کے بہلاتے ہیں لیکن کاردار نیلوفر کو کاکے کے جدید ترین ناول اور امریکہ اور فرانس کی سیر کے وعدوں سے بہلا رہا تھا۔

تیسرے روز نیلوفر نے سن جانا کا حقیقت کو قبول کر لیا کہ اس کا خاوند قتل ہو چکا ہے اور اپنے پیارے کی لاش اور مجرموں کا سراغ لگانے میں مصروف ہے۔ ایک روز پیشتر انسپکٹر خالد کئی گھنٹے اس کے ساتھ رہا تھا۔ اس نے پرسوالوں پر سوال کر رہا تھا اور وہ جواب دیتی رہی تھی۔ انسپکٹر خالد اس سے اس انداز میں باتیں کر رہا تھا جیسے آفتاب کو جنگل سے زندہ نکال لائے گا۔ اس سے نیلوفر کے دل و دماغ میں اُلجھن سی قوت پیدا ہو گئی تھی۔

کاردار نے نیلوفر کو اپنی کوٹھی میں منتقل کر لینا چاہا لیکن وہ اپنی کوٹھی میں رہنے کی ضد کر رہی تھی۔ کاردار نے اسے سمجھایا کہ اس کوٹھی میں اس پر ہول طاری ہوتا رہے گا اور وہ وہاں اکیلی رہ نہ سکے گی اور آفتاب ہر وقت اسے یاد آتا رہے گا لیکن نیلوفر اپنی ہی کوٹھی میں رہنے کی ضد پر اڑ گئی۔ انسپکٹر خالد نے کاردار کو مشورہ دیا کہ ہو سکتا ہے اسے اپنی پرانی کوٹھی میں قرار آ جائے۔ چنانچہ وہ اپنی کوٹھی میں آ گئی۔ وہاں ایک چوکیدار اور دو ملازم تھے۔ انسپکٹر خالد نے ان کے لیے ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ نیلوفر کی کوٹھی میں سویا کرے۔

دوسرے دن کی پچھلی پہر تھا۔ نیلوفر گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک اعصابی تناؤ میں کچھ کمی محسوس کی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے کوئی سدیوں پرانے کھنڈرات میں گھم پھر رہا ہو کہ وہاں موت کا سکوت تھا۔ جس میں اس کے اپنے دل کی آہٹ بڑی اونچی سنائی دے رہی تھی۔ ایک دو بار تو وہ اپنی آہٹ پر چونک کر اٹھ گئی تھی۔ دیوانی وار ادھر دیکھنے لگی کہ آفتاب کمرے میں گھم پھر رہا ہو کہ کوئی کی سرجیز اسے آفتاب کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے قوت اور ٹانیاں اماں میں تھک رہی تھیں لیکن نیلوفر کو جو حالت نہ بیتی تھی۔ اس امانی کو کھولے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس ویران کوٹھی اسے بھوت کی طرح بھول نظر آنے لگی۔ وہ اپنا سر گھم کے اٹھیں

اس کی نظر بندوق کے بکس پر پڑی۔ بکس کھلا ہوا تھا۔ اس نے یاد آ گیا کہ اس بندوق سے اس نے کیا

لڑکے کو زخمی کر دیا تھا اور اسے یہ بھی یاد آیا کہ انسپکٹر خالد نے اسے کہا تھا۔ "زرا دماغ پر زور دیں اور یاد کریں کہ اس کو کوئی خاص بات یا کوئی غیر معمولی واقعہ تو نہیں ہوا تھا؟"

نیلوفر کو کچھ بھی یاد نہ آ سکا تھا۔ اس چوہیتی تھی اس کے مقابلے میں کون سا واقعہ زیادہ غیر معمولی ہو سکتا تھا۔ اس نے دماغ پر زور دیا تھا تو سر دکھنے لگا تھا جیسے چوٹ کا درد سنسنے سر سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے جھنجھلا کر کہہ دیا تھا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی ہوا" اس کے ذہن میں نے سونے سے زیادہ پیچھے پر آمدہ ہے میں آہٹ سنی تھی؟"

اب اس نے بندوق کا بکس دیکھا تو معاً اس کے ذہن میں انسپکٹر خالد کا سوال گونجنے لگا اور اسے یاد آ گیا کہ اس روز تو اس کی زندگی کا انتہائی ہیبت ناک واقعہ ہوا تھا۔ اس نے ایک لڑکے کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ تمام واقعہ اس کے ذہن میں شوشہ بہ شوشہ تازہ ہو گیا اور اس ہولناک منظر سے جمیل کا پیکر ابھر آیا جو ابھر تے نیلوفر کے اعصاب پر آسیب کی طرح غالب آ گیا۔

"خون کا بدلہ خون ہوتا ہے" ۔۔۔ نیلوفر کے ذہن میں جمیل کی چیخ گونجنے لگی۔ "تمہارے پچھلے تمہاری لاشوں کو ڈھونڈتے پھریں گے انہیں قدم نشان نہیں ملے گا؟"

جمیل نواب سپن نظر میں کی یونانی دیوماللا کا پراسرار سردار لگا تھا مگر آج اس نے یقین کی صداقت محسوس کیا کہ اس کے ساتھ جو خوبصورت پہاڑی لڑکی تھی کسی غیر قدرتی جہاں کی مخلوق تھی جو زخمی بچے کو اٹھا کے جنات کی طرح جھنگوں کے گھنے سبزے سے غوار نہ ہوئے تھے اور چمکی دمکی دے کر سبزے میں ہی تحلیل ہو گئے تھے اور رات کو اتنا کہ اس کے خاندان کو اٹھا لے گئے ہیں۔

اس پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ دوڑ کر ٹیلیفون والے کمرے میں گئی اور انسپکٹر خالد کو ٹیلیفون کیا۔

انسپکٹر خالد کے پاس تو دو جنوں چھوٹے موٹے کیس تھے لیکن وہ سب اغوا مذاکرات کے آفتاب کے قتل کی گتھیاں سلجھانے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ نیلوفر سے بھی کوئی کام کی بات نہ مل سکی تھی اور وہ فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ کیس پلیٹ فارم سی آئی اے کے سپرد کر دیا جائے۔ فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ریسیور اٹھایا اور نیلوفر کی آواز پہچان لی۔

نیلوفر نے اسے اس دن کا تمام واقعہ من و عن سنا دیا کہ کس طرح اس کی گولی سے ایک نوجوان ہیکر زخمی ہوا تھا اور ایک جوان سال پہاڑی آدمی نے انہیں کھلی دی تھی۔ نیلوفر نے انسپکٹر خالد کو جمیل کی دھمکی بھی سنا دی۔

انسپکٹر خالد کے چہرے پر ایسی رونق آ گئی جیسے اس نے آفتاب کے قاتل کو پکڑ لیا ہو اور اس کا درد سر یکلخت ختم ہو گیا ہو۔

"آپ میرے ساتھ وہاں تک چل سکیں گی نا؟" ۔۔۔ انسپکٹر خالد نے پوچھا۔ "جہاں آپ نے گولی چلائی تھی۔ اسی مقام سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کون سے گاؤں کا آدمی تھا؟"

"آپ کس وقت آئیں گے؟" ۔۔۔ نیلوفر نے پوچھا۔

www.paksociety.com
Scan & Pdf Sagar Azeem Pakistanipoint

"میں شاید علمدی نہ بیچ سکوں۔" انسپکٹر خالد نے کہا۔ "پیلٹی سے ایک کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر بارش آگئی تو کل صبح سسی... مسز آفتاب آپ سے ذرا کام کیا ہے۔ اب میں فوقتی سے پوچھ سکتا ہوں کہ ملزموں کا سراغ دو تین روز میں مل جائے گا... آپ کے اس آدمی کا حلیہ تو یاد ہوگا؟"

"میں اس کا ایک ایک نقش بیان کر سکتی ہوں۔" — نیلوفر نے کہا اور ذرا رک کر بولی۔ "لیکن انسپکٹر صاحب! اتنے خوبصورت چہرے کے نقش یاد کرتی ہوں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔"

"دل کو مضبوط کریں مسز آفتاب!" — انسپکٹر خالد نے کہا۔ "مردوں کی طرح میرا ساتھ دیں۔ ہم مجرموں کو پکڑ لیں گے۔"

نیلوفر نے رسیور رکھا تو اس کی نظریں کمرے میں یوں بھٹکنے لگیں جیسے جیل ایک سائے کی طرح کمرے میں گھوم پھر رہا ہو۔

جس وقت نیلوفر اور خالد کی باتیں ہو رہی تھیں، کار دار اپنی کوٹھی میں گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ گذشتہ چار پانچ روز بہت ہی مصروف رہا تھا۔ راتوں کو بھی پولیس کے ساتھ بھاگا دوڑتا رہا تھا۔ نیلوفر کی بیماری نے اس کے اعصاب کو تھکا دیا تھا۔ اب وہ صحت یاب ہو گئی تھی تو کار دار کو بھی سکون نصیب ہوا تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا کھا یا اور گہری نیند سو گیا۔

سائے ڈھل رہے تھے جب اس کی آنکھ کھلی۔ تھکے ماندے اعصاب تھکانے سے آگئے اور اس نے ذہن اور جسم میں تازگی محسوس کی۔ وہ اٹھا، نہایا اور چائے پی کر سوچنے لگا کہ آج شام کون سی تفریح کی جائے۔ وہ بڑی شدت سے تفریح کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ذہن میں کئی تفریحات آئیں لیکن دل نے ایک بھی قبول نہ کی۔

تفریح سے ہٹکی تو ذہن نکل کر تین چار پیگ پینے اور کمرے کے چھاتک کر دیکھا، موسم بڑا پیارا ہو رہا تھا۔ بادل چیل کے پنکھوں سے بھی نیچے آگئے تھے۔ اس نے سوچا کار لے کے کہیں دور ہی سے آگے نکل جائے لیکن خیال آیا کہ اکیلے کیا خاک لطف آئے گا۔ کوئی ساتھ تو ہو۔

اس نے ذہن پر زور دیا تو اسے پانچ چھ لڑکیوں کا خیال آیا لیکن کار دار نے سر جھٹک دیا۔ وہ خوبصورت تو تھیں لیکن اچھا ساتھ نہیں تھیں۔ بڑی کھوکھلی سی گفتگو کرتی تھیں اور ان کی نظر کار دار کی جیب پر رہتی اور وہ تحفے مانگتی رہتی تھیں۔

اسے آغا جان محمد خان کی دوسری بیوی یاد آگئی۔ اس کا دل پگھل اٹھا لیکن دن کے وقت وہ اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ بڑھا آغا اپنی اس نوجوان بیوی کو کسی وقت تنہا باہر نکلنے نہ دیتا تھا۔ یہ تو کار دار کی بلا گیری تھی کہ اس نے ایک تعزیت پر اس حسین لڑکی سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور دوسری کسی بار ہی سے۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی کوٹھی میں لے آیا تھا۔

کار دار جس سوسائٹی کا فرد تھا اس سوسائٹی پر امریکہ اور برطانیہ کا سحر طاری تھا۔ اس سوسائٹی میں نسوانی ساتھ کی کمی تھی۔ کسی عورت کا کسی غیر مرد کے ساتھ بے تکلف نہ ہونا وقائی اور جاہلانہ حرکت تھی لیکن آغا جان محمد خان کی دوسری بیوی عورت ہی تھی۔ ماں کا جذبہ اس میں بیدار ہو گیا تھا اور ساجی اپنے قریب سے اڑتے اور پیچھے ہٹتے درختوں کو بچوں کی سی حیرت اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ ساون کے بادل نیچے اتر آئے تھے۔ ایک جگہ بادل کا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سگنا سٹرک پار آتا تھا۔ کار دائیں کار کی رفتار کم نہ کی اور بال میں سے گزر گیا۔ بھولی بھالی پہاڑن لطف اندوز ہوئی۔ اور اس کا ذہن ان بادلوں میں چلا گیا جو پہاڑوں سے اُوپر اُڑے جا رہے تھے۔

کار دار نے ایک بار اس کے بازو کی چٹکی لے کر پیار سے کہا۔ "تم تو میری گڈی ہو جی بھر کے سیر کرو تم نے پہیاں چل چل کے بھول جیسے اپنے پاؤں کا ستیاناس کر لیا ہے" ۔۔۔ اور ساجی کھل کھلا کر ہنس دی اور کچھ بھی نہ سوچ سکی۔ اسنے کار کا نام اچھا نکالا تھا۔ اسی کو بار بار سجا رہی تھی۔

کار کی چھت اتنی نیوٹی تھی۔ دائیں طرف جنگلوں میں ڈھکی ہوئی پہاڑی تھی اور دوسری طرف گہری ڈھلان۔ نیچے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اور دُور پس منظر میں کے ڈوکا سپید سپید سلسلہ کوہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس طرف دیکھو تو اُڑنے کا گمان ہوتا تھا۔ کار کے پہیے جب موڑ کاٹتے چرچراتے تھے تو ساجی کی رگ رگ میں الوکھی سی لذت سرایت کر جاتی تھی۔

کار دار اس کے ساتھ باتیں کرتا جا رہا تھا۔ اس کی باتوں کے سحر نے سادہ لوح پہاڑن کو مسحور کر لیا اور کار کے جادو نے اسے جوانی سے دور پیچھے پچھلے میں پھینک دیا۔ اس پر خود فراموشی طاری ہو گئی اور وہ بہت کچھ بھول گئی۔

جھیل کی گھڑی جھیل اُمنڈ پڑا ٹھاٹھے پہاڑی راہیں پھلانگتی جا رہی تھی۔ وہ ٹیکیاں اچھلتی کودتی گزر گئی تھی کتنی ہی ڈھلوانیں اتری تھی۔ کتنی ہی چڑھائیاں چڑھی تھی۔ جھیل کا کچھ خبر نہ تھی کہ وادیوں ہی وادیوں میں کس سمت چلا جا رہا ہے اسے اسی قدر خیال تھا کہ وہ بہت دور نکل آیا ہے اور سورج غروب ہو نے کو ہے۔

اس نے گھڑی کی رفتار کم کر دی اور آہستہ آہستہ خراماں خراماں ایک وادی میں سے گزرنے لگا۔ آگے درختوں نے راہ روک رکھی تھی جھیل بڑی ہی اجنبی تھا ایسی پہاڑوں کی بھری بھری دشوار نگار دنیا سے خوب واقف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ دونوں طرف پہاڑیاں ہیں اور درختوں کی اوٹ سے سامنے آسمان نظر آ رہا ہے۔ آگے غروب سڑک ہو گی۔ وہ جھکے جھکے درختوں سے گھڑی کو گزارتا آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

کار دار ساجی کے ساتھ ہنسی مذاق اور چہچہاہٹوں کو کار کو اب دھیمی دھیمی رفتار پر لیے جا رہا تھا۔ وہ اب سامنے کم اور دائیں طرف کی پہاڑی کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔ وہ آبادی سے بہت دور نکل گیا تھا۔

اس نے کار کی رفتار اور سست کر لی۔ دائیں طرف اسے تنگ سی وادی دکھائی دی تو اس نے کار کو وادی کی طرف موڑ لیا۔ چھوٹی سی کار پتھروں پر اچھلتی گئی اور آگے بڑھتی گئی۔

"اس طرف کہاں صاحب جی؟"

کار دار ہنس پڑا اور بولا۔ "تمہیں دکھنا ہے چلا جوں کو کار۔ صرف سڑک پر ہی نہیں پتھروں پر بھی چل سکتی ہے۔ آگے ندی آ گئی تو دیکھنا کار تیر کر پار ہو جاتی ہے گی۔ کوئی کھڈ آیا تو کار گھڑی کی طرح پھلانگ جاتے گی۔"

"ایسی صاحب جی؟"

"دیکھتی۔ ہو؟"

اور کار اچھلتی کودتی گھنے درختوں کے ساتھ تلے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوتی گئی۔ آگے سے تنگ سی وادی چلمنی فراخ ہو گئی جنگلی بیلوں، جھاڑیوں اور درختوں نے جگہ جگہ ایسی اوٹ بنا رکھی تھی کہ اندر بارش کا خطرہ بھی نہ پڑے۔

کار دار نے گھوم کے پیچھے دیکھا۔ پیچھے سوائے گھنے جنگل کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دائیں بائیں پہاڑ اور سامنے بھی پیچھے کی طرح جنگل تھا۔ بارش سے بوجھل بادلوں کے ٹکڑے درختوں پر تیر نے پھیل گئے اور کار دار کی پر دھڑکا کا پردہ ڈال دیا۔ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ کار دار نے کار ایک طرف سے موڑ کر بیلوں کی اوٹ میں کر دی اور بریک لگا کر انجن بند کر دیا۔

اس نے ساجی کی کھڑکی تھام کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا اور ایسی مسکراہٹ مسکرایا جس میں شیطان ہنس رہا تھا۔ اس نے ساجی کو کندھوں سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

"تم کتنی پیاری لڑکی ہو ساجی" ۔۔۔ اس نے ساجی کے بھورے بھورے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بڑے پیار سے کہا ساجی چونکی۔ اس نے پرے ہٹ کر کار دار کو حیرت سے دیکھا۔ وہ بچپن سے اچھل کر جوان ہو گئی۔ اس کا بھولا پن غیرت میں بدل گیا۔ اس کی مسکراہٹ نے ایسی تنبیل اختیار کر لی جیسے اس کے دانت پیس رہے ہوں۔

"ابھی کہنے کیوں کچھ ہی گی؟" ۔۔۔ کار دار نے اس کے دونوں گال تھام کر بڑے پیار سے کہا۔ "سمجھ نہیں کی میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟ کچھ اور نہیں۔ یہاں کوئی نہیں دیکھتا۔ یہاں تک آ تا ہی کون ہے؟ مجھے تمہاری عزت کا خیال ہے ساجی" ۔۔۔ اس نے اسے پھر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ نا، دور نہ ہٹو"

کار دار نے جیب میں ہاتھ ڈالا ۔۔۔ دس دس اور پانچ پانچ کے جانے کتنے ہی نوٹ ساجی کی طرف بڑھا کر بولا "تمہاری قیمت بہت زیادہ ہے ساجی! ابھی یہ لے لو کل اور دوں گا" ۔۔۔ اس نے ساجی کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"چلو صاحب جی!" ۔۔۔ اس نے گھبرا کر کہا ۔۔۔ "میں ایسی نہیں چلو مجھے واپس لے چلو" ۔۔۔ اور وہ کار سے باہر نکلنے لگی لیکن کار کا دروازہ اس سے کھلتا نہ تھا۔

کار دار نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا اور بولا ۔۔۔ "اتنے سارے پیسے دے رہا ہوں۔ کتنے پیار سے کہہ رہا ہوں۔ بلاوجہ شرما رہی ہو۔ تمہارے گاؤں کی لڑکیاں دس روپوں پر آ جاتی ہیں اور تم ڈھیر سارے نوٹوں پر بھی راضی نہیں ہوتی"

"دیکھو شرم کرو صاحب جی!" ۔۔۔ ساجی نے غصے سے کہا۔ "خدا کی ذات سے ڈرو"

کار کا دروازہ تو وہ کھول نہ سکتی تھی چھت اتنی نیوٹی تھی۔ وہ اٹھی اور کود کر باہر گر گئی۔ کار دار بھی باہر آ گیا اور ساجی کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"پاگل پہاڑن!" ۔۔۔ اس نے کہا۔ "یہاں تمہیں مار کے پھینک جاؤں تو مجھے کوئی پکڑ نہیں سکے گا۔ بھاگ کے کہاں جاؤ گی کہاں؟ یہاں تمہیں چھڑانے کوئی نہیں آئے گا"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس نے اسے سینے کے ساتھ دبا رکھا تھا۔ ساجی مزاحمت میں تڑپنے لگی۔ وہ قدبت کے لحاظ سے ساجی سے تھی کئی بڑا اور قوی تھا۔

گھڑی کی پہاڑن کے سینے میں بڑی طاقتور عورت بیدار ہوگئی۔ اس نے دانت کارادار کے بازو میں گاڑ دیئے۔ کارادار مارے درد کے بلبلا اٹھا لیکن ساجی کے دانت ابھی تک اس کے بازو میں اترتے جا رہے تھے۔ کارادار نے ساجی کی دو انگلیوں کے درمیان اپنی انگلی رکھ کر زور سے دبایا تو ساجی تڑپ اٹھی اور دانتوں کی گرفت نرم ہوگئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی انسان کی انگلی نہیں لوہے کی سلاخ تھی جو انگلیوں کی ہڈیاں توڑ رہی تھی۔ اوپر کارادار کے ہاتھ کا آہنی شکنجہ دبتا جا رہا تھا۔

ساجی درد سے دوہری ہوگئی۔ اس نے جھٹکا دیا تو پتھر اٹھا لیا اور کارادار کے گھٹنے پر پوری ضرب لگائی۔ کارادار کے ہاتھ کا شکنجہ ڈھیلا ہوگیا۔ ساجی تڑپتے ہوئی، اور پوری طاقت سے کارادار پر پتھر پھینکا جو اس کے کندھے کو چھوتا آگے نکل گیا۔

"اب آمیر سے قریب ہو رہو ذرا۔۔۔" ساجی نے روتے ہوئے للکارا۔

"ابھی بھی ہاں جا، یہاں تجھے بچانے والی نہیں آئے گا۔"

"میرا اللہ بیلی ہے۔۔۔" ساجی نے کہا۔ "میرے قریب تو آ۔۔۔" وہ للکار رہی تھی۔

کارادار اس کی طرف بڑھا تو ساجی پتھر اٹھانے کو جھکی لیکن کارادار نے اسے اٹھنے نہ دیا اور اسے دبوچ لیا۔ اس کا ایک بازو ساجی کے سینے پہ لپٹا ہوا تھا۔ ساجی نے بازو کے پیچھے پر ایک بار پھر دانت گاڑھ دیئے۔ کارادار نے اس کی پیٹھ پر گھونسہ مارا تو ساجی نے دانتوں کو اور زیادہ دبایا۔ کارادار کے دانت پسینے کی بو سے اور وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا۔

اسی حالت میں دونوں سیلوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر آ گئے۔ کارادار نے اپنا بازو اس قدر زور سے جھٹکا کہ ساجی کی پیٹھ جیل کے تنے سے جا لگی اور کارادار کا بازو اس کے دانتوں سے نکل آیا۔ ساجی گر پڑی۔ وہ اٹھ رہی تھی کہ کارادار ایک بار پھر اس پر جھپٹ آ رہا تھا اور اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

وادی میں بلند آواز گونجی۔ "ساجی۔۔۔" اور اس کے ساتھ ہی گھوڑے کے قدموں کی آواز سنائی دی۔

کارادار نے چونک کر دیکھا۔ میرے پھیپھیں قدم اور جیل گھوڑی پر سوار آ رہا تھا۔ اس نے دونوں کو گھورتے دیکھا اور دو چار لمحے دیکھتا رہا تھا لیکن ساجی کو پہچان نہ سکا تھا جب پہچان لیا تو اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور صرف کر کے آواز دی تھی "ساجی۔۔۔" اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی تھی۔

کارادار نے جیل کو دیکھا تو وہ کار کی طرف بھاگا۔ جیل قریب آ کر گھوڑی سے اتر رہا تھا۔ کارادار کار میں بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے پوری رفتار سے پیچھے لے جانے لگا۔ جیل گھوڑی سے اتر آیا۔ دیکھا کار پتھروں پہ اچھلتی دور نکل گئی تھی۔ وہ بھاگ کر گھوڑی پر بیٹھا اور ایڑ لگا دی۔

"یہ مجھے زبردستی یہاں لے آیا تھا۔۔۔" ساجی نے روتے ہوئے کہا۔

جیل نے کچھ نہ سنا۔ وہ کار کے تعاقب میں ایڑ لگا چکا تھا۔ کار تو چل جا رہی تھی کیونکہ جیل کو یہ شکل پیش آئی ہو وہاں درختوں کے جھنڈ تھے جن کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور جیل کی راہ روک رہی تھیں۔ اس کے علاوہ پتھریلی زمین تھی اور گھوڑی اس رفتار سے بھاگ نہ سکتی تھی جس پر جیل اسے بھگا رہا تھا۔

کارادار گھوڑی میں دس بارہ قدموں کا فاصلہ تھا۔ کار سڑک پر پہنچ گئی اور گھوم کر مری کا رخ کیا۔ جیل کو اس رخ پہنچنے کا وقت مل گیا جب وہ کار کے قریب پہنچا۔ کارادار نے گیئر بدل کر ایکسیلیٹر دبایا۔ جیل نے لگی ہوئی گھوڑی کی باگ کو جھٹکا دے کر ڈھیل دی اور گھوڑی کے پیٹ میں بڑی زور سے ایڑ ماری۔

تھوڑی دیر تک گھوڑی کار کے پہلو بہ پہلو کار کی رفتار پر بھاگتی گئیں کار آگے نکلا تو جیل کا خوف نمودار ہوا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔۔۔ آگے کو موڑ تھا کہ اس رفتار پر طریقہ سکتی تھی۔ کارادار نے رفتار کم کی۔ آگے سے ایک اور کار آ گئی۔ سڑک تنگ تھی۔ کارادار کو اور آہستہ ہونا پڑا۔ اتنے میں جیل کی گھوڑی اس تک پہنچ چکی تھی۔ گھوڑی کے لیے اس رفتار پر موڑ کاٹنا مشکل نہ تھا۔ کوئی نصف فرلانگ تک کارادار گھوڑی دوش بدوش بھاگے۔ اگلا موڑ ہو رہا تھا وہ کار گھوڑی سے آگے نکلنے لگی۔

جیل اس وقت انسان کم اور انتقام کا شعلہ زیادہ تھا جو کارادار کو بھسم کر دینے کو اس کے نفس میں اٹھا رہا تھا لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ گھوڑی بہت دور سے والیوں میں بھاگ رہی تھی۔ اب ساتھ نہ دے سکے گی اور اگر کارادار نکل گیا تو انتقام کی آگ اس کا باسینہ جلا ڈالے گی۔

کارادار آگے نکلنے والا تھا کہ جیل نے اپنے بدن کا سب سے نکیلا بھاگ لیا۔ ایک ٹانگ گھوڑی اور گھوڑی سے کار میں کود گیا۔ اس نے کارادار کے بالوں کو مٹھی میں لیا اور اس قدر زور سے کھینچا وہ کارادار کا سر پیچھے پیٹ چلا گیا۔

کار بے قابو ہو کر دائیں طرف کی ڈھلان کے کنارے پر چلی گئی۔ وہاں سے ٹوٹی تو ایک دفعہ پہاڑی پر چڑھنے لگی لیکن سڑک کے کنارے جڑی ہوئی کھدی ہوئی تھی۔ کار کے پہیے ناکارہ ہونے لگے۔ کارادار نے بریکیں لگا دیں اور انجن بھی بند کر دیا۔ جیل نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر پیچھے کھینچ رکھا تھا۔ کار دھچکے سے رکی تو وہ ساتھ والے شیشے پر گرا اور سنبھل گیا۔ کارادار سیدھا ہوا تو پیچھا ہوا تھا اور اٹھنے لگا تھا۔ جیل نے اس کے منہ پر تین چار گھونسے جما دیئے۔ کارادار نے دروازہ کھول لیا اور سڑک پر جا نکلا۔ اتنی دیر میں جیل باہر آیا۔ مدافعت لینے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

دونوں میں گھونسے بازی ہونے لگی۔ ایک بار تو جیل کو پڑا لیکن کار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرے کو گھونسوں سے لہولہان کرتے ہوئے دونوں سڑک کی دوسری طرف چلے گئے جدھر گہری کھائیاں تھیں۔ جیل کے جبڑے پر ایسا گھونسہ پڑا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کھائی کے منہ پر گرا۔ کارادار نے جست لگائی اور جیل کے منہ پر پھٹ پڑنے کی کوشش کی لیکن اس کا ٹخنہ جیل کی گرفت میں آ گیا۔ جیل نے ٹخنہ زور سے کھینچا اور مڑا بھی دیا اور کارادار کو گرا کر پڑا جیل نے ٹخنہ پڑے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کارادار کھائی کے منہ پر پڑا تھا۔ وہاں سے کاٹنا تو تھا لیکن اس کی رنگت اڑ چکی تھی اور کار۔ نیچے جیل کے ٹخنے سے ایسا قابو کر رکھا تھا کہ وہ اٹھ نہ سکتا تھا بلکہ آگے کو سرک رہا تھا۔ جیل نے اس کے کولہے پر پھٹ پڑا لاتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ملنہ چھوڑ دیا۔ تاہم وہ ذرا سے ہی دھکے کا منتظر تھا وہ کھائی میں لڑھک گیا۔ سیدھی گھڑی ڈھلان پر چھڑیاں تھیں جو کار دار کا وزن سنبھال نہ سکیں۔ پتھروں سے ٹکرا تے نیچے ہی نیچے لڑھکتا گیا۔

جمیل نے سانسوں کو سنبھالا اور گھوم کر دیکھا۔ اس کی گھوڑی سڑک کے دوسری جانب بے نیازی سے گھاس چر رہی تھی اور ساجی بھاگی چلی آ رہی تھی جب وہ جمیل کے پاس پہنچی تو جمیل نے اس کے منہ پر پھر تھپڑ مارا اور وہ بکھر کر گری۔

"میں کہتا نہ تھا شہر میں تیرا جانا ٹھیک نہیں" — اس نے گرج کر کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

ساجی بیاختہ جمیل سے لپٹ کر سسکیاں لے لے کر رونے لگی جمیل نے اسے بڑی ہی زور سے تھپڑ مارا تھا لیکن اس تھپڑ میں جو اپنائیت اور ہمدردی تھی، اسے ساجی نے شدت سے محسوس کیا۔ دنیا میں دادا کے بعد اس کا کوئی اپنا تھا تو وہ جمیل ہی ہو سکتا تھا۔

"تم نے مار دیا اسے؟" — ساجی نے گھبرا کر کہا — اسے اپنے گال پر تھپڑ کے درد کا احساس ہی نہ رہا۔

جمیل کو جھنجھوڑ کر بولی — "بھاگ جو جمیل، بھاگ جلو۔ بچالیتی چڑھ جاؤ گے۔ وہ مر گیا ہوگا" — اس نے بھاگ کر چلنے کا سہارا لیا اور جھک کر نیچے دیکھا لیکن گھنی جھاڑیوں اور چند درختوں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا جیسے کھائی کی تہ تھی ہی نہیں۔

کار سڑک کے کنارے نالی میں کھڑی تھی جمیل نے ساجی کو گھوڑی پر بٹھایا اور خود پیدل چل پڑا۔ اس کا رخ مری کی طرف تھا۔

"اس طرف نہ چلو" — ساجی نے گھبرائی گھبرائی سی آواز میں کہا۔ "پکڑے جاؤ گے"

"اور کوئی راستہ بھی تو نہیں" — جمیل نے ایسی آواز میں کہا جس میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ فتح کا تاثر غالب تھا۔

"اسی طرف چلو" — ساجی نے کہا۔ "جس طرف سے تم آ رہے تھے۔ میں اس راہ سے واقف ہوں ٹیلہ سے گاؤں دور نہیں۔ راستہ مشکل ہے لیکن قریب یہی ہے۔ ہمیں کوئی دیکھ بھی نہیں سکے گا"

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا جمیل نے رکاب میں پاؤں رکھا اور ساجی کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس نے ایڑ لگائی اور گھوڑی بھگاتا اسی وادی میں پہنچا کچا جہاں سے وہ کار دار سے تعاقب میں جا لگا تھا۔ گھوڑی بہت تھک گئی تھی جمیل نے اسے اپنی مرضی سے چلنے کے لیے باگ اس کی گردن پر پھینک دی اور دونوں بازو ساجی کے گرد لپیٹ کر اس کی پیٹھ اپنے سینے سے لگالی۔ جمیل کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور چہرہ ایک دو گھونسوں سے متورم ہو رہا تھا۔

ساجی نے سر جمیل کے کندھے پر پھینک دیا اور گھوڑی یوں اپنی چال چلنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

جمیل کو اطمینان تھا کہ اسے کسی نے کار دار کو مارتے اور نیچے گراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسے دیکھ لیا گیا تھا یہ وہ پتھر جو سکوڑ پر مری کی طرف سے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے کار دار اور جمیل کی خونریز لڑائی کا منظر دیکھ کر سکوڑ دور کیا تھا۔ انہیں تو جمیل دیکھ سکا تھا نہ ساجی۔ وہ دونوں ان نوجوانوں میں سے تھے جو چوکوں، فٹ پاتھوں اور تفریح گاہوں میں لڑکیوں کو چھیڑنے اور ان پر آوازے کسنے کو زندگی کا عزیز ترین مقصد سمجھتے ہیں اور مال باپ کی کمائی پر گرمیوں میں سال، رہ ڈھور ڈنگروں کو چلانا حرام کیے رکھتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں کسی انسان کا ڈر نہیں اور جیسے وہ پولیس بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور جیسے وہ اپنے وقت کے سرکولیس اور جولیس سیزر ہیں۔

ان دونوں نے کار دار اور جمیل کو گھونسوں سے ایک دوسرے کی ناک اور منہ سے خون بہاتے دیکھا تو ان کا سکوڑ جو ہی رک گیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا جو ان میں ایک شہری ہے اور دوسرا شکل و قبیلہ والا دیہاتی سا آدمی۔ ہو سکتا ہے ان کی نظریں اور لڑیچر اور اس شہری کی مدد کو پہنچنا چاہیے لیکن سکوڑ والے دونوں نوجوانوں نے کچھ بھی نہ سوچا۔ وہ دونوں ان کے دل میں ہی جم گیا اور ان کی مردانگی عقر عقر کا پہنچنے لگی جب جمیل نے کار دار کو کھائی میں لڑھکایا تو نوجوانوں نے سکوڑ کو یا وہ ادھر ہی سے آتے تھے اسی سمت غائب ہو گئے۔

مال پر پہنچ کر انہوں نے اپنے دوستوں سے بات کی تو ان کی زبان بکلا ہی تھی۔ ساٹھ ہی ڈیوٹی کانسٹیبل کھڑا ہوا تھا۔ وہ ان کے قریب ہوا اور ان سے ساری بات از سر نو سنی۔ اگر یہ لڑکے یہ نہ کہتے کہ پاس ہی سرخ رنگ کی کار کھڑی تھی اور جب اس دیہاتی نے کہا تھا کہ اس کی کار کا مالک معلوم ہوتا تھا تو کانسٹیبل کوئی دل چسپی نہ لیتا۔ میں کار دار تھیں ہی کتنی۔ کار دار کی لال رنگ کی سپورٹس کار سے تو ہر کوئی واقف تھا۔ ڈیوٹی کانسٹیبل بھی اس کار کو جانتا تھا۔ دونوں لڑکوں کو تھانے لے گیا۔ حال انہیں تمام واردات ایک بار پھر سنائی پڑی۔ ان سے اسے کار کے رنگ اور ماڈل کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ سڑک کے کنارے لال رنگ کی سپورٹس کار کھڑی تھی لیکن وہ نمبر نہیں دیکھ سکے تھے۔

انسپکٹر خالد تھانے میں نہیں تھا۔ وہ نیلوفر کے ہاں چلا گیا تھا۔ اسے نیلوفر کے ساتھ اس جگہ تک جانا تھا جہاں سے اس نے گولی چلائی تھی۔ سب ڈیٹا کانسٹیبل لڑکوں سے بیان لے رہا تھا لیکن اس کے انداز میں کوئی تیزی پن نہ تھا۔ نہ وہ کہیں دور بیٹھ کر بے پروا وہ نظر آتا تھا۔ اس کے احساب پر آفتاب کا قفل سوار تھا لیکن اس نے کار کے رنگ اور ماڈل کے متعلق سنا ہو چونکا۔ اسے معلوم تھا کہ مری میں اس وقت صرف ایک سپورٹس کار ہے جو کار دار کی ہے اور اس کا رنگ لال ہے اور اس

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے اس وارداتِ کو آفتاب کے قتل اور ڈاکے کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھا اور اس نے لڑکوں پر سوالات کی بو
کر دی۔

انسپکٹر خالد نیلوفر کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ نیلوفر کو ساتھ لے کر چلنے والا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ نیلوفر نے
اٹھایا، اور بولی ــــ جی یہیں ہیں ــــ اور ریسیور انسپکٹر خالد کو دے دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل بول رہا تھا۔ اس نے خالد کو تا
سنائی۔

"ان دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر مس نیلوفر کی کوٹھی پہنچ جاؤ" ــــ انسپکٹر خالد نے کہا ــــ "بہت جلدی پہنچ
ریسیور رکھ کر اس نے کار دار کی کوٹھی کا نمبر ملایا۔ "ادھر کار دار بول رہا تھا۔ خالد نے کار دار کے متعلق پوچھا
نے بتایا کہ صاحب بہت دیر ہوئی گاڑی لے کے نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ ابھی واپس نہیں آئے۔

تھانے والوں کے ہاں ٹرانسپورٹ کہاں۔ موقعہ واردات پر چلتے ہی پہنچا تھا۔ بات سر پر آئی تھی۔ ہیڈ کانسٹ
خیال آگیا کہ یونین کونسل کے چیئرمین کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ وہ بھاگتا ہوا نور بازار پہنچا۔ اسے چیئرمین مل ہی گیا
نے اپنا موٹر سائیکل دے دیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر انسپکٹر خالد، ہیڈ کانسٹیبل اور دونوں لڑکے موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ کار دار کی کار
تھی۔ لڑکوں نے وہ تفصیلات پھر سے سنائیں جن کے وہ عینی شاہد تھے اور انہیں وہ جگہ دکھائی جہاں سے
گرا تھا۔

جنگلے کا سہارا لے کر انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل نے جھانک کر دیکھا۔ وہاں سے نیچے اترنا آسان نہ تھا۔ ڈھلان
عمودی تھی اور گھنی جھاڑیوں اور درختوں میں ڈھکی ہوئی۔ ادھر میراثی بھیل چلا جاتا۔ پولیس والوں نے وہیں کھڑے کھڑے
کے گرد پیش کا جائزہ لیا اور درختوں سے جھانک جھانک کر نیچے کسی کسی طرف سے بھی جلدی نیچے پہنچنا ممکن نہ تھا۔

"اب کدھر چلا ہوگا" ــــ انسپکٹر خالد نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔

"ہو سکتا ہے کسی درخت کے ساتھ ٹکرا جانا ہی ٹانگ کر بے ہوش پڑا ہو" ــــ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"گر کر مرنے کا امکان کم ہے" ــــ ایک کانسٹیبل بولا ــــ "معلوم نہیں گرنے سے پہلے اسے کتنے شدید
آئے تھے۔ زخموں سے مر رہا ہو"

"اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا" ــــ ایک لڑکے نے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ گرنے سے پہلے بے ہوش ہو چکا تھا" ــــ دوسرے لڑکے نے کہا۔

"زندہ ہے یا مردہ۔ نیچے اتر نا ہی پڑے گا" ــــ انسپکٹر خالد نے کہا ــــ "کہ بدبخت دیہاتی مر جائے تو سر
جھنجھٹ سے بچ جاتے" ــــ اس نے لڑکوں سے پوچھا ــــ "تم نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ گرانے والا کوئی دیہاتی
"جی ہاں دیہاتی" ــــ ایک نوجوان نے جواب دیا ــــ "اور اب یاد آیا۔ ایک کالا کلوٹا بھی قریب کھڑا تھا"
"اس دیہاتی کا حلیہ کیسا تھا؟

نوجوان تھا اور بڑی اچھی شکل و صورت کا تھا" ــــ لڑکے نے جواب
سے تمہارے سامنے لایا جائے تو اسے پہچان لو گے؟
دور سے دیکھا تھا" ــــ ایک لڑکے نے جواب دیا ــــ "شاید پہچان لیں گے۔
رات معمولی نہیں" ــــ انسپکٹر خالد نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے کوئی نیا ڈرامہ رمی میں آگیا ہے
ستہ وش بھی نکالنی پڑے گی"

تھانے سے چند آدمی، رسے اور بازیں لگوائی گئیں۔ رسے جنگلے سے باندھ کر آدمی نیچے اتارے گئے۔ ا
ن بازیں تھیں۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے تحت الثریٰ میں اترنے جا رہے ہوں۔ ان کے کپڑے پھٹے
ہوئے، خون پہ خواہشیں آیں بھیگی ہوئی جھاڑیوں نے انہیں نہلا دیا اور ان کے کندھے اپنا ہی بوجھ اٹھا اٹھا کے
تھے۔

ندھوں کو رشتی میں نہیں اٹھوا رہے بڑے ایک درخت میں گٹھڑی سی الجھی نظر آئی۔ جا کے دیکھا، وہ کار دار تھا
ت سوجے ہوئے اور ان پر خون کی تہہ جم گئی تھی قمیض اور پتلون تار تار ہو گئی تھی۔ پیٹھ اور ایک بازو سے خون رس
ہے بے ہوش پڑا تھا اور اس کے جسم پر طرح طرح کے کپڑے سے مکڑے رینگ رہے تھے اور جہاں جہاں خون جم
ن جنگلی چیونٹیوں نے جسم کو رگڑا تھا۔

کار دار کی ٹانگوں اور کمر کے ساتھ دو رسے باندھے گئے۔ رسوں کو جب اوپر کھینچا جا رہا تھا تو آدمی الگ رسوں
ئے ہوئے اسے سہارا دیتے آ رہے تھے تاکہ وہ درختوں کے شنوں یا گھنی جھاڑیوں میں نہ الجھ جائے۔ بڑی ز
ہے اسے اوپر لایا گیا۔ رسوں سے نکلنے والوں کے ہاتھ رسوں سے زخمی ہو گئے تھے۔

کار دار اسی جیسے" ــــ انسپکٹر خالد نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی پھر نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا ــــ "زندہ
کار دار کی کار وہیں کھڑی تھی۔ چابی اس میں لگی ہوئی تھی۔ کار دار اس میں بٹھا دیا گیا۔ کار کی ایک سیٹ تھی۔ کار دار بیہو
ن سے ڈیا میں جا سکتا تھا۔ انسپکٹر خالد شیڈر ٹک پر بیٹھ گیا اور اس نے کار دار کا ڈولتا ہوا سر اپنے کندھے پر ڈال لیا
نے کار چلائی اور ہسپتال جا کر۔

صبح ہی رات ہونے کو آئی تھی۔ ایسے وقت سرکاری ڈاکٹر کسی مریض کے لیے جاگا نہیں کرتے لیکن اسے جگانے
یہ۔ خاص نے اسے بتایا کہ ایک زخمی کو لایا ہوں۔

"کیا ہے اسی وقت لانا تھا؟" ــــ ڈاکٹر نے جھنجھلا کر پوچھا ــــ "صبح لے آتے"

صبح تک شاید زندہ نہ رہے"

"تجھی ہو جاتا؟" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "صبح سرجیٹی کی بجائے میں پوسٹ مارٹم کر دیتا۔ قصہ کیا ہے؟

اسی وقت لانے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ کار دار ہے" ــــ انسپکٹر خالد نے کہا ــــ "لال سپورٹس کار والا کار دار

دوسری وجہ اسے اس وقت لانے کی یہ ہے کہ ...

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"مگر ان کے گھوڑوں کے قتل اور اغوا کی ایک واردات ہو چکی ہے" ڈاکٹر نے انسپکٹر خالد کی بات پر

"جی ہاں!" — انسپکٹر خالد نے کہا "کاروار پر حملہ اسی واردات کی کڑی معلوم ہوتی ہے" خالد نے آواز میں کہا — "اسے اگر مزا ہے تو بڑے شوق سے مر جائے۔ میری خواہش یہ ہے کہ کچھ تاکہ مرے۔ وہ لوگ اوپر والے افسر میری تھانیداری کے لیے مصیبت بن جائیں گے۔ خدا کے لیے اسے کوئی انجکشن دیں۔ منٹ کے لیے ہوش میں آ جائے، پھر چاہے ساری عمر بے ہوش پڑا رہے"

ڈاکٹر اسی وقت اپریشن روم میں چلا گیا۔

نیلو فکر کا اسی وقت اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگتی دوڑتی، چلاتی ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹروں کے لیے وبالِ جان بن گئی۔ لے کر ڈاکٹروں سے فریادیں کر رہی تھی کہ اس کے اہل کو زندہ رکھیں۔

"ڈاکٹر صاحب!" — اس نے روتے ہوئے کہا — "میرے اہل روپوں سے بچ سکتے ہیں تو کتنے ہزار دوں؟"

"ڈاکٹروں نے اسے سمجھایا اور کہا کہ ابھی کوئی بات نہیں صبح تک ہوش میں آ جائیں گے۔

کاروار کو خون دیا گیا۔ انجکشن دیئے گئے اور مرہم پٹیاں کی گئیں، اور رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

کاروار سخت جان آدمی تھا، صبح سویرے ہوش میں آ گیا۔ اس کا جسم کئی جگہوں سے سوجا ہوا تھا۔ انسپکٹر رات ہسپتال کے برآمدے میں ٹہلتا رہا تھا۔ جب بھی نرس یا ڈاکٹر باہر نکلتا وہ بڑھ کر پوچھتا — "ہوش آئی؟ وہ کہہ لینے کی فکر میں تھا۔ صبح جوں ہی اسے اطلاع ملی کہ کاروار ہوش میں آ گیا ہے وہ بھاگ کر اپریشن روم میں گھس گیا ہی تھا۔

"میں مریض سے دو چار باتیں پوچھ سکتا ہوں؟" — انسپکٹر خالد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"آپ ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہیں کر سکتے" — ڈاکٹر نے کہا۔

ایک آدھ لمحہ بھی نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ واردات بہت ہی سنگین ہے" — انسپکٹر خالد نے کہا — "لمحہ قیمتی ہے، ورنہ مجرموں کا تعاقب ناممکن ہو جائے گا"

دونوں نے دیکھا کاروار ہاتھ کے اشارے سے انسپکٹر خالد کو بلا رہا تھا۔ دونوں اس پر جھکے تو انہوں بولتے سنا۔ اس کی آواز بہت دھیمی اور مرتی تھی، بکرا ٹوٹ کر بول رہا تھا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔

"میں اُسے جانتا ہوں..." کاروار خوفناک آوازیں رک رک کر اور سانسوں کو سنبھال سنبھال کر کہہ رہا تھا۔

گاؤں میں رہتا ہے۔ میں سیر کے لیے کابر نکلا تھا۔ واپس آ رہا تھا۔ شام ہو گئی۔ وہ سیاہ رنگ کی گھوڑی پر سوار تھا۔ خورد گھوڑی میری کار کے آگے کر دی۔ میں رک گیا۔ وہ اترا۔ مجھے خود دکھا کر جو کچھ جیب میں ہے میرے حوالے کر دیا اور انجکشن بھی اتار دیا۔ میں کار سے نکلا۔ میں نے لڑنا چاہا۔ میں نے نظر بچا کر اس کی بندوق کا بٹ توڑ دیا اور اس

سنبھلا اور اس کے بعد پھر ہم میں سخت لڑائی ہوئی اور اس نے مجھے کھانی تیں گرا دیا..."

کاروار پر غشی کی طاری ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور کاروار کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ نحیف آواز

تیر پڑی میں رہتا ہے میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے میں شکار کھیلنے جاتا تھا... کالی گھوڑی... خاکی شلوار حلیہ نحیف... سر پرندے کی کلغی ٹوپی... اس کے منہ پر میرے گھونسوں کے نشان ہوں گے۔ وہ... وہ..."

طاری ہو گئی۔

انسپکٹر خالد کو ڈھیر قیمتی اشارے مل گئے تھے۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ کاروار زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ وہ دوڑ مڑ گیا۔

ساجی کے گاؤں کے بڑے بڑھوں کے دل دہل گئے جب ان کے گاؤں میں پولیس داخل ہوئی۔ ان کی لمبی لمبی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ پولیس تھیکڑیاں لیے ان کے گاؤں میں دندناتی آئی تھی۔ منبردار کو خبر ہوئی تو وہ حقہ چھوڑ کا پٹا، بڑھاپے اس کی طرح دوڑا۔ انسپکٹر خالد کے سامنے آ جھکا۔ دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے اور سامانا کر خان جی کو کہ دست بستہ ہو گیا۔ اس کا بیٹا شوتی کی چارپائی اٹھاتے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر آدمی تین چار سرائے۔ گدا بعد نفیس اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ گاؤں کا چوکیدار حقہ اور تمباکو کی تھیلی لیے پہنچ گیا۔

گاؤں کا چپڑاسی باہر آ گیا۔ دامن سے لنبوترہ ٹک۔ بل کھاتی ٹیڑھی میاں نما اونچی نیچی گلیوں میں ایک ہی سرگوشی سنائی دے تی — "گاؤں میں پولیس آئی ہوئی ہے" — اوپر کے مکانوں والوں نے اوپر ہی جھنگے کر لیے۔ کچھ بھاگم بھاگ نیچے نیچے والے اوپر چڑھ گئے۔ بھیس ڈھانپی گلیوں میں پھیلے۔ جوڑے اٹھے اور بھاگے۔

پولیس مسجد کے سامنے کھڑی تھی۔ انسپکٹر خالد نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر اوپر دیکھا۔ اس کی نگاہ جدھر جاتی تھی ہاتھوں پر ماتھے رکھ لیتے تھے۔ بعض ایک دوسرے کے پیچھے ہو گئے۔ عورتوں نے گھونگٹ نکال لیے اور سرٹو ہی طاری ہو گئی۔

مسجد کے سامنے چارپائیاں تو بچھ ہی گئی تھیں۔ منبردار، گاؤں کا چوکیدار، مسجد کا پیش امام، پنشن یافتہ وصولیدار، خالد کے قدموں میں آنکھیں پھاڑے بیٹھے تھے اور اس کی خاموش اور سناٹا خیز نگاہیں ان پر خوف طاری کر رہی تھیں۔

"حکم سرکار!" — منبردار نے سکوت توڑا

"اس گاؤں کا کوئی لڑکا۔ دو چار روز ہوئے کسی شہری کی بندوق سے زخمی ہوا تھا؟" — انسپکٹر خالد نے پوچھا۔

"ہاں خان جی!" — منبردار کا بیٹا بول پڑا — "محرم خان کے بیٹے کو اس روز باندوق چوکی لگی تھی"

"کس جگہ تھا وہ؟"

"سنا ہے کہیں بکریاں چرا رہا تھا۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem

سے گزر رہا تھا اسد اوگے اس کی پوتی کے ہلاک پر شبہ کرنے لگیں لیکن پولیس نے جو الزام لگایا تھا وہی گاؤں کے کی زبان پر تھا۔ پرکاتی پڑا تھا کہ جمیل کے رہزنی کی نیت سے ایک شہری پر حملہ کیا تھا۔ اجو کو بھی شک ہونے لگا ٹھیک ہی ہے اور شاید ساجی بھی جھوٹ بول رہی ہے۔

ساجی پہلے قمری کے فرنگ خلاؤں میں بھٹکتی رہی پھر اس کے سینے میں جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ وہ گھٹنوں پر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دادا الگ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ چہرہ بھی سنجیدہ پڑا تھا۔ دادا پوتی بہت سی باتیں تھے، ایک دوسرے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن وہ ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے جھجک جیسے دونوں ایک ہی جرم میں اکٹھے پکڑے گئے ہوں۔

"دادا!" ساجی یکبارگی پھوٹ پڑی اور عتاب آلود لہجے میں بولی — "میں تھانے جاؤں گی۔ وہ چور نہیں بہرو کی حفاظت کی ہے" — اور وہ رو رو کر ہلکان ہونے لگی۔

"اللہ والی ہے بیٹی!" — دادا نے ضعیف آواز میں کہا۔ "وہ بے گناہ ہے تو اللہ انصاف کرے جانے کی منہ جو۔ ہم غریب گنوار تھانے والوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں تم جوان جہان لڑکی، تھانے والے اپنے ہوتے بیٹا!" — اور اس نے ساجی کے دل میں اس کی کمزوریوں اور اپنی معذوریوں کا احساس بھر دیا۔

جمیل کو موقعہ واردات پر لے جایا گیا۔ انسپکٹر کو سوال کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوئی۔ جمیل خود ہی سنا رہا تھا لیکن انسپکٹر خالد نے جمیل کی کہانی کے اس حصے پر ذرا بھر یقین نہ کیا کہ کار دار ساجی کو در نو اور اس پر جو بازو حملہ کر رہا تھا۔

"سنو دوست!" — انسپکٹر نے جمیل سے کہا — "میں قطعاً احسان مند ہوں کہ تم نے اقبال جرم کر لیا میں کار دار کے خلاف کوئی الزام سننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ایک معزز آدمی ہے۔ اسے تم بھی جانتے ہو جانتے ہو۔"

"میں جھوٹ تو نہیں بول رہا خان جی!"

"تم جھوٹ بول رہے ہو" — انسپکٹر نے کہا — "جس گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہے وہ کسی سے کرتے ہی الزام لگایا کرتے ہیں کہ اس نے ہماری بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہے یا چھیڑ خانی کی ہے۔"

"آپ اس لڑکی سے پوچھ لیں خان جی!"

"اوں ہوں! میں نہیں پوچھوں گا" — انسپکٹر خالد نے کہا — "میں بس رس سے پولیس میں ہوں، بات تم لے سنائی ہے وہ دو ہزار بار پہلے بھی سن چکا ہوں۔ کوئی اور بہانہ تراشو ایسا تراش نہ سکو گے تو لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خنجر کہاں ہے؟"

"آپ نے سارے گھر کی تلاشی لی ہے خان جی!"

"مگر خنجر برآمد نہیں ہوا!"

"میرے پاس خنجر کہاں خان جی!"

"دیکھو جمیل!" — انسپکٹر نے تحمل سے کہا — "تم اقرار کر لو سب کچھ بتا دو گے۔ ہم سب کچھ اگلوا لیں گے۔ کیوں نہیں سیدھے ہاتھوں بتا دیتے۔ سوچ لو جمیل سمجھ بتا دو گے تو میں مقدمے کو ذرا ڈھیلا کر کے سزا میں رعایت کرا دوں گا۔ اگر اسے ساتھیوں کو پکڑوا دو گے تو قرآن کی قسم لے لو تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا دوں گا، ورنہ ایسا نتیجہ میں بھگتو گے۔"

انسپکٹر بولتے بولتے چپ ہو گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے جمیل کو دیکھنے لگا کیونکہ جمیل اس کی بات سنتے سنتے ہنس پڑا تھا جیسے انسپکٹر اسے لطیفہ سنا رہا ہو۔

"چلیے ملک صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل بول پڑا — "کل بتا دے گا اور ان لڑکوں کو بھی چھٹی دیں۔ بے چارے تھک گئے ہیں۔"

سکڑوا لے لڑکوں نے انسپکٹر خالد کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔ وہ مری کی سیر کو آئے تھے مگر گل سے پولیس کے ساتھ گھسٹتے پھر رہے تھے۔

انسپکٹر خالد ہنس پڑا۔ بولا — "بڑے اچھے لڑکے ہیں۔ چلو انہیں جانے دو۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی ہے۔"

اور وہ موقعہ واردات سے تھانے کو چل پڑے۔

نیلوفر نے دن بھر انسپکٹر خالد کا انتظار کیا تین چار بار تھانے میں فون کیا لیکن ہر بار جواب ملا کہ تفتیش کے لیے باہر گئے ہیں۔ شام ہونے کو آئی تھی جب وہ انکل کار دار کو دیکھ کر ہسپتال سے واپس آ رہی تھی۔ کار دار کی حالت سدھر رہی تھی ہیں سے نیلوفر سکون میں تھی۔ واپس آتے وہ تھانے چلی گئی۔ اس وقت بھی وہی جواب ملا کہ کلک ابھی آئے نہیں۔ شاید تھوڑی دیر تک آ جائیں۔

وہ انسپکٹر خالد کے کمرے میں بیٹھ گئی اور اس کی میز سے ایک اردو اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ آندھی منٹ بعد کار دار کے متعلق خبر چھپی تھی۔ جس کی سرخی تھی — "مری میں جرائم کی رفتار بڑھ گئی" — اور کار دار کسی "معلوم شخص" کے حملے کی تفتیش کے سلسلے "آفتاب" کے ہاتھوں قتل کی خبر دوسرا پا گیا تھا۔

"ہیلو مسز آفتاب!" — انسپکٹر خالد کی آواز کمرے میں گونجی۔ اس کی آواز میں فاتحانہ شان تھی — "مصنفہ جاننا ہوں میں دھوکہ کر کے غائب ہو گیا لیکن بھئے غائب ہی ہو جانا چاہیے تھا" — کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا — "مسٹر کار کیسے ہیں؟"

"پہلے سے بہتر ہیں!"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کوہ قتل ہو چکے ہیں۔ ان لے جوان اور لڑکے جو جنگل میں بکھرے بیٹھے ہیں، صاف گواہی دے رہے ہیں۔۔۔ میں مسٹر آفتاب کو تو واپس نہیں لا سکتا، ان کے قاتل کو لے آیا ہوں۔"

نیلوفر کے آنسو بہنے لگے۔ اسی کیفیت میں وہ اٹھ کر چل پڑی۔

"مسٹر آفتاب!"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے اس سے کہا۔۔۔ "آپ کی کوٹھی پر پہرے کا انتظام کافی ہے، پھر بھی ہوشیار اور محتاط رہیں۔ اپنے نوکروں کا خبردار رکھیں۔"

نیلوفر نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ انسپکٹر خالد نے انگوٹھی کے شیشے کے ساتھ ایک بار پھر آنکھ لگائی۔ نیلوفر کی تصویر بہت پیاری تھی۔ انگوٹھی آنکھ سے ہٹا کر سوچنے لگا۔۔۔ "کیا یہ قرم اناڑی ہے کہ چوری کا مال انگوٹھی والے دوسری واردات کر کے مل پایا تھا؟ اس نے انگوٹھی چھپائی کیوں نہیں؟ اسے جب گھر سے موقعہ واردات لے جایا گیا تھا تو وہ نظر بچا کر انگوٹھی راستے میں پھینک سکتا تھا۔۔۔ کیا یہ دلیر ہے؟ اگر دلیر ہے تو اکیلا نہیں ہو سکتا"۔۔۔ انسپکٹر خالد سوچ سوچ کر تھک گیا۔ اسے رات کو جمیل سے پوچھ گچھ کرنی تھی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ بارش ابھی ابھی تھمی تھی۔ سرمئی گیلی گپ اندھیری رات میں نمی نالوں اور جھونپڑوں نے سنگلاخ پہاڑوں کے ٹکڑے جو جنگل کے وادیوں میں اتر آئے تھے، انہیں چپل کے پیڑ سال کی لوریاں دے کے سلا رہے تھے۔ بارش تھمتے ہی گیدڑ شہر کے قریب آ کر چلانے لگے تھے۔

جمیل حوالات کے فرش پر بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ قانون پیلیج بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، اور وہ چیلنج قبول کر چکا تھا۔ ساجی کی آبرو والے پہاڑوں سے ٹکرانے پر آمادہ کیے بیٹھی تھی۔ اس نے سوچا کہ ساجی کو تھانے بلا کر کہلوا دے کہ یہ انگوٹھی اس نے کہاں سے عزیزی تھی لیکن ساجی کو تھانے چڑھانے کے خیال پر چونک اٹھا اور سوچا جانے اصل بات کیا ہے اور نہ جانے ساجی پر کیا بیتے۔

وہ سوچ سوچ کے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ قانون کے نقیب (وفرازسے تو آگاہ نہ تھا) ان پڑھ پہاڑی آدمی تھا، نہ ہی ان راہوں سے واقف تھا جن پر اسے پولیس لے جانے والی تھی۔ وہ اسی قدر جانتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے، اور اس کی گرفتاری سراسر ظلم ہے اور یہی خدا سے یوں قید کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

حوالات میں وہ اکیلا تھا۔ حلاطوں والا دروازہ مقفل اور اس کے سامنے سنتری کھڑا تھا۔ جمیل کی آزاد فضا کی بھینی بھینی بو جمیل کو مشتعل کرنے لگی اور اس کی ذہنی حالت اس بازی کی سی ہونے لگی جسے فضول ہی بلنٹ سے پکڑ کر تنگ سے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اس نے سر اٹھا کر حوالات کے دروازے کو دیکھا اور نظروں میں لوہے کی سلاخوں کی مضبوطی کا اندازہ لیا۔ پھر گھٹنوں پر لپٹے ہوئے اپنے بازوؤں کو یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ بازو مضبوط ہیں یا لوہے کی سلاخیں۔

انسپکٹر خالد دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور سلاخوں سے اندر جھانکا۔ سنتری بھاگ کے گیا۔ جمیل کا ا

ماکھوں دیا۔ خالد حوالات کے کمرے میں گیا۔ اس کے ہاتھ میں شاہ بلوط ڈنڈا تھا۔ سنتری نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور راتھل کا سہارا لے کر تماشہ دیکھنے لگا۔

"دیکھو دوست!"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے ڈنڈے کا سرا جمیل کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "اس حوالات میں تمہارے اقارب آئے ہیں اور ایک ساتھی بات میں اقبال جرم کر گئے ہیں، تم تو کچھ بھی نہیں؟"

"تھانیدار جی!"۔۔۔ جمیل نے پوچھا۔۔۔ "آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ مجھے بھی سمجھا دو!"

"صرف اتنا بتا دو یہ انگوٹھی کہاں سے آئی ہے؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا۔"

"پھر بتا دو آفتاب کی لاش کہاں ہے اور مال کہاں ہے؟"

"کون آفتاب؟ کیسا مال؟"

"سنو جمیل خان"۔۔۔ خالد نے دوستانہ لہجے میں کہا۔۔۔ "تم سیدھے چالیس کے تھپڑ کھا رہے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں قسم کھاتا ہوں، لکھ کے دیتا ہوں کہ اپنے سارے بھائی بندوں کے نام بتا دو تو تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا کر معافی دلا دوں گا۔ یہ میرے ہاتھ میں ہے۔ تم انتہا بدی کر رہے ہو۔ اب دنیا کی طاقتیں تمہیں نہیں بچا سکتیں۔ تمہیں بتانا ہو گے اور تصویح کرنا ہو گی۔ تمہارا وہاں ہو جانے کا گلا میرے پاؤں میں لیٹ لیٹ کر بتانے رہو گے مگر میں سنوں گا نہیں۔"

انسپکٹر خالد بول رہا تھا۔ اسے اپنے کمرے سے ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ ایک کانسٹیبل نے آ کے بتایا۔۔۔ "ایڈیشنل ہیڈ کوارٹر سے کال ہے۔"

انسپکٹر خالد دروازے کی طرف چلا تو سنتری نے دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر خالد دروازے سے نکل گیا تو جمیل نے ٹیڑھے بیٹھے اُسے نکلتے دیکھا اور دوسرے ثانیے وہ بجلی کی طرح اٹھا اور دو چھلانگیں لگا کر سنتری کی جانب طرح دروازے کو دھکا دیا۔ سنتری دروازہ بند کر رہا تھا۔ وہ اس اچانک دھکے سے کئی قدم دور جا پڑا۔ اور جمیل برآمدے میں گم ہو گیا۔

سنتری نے اٹھتے اٹھتے پھر پیٹھوں کا سہارا زور لگایا اور بھگاتے ہوئے چلایا۔۔۔ "بھاگ گیا۔۔۔ ملک صاحب! کمرے سے بھاگ گیا۔۔۔ نکل گیا۔۔۔ ملزم نکل گیا۔"

انسپکٹر خالد پنڈی کی کال سنے بغیر باہر کو دوڑا۔ اس کے ساتھ تین چار کانسٹیبل بھی دوڑے اور سیٹیاں بجا اٹھیں۔ بلاک میں ساری گارد جاگ اٹھی۔ سپاہی بے کسی کی حالت میں تھے، باہر نکل آتے کرسی لے دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ کوا تیکر میں تھا اور ایک ایسا بے طرح بھاگا کہ مڑ کے گر پڑتی چادری کھل گئی مگر وہ چادر کنڈے پر پھینک کر ملزم کے تعاقب میں بھاگ گیا۔ سپاہیوں نے سن لیا تھا کہ ڈاکو اور قتل کا ملزم بھاگ گیا ہے۔

انسپکٹر خالد تین چار سپاہیوں کے ساتھ تھانے سے ذرا دور جا کے رکا اور سب بھاگتے قدموں کی آوازیں یا

www.paksociety.com

اسی بارہ سپاہی کودتے پھلانگتے۔ پھسلتے، گرتے سنبھلتے تحصیل بلڈنگ تک پہنچ گئے اور مختلف سمتوں کو پھیل گئے۔ اوپر ابھی کچھ ہوا تھا جسے کھلاڑی نے اور زیادہ سیاہ کر رکھا تھا۔ سب سے بڑی شمل موسلا دھار بارش نے پیدا کر دی جو رک گئی تھی مگر ذرا سی دیر پہلے پھر شروع ہو گئی تھی۔ یہ سالوں کی بارش تھی جس کے پیچھے سپاہیوں کو اندھا کر رکھا تھا۔ اور جہاں کہیں مدھم سا جب روشن تھا وہ بارش سے اور زیادہ مدھم ہو گیا تھا۔

جمیل نور بازار میں بھاگ رہا تھا۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں اور بازار تاریک۔ تاریک بند دکانوں کے عقب میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اگر کوئی جاگ بھی رہا تھا تو اسے چھت پر بارش کی بوچھاڑ کے سوا باہر کی کوئی اور آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ جمیل بازار کی پوٹھاری چڑھ رہا تھا۔ اس نے کھوم کے دیکھا۔ نیچے جسے اسے دو تنے قدموں اور سپاہیوں کی اتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

جمیل کو اور دیکھا کہ سامنے کھمبے کے ساتھ جب روشن تھا۔ دائیں طرف ایک تنگ گلی تھی۔ جمیل اسی میں چلا گیا۔ آگے ساتھ آٹھ سیڑھیاں تھیں جو اس نے دو چھلانگوں میں چڑھ لیں۔ سیڑھیاں ختم نہیں ہوئیں تو گلی بائیں طرف مڑ گئی۔ یہ گلی قدرے فراخ تھی لیکن آگے سے بند تھی۔ آگے ایک مکان کا پچھواڑا تھا جمیل پیچھے مڑا لیکن گلی کی نکڑ پر سیڑھیاں اترنے لگا تو نیچے گلی کے سرے پر اسے چار آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ خود اندھیرے میں تھا اور سپاہی وہ۔ کے جب کی مدھم مدھم روشنی میں تھے۔ جمیل نکڑ کے ساتھ چھپ گیا۔

"بھئی میں نے خود اس گلی میں جاتے دیکھا ہے۔" ایک سپاہی کہہ رہا تھا۔

"پگلا تو نہیں جو اس گلی میں آئے گا۔" دوسرے نے کہا۔ "اندھے بھی جانتے ہیں کہ گلی بند ہے۔ وہ تو ناٹی کیت ہے۔"

"دیکھو جی وکیا ہرج ہے!"

"تم سب یہیں رکو۔" ایک نے کہا۔ "میں دیکھ آتا ہوں۔"

جمیل سن رہا تھا۔ ایک ادھر مڑ کر سپاہی گلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا اور باقی وہیں کے رہے۔ جب کانسٹیبل نکڑ پر پہنچا تو جمیل نے نکڑ کی اوٹ سے کانسٹیبل کے پیچھے ہو کر ایک بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور بازو کا گھیرا گردن کے گرد پھندے کی طرح اس قدر تنگ کر دیا کہ کانسٹیبل کی آواز تو نکل ہی نہ سکتی تھی۔ سانس بھی گھٹ گئی۔ آنکھیں ابل کے باہر آ گئیں۔ وہ زبح ہوتے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔ جمیل نے بازو کا شکنجہ اور زیادہ کھڑا تو سپاہی کے حلق سے خوف کی گھٹی گھٹی آوازیں نکلیں اور اس کی ٹانگیں بیجان کی مرغیہ کر ساکن ہو گئیں۔ جمیل نے بازو کا گھیرا ڈھیلا کیا۔

"میرے ہاتھ میں چاقو ہے۔" جمیل نے سرگوشی کی۔ "زندگی چاہتے ہو تو زور سے کہو۔ آگے بھاگو۔ گلی خالی۔" کانسٹیبل کا دم اکھڑ گیا تھا اور وہ جمیل کے ہاتھ میں بے بس تھا۔ جمیل نے اس کی پیٹھ اپنے سینے سے لگا رکھی تھی۔ ایک بازو گردن کے گرد اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ایک بازو کلائی سے جکڑ رکھا تھا۔

"ارے مر تو نہیں گئے تو رہ دا؟" ۔۔۔ سپاہی کے ساتھیوں نے اسے آواز دی۔

جمیل نے ایک بار پھر اس کی گردن کے گرد اپنا بازو کس دیا۔ سپاہی ایک بار پھر دم گھٹنے سے تڑپا اور اس نے جمیل کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ مگر ہاتھ نیچے گر پڑا۔

"لو جو میں نے کہا تھا۔" جمیل نے کہا۔ "اب کے نہیں چھوڑوں گا۔" اور اس نے گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔

"گلی خالی ہے بھائیو۔۔۔ آگے چلو۔" سپاہی نے بلند آواز سے کہا۔

جمیل نے نکڑ سے جھانکا۔ وہ لوگ گلی کے نمونہ سے غائب ہو چکے تھے۔ جمیل نے کانسٹیبل سے کہا۔ "اگر میرے پیچھے آنے تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ بیٹھے جاؤ۔"

کانسٹیبل بیٹھ رہا تھا کہ جمیل کو کہر سات آٹھ سیڑھیاں اتر کر رک کے دیکھا۔ اسے دو تین چار آدمی جاتے دکھائی دیتے۔ جمیل دوسری طرف بھاگا۔ اطاعت کانسٹیبل کو وہ بے لبس کر کے گلی میں چھوڑ آیا تھا وہ بازار میں آگیا اور بڑی زور سے چلایا۔ "اس طرف۔ اس طرف۔ وہ گیا۔"

جمیل لوئر بازار سے نکل گیا اور آگے جاتے سپاہی ٹوٹ آئے۔ بارش اور تیز ہو گئی۔ پانی نالیوں سے بازار میں بہ گیا تھا اور بہت تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ پاؤں سے اڑتے چھینٹے اور بارش کی تیز بوچھاڑ بھا گنے دیتی تھی اور نہ کچھ نظر آتا تھا۔

جمیل ایک بازار پر تحصیل بلڈنگ کے قرب و جوار میں تھا۔ وہ شہر سے باہر نکلنا چاہتا تھا مگر راہوں سے واقف نہ تھا کسی تنگ گلی میں گھسنے سے بھی گھبراتا تھا۔ گھیرے میں آجانے کا بھی خطرہ تھا۔ بارش اور اندھیرے نے اسے بے بس کر رکھا تھا لیکن وہ بارش اور اندھیرے سے ہی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ ادھر اُدھر بھاگا اور ایک بند دکان کے تختے نے مکس گیا۔ بارش کا پانی تختے سے سیلابی پانی کی طرح بہا جا رہا تھا اور جمیل اس پانی میں اکڑوں بیٹھ گیا۔ پانی تڑپ تڑپ نالیوں سے جمیل کو رتام اور پر بہ رہا تھا جب تیز نالی پر بیٹھ گیا تو پانی اور زیادہ پھیل گیا۔

کوئی بھاگتے قدم اس کے سر پر آ گئے۔ اس میں اور ان قدموں میں ایک ہی قدم کا فاصلہ تھا۔

"تحصیل روڈ پر گلی کا بند ہے۔" ۔۔۔ ایک نے کہا۔

"پھر کہاں جائے گا۔" ۔۔۔ دوسرے نے کہا۔ "وہ آدمی اُدھر پہنچ گئے ہیں۔"

"سالی بارش تھم جاتے تو۔۔۔"

"ارے چھوڑو کلیجہ کو وہ قدم دو بھاگنے دیتے۔"

"نیچے دیکھو کیا ہے؟"

"اوپر کے سارے راستے بند کر دیتے گئے ہیں۔"

"ٹھک صاحب پتہ نہیں کدھر نکل گئے ہیں۔"

"وہ ناکہ بندی کر رہے ہیں۔" ۔۔۔ ایک نے کہا۔ "آدمی ساتھ نے گئے ہیں۔"

جمیل یہ باتیں بڑی غور سے سن رہا تھا اور وہ راستے ذہن نشین کر رہا تھا جو بند ہو چکے تھے۔ وہ پانی کے تیز بہاؤ میں بیٹھا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھا اور پانی اس سے ٹکرا کر اس کے سر کے اُوپر سے گذر رہا تھا۔ پانی یخ تھا، جسم بھی یخ ہونے لگا اور پانی کا بہاؤ اس کے پاؤں اکھاڑنے لگا۔ جھیل کو محسوس ہونے لگا کہ وہ چند منٹ تک وہیں بیٹھا رہا تو وہ اکڑ کر مر جائے گا۔

الیکزنڈر خالد آ پہنچا۔

"ملک صاحب!" ــــ ایک سپاہی نے کہا ــــ "یہ علاقہ ہم نے دیکھ لیا ہے"

"وہ پیر پانی میں جاتے گا" ــــ الیکزنڈر خالد نے کہا ــــ "لیکن پہنچ نہیں سکے گا۔ نیچے پانی بہت تیز ہے، اندھیرا ہے اور بارش تیز ہے.... تم پھیل جاؤ۔ اکٹھے مت بھاگو.... جہاں خان اور ڈاکٹر خالد کے برآمدے میں چلے جاؤ.... کرنا تھا بگی، ڈوڑ پر چلا گی ہے۔ اپر اور نور بھیکے گی، روڈیں نے بند کر دائیں۔ وہ ابھی شہر سے نکلا نہیں.... شدا بارش رکی نے تو دیکھوں عرام زادہ جاتا کدھاں ہے"

وہ بکھر گئے اور الیکزنڈر خالد بھی چلا گیا۔ جھیل تختے کے نیچے سے رینگ کر نکلا۔ اسے اب بارش اور سیلابی پانی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ یخ بستہ پانی نے اس کے جوڑ جوڑ کو منجمد کر دیا ہے اور وہ شاید چل بھی نہیں سکے گا۔ لیکن اسے چلنا تھا، بھاگنا تھا اور راہ فرار تلاش کرنی تھی ورنہ وہ جانتا تھا کہ کس موت مرے گا۔

وہ کارٹروں کی اوٹ میں بستیوں سے بچتا، کہیں رینگتا، کہیں بیٹھتا، کہیں بھاگتا کہیں گھٹنے گھٹنے پانی میں چلتا اور جھکیکہ گلی روڈ تک پہنچ گیا۔ وہ سڑک کے کنارے پہاڑی کے دامن میں کھڑا تھا اور پہاڑی گھنے جنگل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بارش کا زور ابھی تھما نہیں تھا۔

سری کا شہر گہری نیند سو رہا تھا لیکن سڑکوں پر بیداری کے آثار تھے جن سے جھیل پوری طرح چوکس تھا۔ گاؤں جانے کی تو اس نے سوچی ہی نہ تھی۔ اس نے سپاہیوں کی باتیں سن لی تھیں جن سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ تمام راستے بند کیے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے اب ایک ہی راہ تھی ــــ پہاڑی جنگل!

وہ پہاڑی پر چڑھنے لگا لیکن پاؤں اوپر رکھا تو پھسل کر نیچے آ گیا۔ اس نے ایک درخت کا تنا تھاما۔ وہ سر سے ہاتھ سے ایک جھاڑی پکڑی اور دو قدم اوپر چڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیل تھی، پاؤں ایک پتھر پر جما تے اور اوپر چڑھنے لگا۔ وہ اب گھپ اندھیرے میں تھا لیکن اُلجھی ہوئی بیلیں اور تیز بارش اسے اوپر چڑھنے نہیں دے رہی تھیں پھسل پڑتے نزدیکی تھی۔ جھاڑیاں بوجھ سہارنے سے بیزار تھیں اور درختوں کے تنوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ ہاتھ پھسل پھسل جاتے تھے لیکن ہمت ایک راہ تھی۔ وہ ایک ایک انچ، ایک ایک قدم اوپر ہی اوپر چڑھتا گیا۔

اسے اب جنگل کی ہیبت ناک شان شان اور موسلا دھار بارش کی نیز بنگا سر بوچھاڑوں کے سوا دنیا کی کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ رینگ بھی رہا تھا، گھٹنوں کے بل، پیڑوں کے تنوں اور جھاڑ بیل کے سہارے سرکتا بھی رہا تھا۔ اس کی کہنیاں ٹخنے اور گھٹنے کانٹوں اور نوکیلے پتھروں نے چھیل دیئے تھے۔ جسم تو پہلے ہی سوجا ہوا تھا لیکن اس کا جسم ٹھنڈی یخ بارش سے سُن ہو چکا تھا۔ اور درد کے احساس سے بے نیاز تھا۔ وہ جنگل کی اوٹ میں سرجاندار سے دُور نے

سوا کے بے حد تند تھپیڑے نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ پہاڑی کی چوٹی پر جا لگا ہو! ہر اندھیرا دیکھا، پھر نیچے دیکھا۔ دور، بہت دور بتی جل رہی تھی۔ وہ نیچے اترنے لگا لیکن اترنا چڑھنے سے کہیں زیادہ دشوار اور ہوتا تھا۔

دور دھکا "نیچے آ گیا" اور اپنے آپ کو سڑک کے کنارے پایا۔ سڑک کے پار ڈھلان تھی یا کھائی وہ خطرہ مول لے بیٹھا تھوڑی میں سڑک عبور کر گیا اور نیچے پھسلنے لگا۔ یہ ڈھلان دور نیچے جاتی تھی لیکن جنگل گھنا نہیں تھا۔ چلنے کو راستہ کھلا تھا کہیں کہیں جگہ ہموار تھی جہاں وہ دنیا کی ذرا رک کر دم لے لیتا تھا۔ وہ پہاڑی دنیا میں جنا پڑا تھا، پہاڑیاں اترنا چڑھنا نہ تھا لیکن اندھیرا، بارش اور زخمی جسم اس پر غشی سی طاری کرنے لگا اور وہ ایک پیڑ کے تنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

*

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اجو دادا اور ساجی دکھیاری سی نیند سوتے ہوئے تھے۔ ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سا
آنکھ کھلی تو اسے وہ رات یاد آگئی جب جمیل نے اس دروازے پر پہلی دستک دی تھی۔ اس رات بھی بارش
رہی تھی۔ آج رات بھی بارش کے ہنگامے میں دروازہ بجنے کی آواز آئی تھی۔

ساجی نے لالٹین جلائی۔ دادا بھی جاگ اٹھا۔ ساجی نے دروازہ کھولا۔

پولیس کے دو کانسٹیبل طوفانی تھپیڑوں کی طرح کواڑ دھکیل کر اندر آگئے اور ایک نے ساجی سے ا
چھین لی۔ دادا پوتی پر سکتہ طاری ہوگیا۔ کانسٹیبل کمرے کی ہر چیز کو اٹھا اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ ٹرنک
کھول کر کپڑے لتے بکھیر دیتے۔ یہاں کچھ نہ ملا تو وہ مویشیوں کے طبیلے میں گھسے۔ کھرلی کو الٹ دیا، گھاس ا
کے گٹھوں کو بکھیرا اور لوٹ کے کمرے میں آگئے۔

"اُسے کہاں چھپا رکھا ہے؟" — ایک کانسٹیبل نے گرج کر پوچھا۔

"کسے؟"

"جمیلے کو۔ وہ حوالات سے بھاگ آیا ہے۔"

اجو دادا وقار رو پڑا اور ہانپتا جھرجھر کر بولا۔ "قرآن کی قسم لے لو جو وہ یہاں آیا ہو..." اور وہ دھاڑیں مار ر
لگا۔ بولا۔ "میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں جمعدار صاحب جی! وہ میرا کچھ نہیں لگتا۔"

ساجی کا خون بہت کھولا لیکن وہ دادا کو دیکھ کر چپ رہی۔ دونوں کانسٹیبل اُسے گھور رہے تھے
ساجی ان نظروں کو خوب سمجھ رہی تھی لیکن پولیس کا خوف اس کی زبان گنگ کیے ہوئے تھا۔

"دیکھ لڑکی!" — ایک سپاہی ساجی سے مخاطب ہوا — "تو جوان لڑکی ہے۔ تھانے میں بڑی
ہوگی۔ اُسے کہیں چھپایا ہے تو بتا دے.... کیوں رسے بڈھے؟" — اس نے اجو سے کہا —
بچی کی عزت کا خیال نہیں سمجھے؟"

"یہ گھر جو، اچھوں کا نیں خان جی!" — ساجی نے کہا — "اُسنے پردیس سمجھ کے رکھ لیا تھا۔ ہمیں کہ
تھا وہ کون ہے؟ وہ کیا ہے؟ جانے؟ سارے گاؤں سے پوچھ لو ہم دادا پوتی کیسے لوگ ہیں۔"

"لیکن ہم خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔" — ایک کانسٹیبل نے کہا۔

"وہ یہاں ہو تو تمہارے ساتھ بھیجیں جمعدار صاحب جی!" — اجو نے زخمی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم
گھر دیکھ لیا ہے۔"

"سے جانگلی!" — دوسرے کانسٹیبل نے جھنجھلا کر کہا — "کمال جنگلوں میں بوڑھے ہوتے رہے
فوجیں اوپر سے آتے ہیں، چائے پانی کے لیے کچھ دے، ورنہ اس لڑکی کو تھانے لے
جائے۔"

اجو البا اناڑی بھی نہیں تھا۔ اس نے کہیں سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر کانسٹیبل کو دیا۔ کانسٹیبل
کے ہاتھ سے نوٹ جھپٹ کر غصے سے کہا۔ "ایک اور نکال۔ دیکھتا نہیں ہم وہ ہیں؟"

دوسرا نوٹ دوسرے کانسٹیبل نے اجو کے ہاتھ سے لے کر کہا۔ "خبردار کسی کو پیسوں کا نہ بتانا۔"

دونوں یہیں طرح طوفان کی طرح آتے تھے، طوفان کی طرح نکل گئے۔ اجو اور ساجی کھلے ہوئے
دروازے دیکھتے رہے جس کے اُس طرف تاریکی اور بارش کا ہنگامہ تھا۔ دادا اور پوتی کے سینوں میں جو ہنگامہ بپا
تھا انہوں نے سینوں میں دبائے رکھا اور دونوں کے آنسو جاری ہو گئے۔

اگلے روز سورج پہاڑوں کی اوٹ سے ابھرا تو گاؤں کی گلیوں میں ایک بار پھر ہنگامہ بپا ہوگیا۔

"پولیس آئی ہے۔"

"پولیس اجو کے گھر کی تلاشی لے رہی ہے۔"

"شہر میں چوری ہوگئی ہے۔"

"مال اجو کے گھر سے نکلا ہے۔"

اجو دادا کے گھر پولیس کیا آئی، قیامت آگئی۔ انسپکٹر خالد اور تین چار کانسٹیبل کو نے کھدرے کی تلاشی لے
رہے تھے۔ مخبر دار بھی ساتھ تھا اور دو کانسٹیبل غیر وردی کے تھے۔ اجو الگ کھڑا اشک آلود آنکھوں کو چڑی کے
سے پونچھ رہا تھا۔ ساجی الگ بیٹھی گھر میں غیروں کی حکمرانی پر کڑھ رہی تھی اور باہر سارا گاؤں ہجوم کیے ہوئے تھا۔

تلاشی سے فارغ ہو کر انسپکٹر خالد نے اپنے آدمیوں کو باہر بھیج دیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کسی مصلحت
پیش نظر اپنے رویے اور لب و لہجے میں ایسی تبدیلی پیدا کر لی جیسے وہ پولیس انسپکٹر تھا ہی نہیں، عام انسان
کے سینے میں اجو اور ساجی کا درد ہو۔ اجو کو بھی ایک خدشہ تھا کہ وہ اس کی بے عزتی نہ کر دے۔ اجو
گاؤں میں بڑے وقار اور خود داری سے عمر گزاری تھی۔

خالد کے انداز میں غیر متوقع تبدیلی دیکھی تو اجو جیوں دلکا پھلکا ہوگیا جیسے اس کے ضعیف سینے پر جو
گرانی تھی کسی نے اتار لی ہو۔ اس نے ساجی کو چائے بنانے کے لیے کہا اور خود انسپکٹر کے سامنے
بیٹھ گیا۔

ساجی چائے بنانے پر آمادہ نظر آتی تھی لیکن انسپکٹر خالد کو گھورتی چولہے پر جا بیٹھی۔ خالد اجو دادا سے پھر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

وہی باتیں پوچھنے لگا وہ پہلے بھی پوچھ چکا تھا لیکن آج اس کے پوچھنے کے انداز میں کل والا تحکمانہ پن اور
پن نہیں تھا۔ اجو سرہات کھل کر بتانے لگا اور جب اجو نے انسپکٹر سے چند باتیں پوچھیں تو وہ گول گول —
جواب دے کر ٹال دینے لگا۔

سامی نے انسپکٹر خالد کے سامنے چھوٹی سی میز رکھی، اس پر کوشیے سے بنا ہوا میز پوش ڈالا اور
پیالی چائے رکھ دی۔ انسپکٹر نے سامی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سامی کے ہونٹ جیسے سل ہی گئے تھے
وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے پہلی بار تھانے دار کو اتنی قریب سے دیکھا تھا اور تھانیداروں کو وہ جتنوں
کے پُراسرار دیس کی مخلوق سمجھا کرتی تھی۔

خالد نے سامی کو دیکھا، سر جھکا لیا اور جانے کیا سوچا کہ وہ آہستہ آہستہ غیر ارادی سے انداز سے اپنی
چائے پیتے پیتے باہر نکل گیا۔

"سنو رانے!" — اس نے باہر آ کر ہوا دار کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "گاؤں میں سب کا خبردار کر دو کسی
جھیلے کو پناہ دینے کی کوشش کی تو وہ سات سال کے لیے جیل میں بند کر دیا جائے گا۔۔۔ سات سال تک
کرسن لو۔ اور جو اسلحہ پکڑوا سکے گا اسے انعام بھی ملے گا اور سرکاری چٹھی بھی۔" — اس نے ہوا دار کو ذمہ داری
کہا۔ "میں تمہارے پاس سی آئی۔ ڈی کے دو آدمی چھوڑ چلا ہوں۔ ان کے متعلق مشورہ کر دو کہ تمہارے حصے

انسپکٹر خالد گاؤں میں سی۔ آئی۔ ڈی اور مخبروں کا جال بچھا رہا تھا اور جمیل کو مری کے گھنے اور پُراسرار
نے کچھ ایسے پیار سے طریقے سے اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا کہ وہ ہر خطرے اور طوفان سے محفوظ ہو گیا
وہ زیادہ دور نہیں چلی تھا۔ مری کے مضافات میں ہی تھا۔ — اسی تنگ سی وادی کے دوسری طرف جہاں
ٹے باری پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی تھی۔

پہاڑی میں ایک کٹاؤ تھا جسے جنگلی بیلوں اور جھاڑیوں نے چھپا رکھا تھا۔ اسی کے اُوپر، ذرا بلندی پر
موٹی ڈالیوں اور چوڑے پتوں والی بیلوں اور طرح طرح کی جھاڑیوں نے گھر رکھا تھا جو ایک فارسی بنا رکھی تھی
انسان نے بادِ باراں سے بچنے کے لیے جانے کتنے دنوں کی محنت اور سمجھ بوجھ سے بنائی ہو۔
گھنی جھاڑ جیل کے پیڑوں کا جھنڈ سایہ کیے ہوئے تھا۔

پولیس تو رات سڑکوں کی ناکہ بندی کرتی رہی تھی، مگر جمیل رات بھر کیڑوں مکوڑوں کی طرح جنگل میں رینگتا
اس کے بازو اور ٹانگیں بری طرح زخمی ہو گئی تھیں، کپڑے پھٹ گئے تھے۔ جو نے جانے کہاں رہ گئے
پاؤں کی نس نس میں چھالوں کی جلن اور چبھن تھی۔ وہ اسی حال میں رینگتا، چلتا، پھسلتا رہا تھا بعض جگہیں ایسی بھی آئیں
جھاڑیاں اور بیلیں سر کے بالوں کی طرح گنجلک ہوتی تھیں جہاں سے سانپ بھی نہ گزرے لیکن جمیل کو ان
گزرنا تھا اور وہ گزر چلا گیا تھا۔ سطح مرتفع جب جھاڑیوں کی اس گنجلک سے پہنچ گیا تھا اور یہیں رک گیا

وہ سڑک کر غار میں چلا گیا۔ غار کا منہ اتنا کھلا سی تھا کہ بیٹھ کر اندر جایا جا سکتا تھا۔ اندر سے غار خاصا فراخ تھا۔
اتنا ہو گیا تھا کہ چند قدم دور تک احوال نظر آنے لگا تھا جمیل نے اپنا جائزہ لیا۔ زخم دیکھے کپڑے دیکھے اور
بے شدت سے محسوس کیا کہ وہ پیاسے اور بھوکا بھی ہے لیکن تھکان اور خوفناک خراشوں نے اسے
بے بس پچھوڑ کر دیا۔ اس نے غار سے باہر آ کر ایک بیل کی ڈالی تھامی اور اس کے پتوں سے بارش اور شبنم
تھوڑے چوس لیے۔ بہت سے پتے چوس چبا کر اس کے ہونٹ نمکا نے آنے لگے۔ اس نے پھٹے جوتے
بیٹھ کے اتار کر غار کے کونے میں رکھ دیے اور لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

انسپکٹر خالد گاؤں سے تھانے پہنچا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ رات بھر جاگا تھا اور صبح جو گھر
قصبے کو چلا گیا تھا۔ تھانے میں آ کر ٹیلیفونوں کی بارش کی۔ دو دی اور بوٹوں سمیت ہی ایک کاٹیل کی
فی پر لیٹ گیا اور سو گیا۔

انسپکٹر کی آنکھ لگی تو جمیل کی آنکھ کھلی۔ چھ سات گھنٹوں کی نیند نے جمیل کا تھکن زدہ زخمی جسم سہلایا تھا باہر
کا سورج چمک رہا تھا لیکن اس کی تپش کو گھنے پیڑوں نے روک رکھا تھا۔ جمیل نے پھٹے ہوئے کپڑے
بیے اور باہر آ کر وہ دیکھنے لگا۔ سورج کے رخ سے اس نے اندازہ کر لیا کہ مری کس طرف
جنگل اور پہاڑیوں کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس کی تلاش میں وہاں تک کوئی نہ پہنچ سکے گا۔ کوئی پہنچ بھی
وسی کے ہاتھ نہ آ سکے گا۔ اس نے جھک اور بیس کی شدت محسوس کی لیکن اس کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہ
وہ جانتا تھا کہ پہاڑی پیڑ پودے کسی کو بھوکا نہیں مرنے دیتے۔

وہ نیچے اتر آیا۔ اس نے خوبانی کے درخت تلاش کر لیے اور نمکی سی آبجو بھی نظر آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ
ں سے پیٹ بھر چکا تھا اور آبجو یا پانی اس کے جسم میں اب حیات کا کام کر رہا تھا۔ وہ کپڑوں سمیت بیٹھ
بیٹھ گیا۔ کپڑے بھی دھل گئے اور خون جو خراشوں سے رس رس کر جسم پر جمتا رہا تھا وہ بھی دھل گیا۔
نے پانی میں شلوار قمیض اتاری اور نچوڑ کر پھر پہن لی۔

پناہ گاہ میں بھی اور کپڑے اتار کر نہ دریں پھیلا دیتے۔ وہ لیٹ کر سوچنے لگا کہ اب کیا ہو گا۔ اس کے
تے تین مسئلے تھے۔ پہلا یہ کہ سامی سے ملے اور اس سے انجمن کے متعلق پوچھے اور اگر پولیس اس
ہیں پریشان کر رہی ہے تو ان کی عزت و آبرو کی خاطر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے۔ دوسرے
ی سے ملنے سے پہلے گرفتاری سے بچا رہے اور تیسرے یہ کہ زخم اور چوٹیں جلدی ٹھیک ہو جائیں اور
کی طرح بھاگنے اور دوڑنے کے قابل ہو جائے۔ وہ اس خطرے سے آگاہ تھا کہ پولیس نے گاؤں میں
ے بٹھا دیے ہوں گے۔ خوبصورت ہوتے ہوئے ٹخنے، زخمی پاؤں اور گھٹنے اسے چلنے نہیں دے رہے تھے۔
لگ اٹھ کر دکھ رہا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ سانوں کی کوئی مخبری میں پیسہ نہ ڈال دے۔

کا دار اور تو سیتال کے ایمرجنسی وارڈ کے کمرے میں پڑا تھا جہاں ڈاکٹر اور نرسیں اس کی خدمت میں کھڑی تھیں لیکن جن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem

گلوکوز، انجکشن اور دوا جدید کے تمام ہتھیار موجود ہے بوا سان کا موت کے منہ سے موڑا لائے تھے لیکن جیسے آسمان نے قدرت کے جرم کو درگزر پڑا تھا یا، اسے چند ایک جنگلی بوٹیوں پر بھروسہ تھا جو زخموں اور چوٹوں کے اچھی ہوتی ہیں، مگر اسے ابھی وہ بوٹیاں تلاش کرنی تھیں۔

نیلوفر دن میں دو تین بار ہسپتال جاتی تھی اور ایک چکر تھانے لگاتی تھی۔ اس کی کوٹھی کی رکھوالی کے لیے دن رات ایک کانسٹیبل موجود رہتا تھا۔ اس کے دونوں ملازم مرد تھے اور نیلوفر ایک ملازمہ کی ضرورت محسوس کرنے لگی تھی۔

اس کی ملنے جلنے والیوں کی تعداد بیشمار تھی۔ فیشن پرست حلقوں میں ملنے والیوں کی کمی کی تھی لیکن اس اور کردار میں بھی فیشن کا رنگ غالب ہوتا تھا۔ وہ ہمدردی کی دو چار باتیں کرتی تھیں۔ ان میں انگریزی زبان کی اصطلاحیں اور تصنع زیادہ اور خلوص کم ہوتا تھا۔ نیلوفر بھی اسی مغرب پرست دنیا کی لڑکی تھی لیکن جوٹ جراثیم دل پر چڑھی تھی، اس نے بھڑیے اتار پھینکا تھا اور کبھی دل ٹوٹ ٹوٹ کر کہتا تھا۔ "کہیں ویرانوں میں نکل نشانی دنیا سے دور چل کے پیڑوں کی سال سال تنے کسی نہر کے کنارے جہاں چھپ کے روؤں ہنس لوں۔۔۔ دنیا کی ہماہمی سے دور نکل جاؤں اور سوچ ہی لوں کہ یہ سپنا تو نہیں جو میں نے دیکھا ہے یہ جو بپتا ہی ڈراؤنا ہے۔"

نیلوفر کبھی کبھی کشمیر پوائنٹ کی طرف نکل جایا کرتی تھی اور دور دھند سے جھانکتی ہوئی برفانی چوٹیوں کو گلا دیا کرتی تھی۔ نگاہیں وہاں سے اترتی تھیں تو قد جیسے سبز پوش پہاڑوں پر غراں غراں گھومنے لگتی تھی۔ نے کسی بار چاہا کہ پاپیادہ ان جنگلوں میں نکل جائے بھیرلوٹ کے نہ آئے۔

اب تو اسے کوٹھی سے نفرت ہونے لگی تھی اور وہ کسی ایسے ساتھی کی ضرورت محسوس کرنے لگی جس سے وہ دل کی باتیں کر سکے اور جو اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دل سے کہے۔ "نیلو! تو بہت دکھی ہے۔"

اس نے پہلی بار اس محرومی کی تلخی محسوس کی کہ اس کی ماں نہیں بہن نہیں اور اسے یہ احساس بھی کہ ماں اور بہن کے سوا کون ہے جو دکھ بانٹ سکتا ہے۔

ہلکے خرالد بھولی بھالیوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے مری کے تمام رجسٹر غنڈوں اور لسبتہ سب کے کو جمع کر کے کہا تھا۔ "تمہارے علاقے میں جانے کہاں کے آدمی واردات کر گئے ہیں۔ یہ ہماری نہیں توہین ہے۔ وہ کہیں گے مری کے استاد پھینڈی ہیں، چوس پینے کے سوا کسی کام کے نہیں۔"

خالد کا یہ تیر نشانے پر بیٹھا تھا اور تمام بدمعاش اپنے طور پر سراغ رسانی میں مصروف ہو گئے اور اپنے مخبر ساجی کے گاؤں اور مری کے گرد و نواح میں پھیلا دیتے۔ پولیس کے بھی جاسوس ہر وقت ساتھ تھے۔ پنڈی پولیس کو بھی خبردار کر دیا گیا تھا۔ دوسرے تھانوں کو بھی جمیل کا حلیہ، واردات کی تفصیل وغیرہ لکھ کر بھیج دیا گیا تھا۔ مری سے روانہ ہونے والا ٹرک، بس اور ٹیکسی پنڈی بوائنٹ اور دوسری طرف کلاڑ روڈ کے

ہو جاتی تھی اور بڑی غور سے چیک کی جاتی تھی۔

گاؤں کے بھی لوگوں نے اپنے اپنے طالع کو یقین دلایا تھا کہ وہ ڈاکو کو پکڑنے میں جان کی بازی لگا دیں گے۔ یہ وعدہ بے بزی سنجیدگی سے کیا تھا، کیونکہ یہ گاؤں کی عزت کا سوال تھا۔ ان کے گاؤں نے کبھی چور کو جنم نہیں دیا تھا۔ لوگوں میں کبھی یوں پولیس نہیں اتری تھی کہ ان پر ہر سے بی بٹھا دیتے جائیں۔

وہ لوگ آپس میں لڑا جھگڑا کرتے تھے۔ کبھی بچوں کی لڑائی پر دست و گریباں ہو گئے۔ کبھی دھوڈھوڑ مکروں پر ہو گئی یا تنور پر عورتیں لڑیں تو مرد بھی ٹوٹ میں پڑ اترتے آ گئے لیکن گاؤں کے بڑے بڑے سب کو ختم کر بیٹھا رکھتے تھے اور مری کی ٹھنک فضائیں دلوں سے کدورتیں دھو ڈالتی تھیں کبھی تھانے جانے والوں کو بلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

گاؤں والوں کو وہ دادا قبلہ صاحب نور خان رنگ سلاری کی بیوی نے فحش الٹا مار دی ہے کے سر پر کھڑے تھے تو وہ سارا دن بے ہوش پڑی رہی تھی اور سر سے خون رکتا ہی نہ تھا۔ کسی نے کہہ دیا تھا مر جاتے گی تھانے کھلوا دو، تو گاؤں والے یوں تڑپ اٹھے تھے جیسے سب کی بیویوں کو پولیس کے حوالے کیا جا رہا ہو۔ مرزا ہو ج کرکہا تھا۔ "مرزا، اگر کسی نے جو اپنی بات کی تو، نور خان کے گھر والی گاؤں کی بیٹی ہے۔ جے کوئی ش کو تھانے چڑھاتے ہے؟" اور گاؤں دم بخود رہ گیا تھا۔

مگر آج پولیس نے گاؤں میں ڈیرے ڈال دیئے تھے اور گاؤں کی مظلومیت ایک ڈاکو کے نام سے ہو گئی تھی۔ گاؤں والے اجڈ دادا اور ساجی کو یوں حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے جس طرح آدم اور ابلیس سے بے آبرو ہو کے نکلے فرشتوں نے گھور کے دیکھا تھا۔ وہ دن کا گاؤں میں چلنا پھرنا محال ہو گیا تھا۔ پیس ان کے مکان کو یوں دیکھتی تھی جس طرح کوئی عالی یا پیر فقیر کسی آسیب زدہ مکان کو دیکھا ہے۔

اجڈ دادا اور ساجی اپنے گھر میں دبکے بیٹھے تھے۔ ساجی کا بیٹھنا ہی مال گلابی رنگ کبھی لال جو ہوا، کبھی ی طرح زرد۔ اچھا کھاٹ پر لیٹ جاتا اور یوں اٹھ کھڑا ہوتا جیسے اسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو مگر اس کے ے کے جھڑیاں گہری ہو جاتیں اور وہ پھر یوں کھاٹ پر جا پڑتا جیسے کچھ بھی نہ اٹھے گا۔

وہ ایک بار پھر اٹھا اور دیوار کے ایک چوڑے سوراخ میں سے اس نے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ اس کی کھول کر دیکھا۔ وہ پڑھ نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس پر کیا لکھا ہے۔

"ساجی!" ۔۔۔ اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔ "میں پولیس سے جان چھڑا سکتا ہوں۔ یہ کاغذ تھانیدار کو ں کو تو اس کے سارے شک دور ہو جائیں گے۔"

"کیا ہے یہ؟" ۔۔۔ ساجی نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

"تمہیں یاد ہے جمیل نے مولوی صاحب سے اپنی ماں کو خط لکھوایا تھا؟" ۔۔۔ اجڈ نے کہا۔ "یہ اس کے ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ بیٹے لکھ کر رکھنے

www.paksociety.com

چاہیں ورنہ یاد نہیں رہتے ہیں یہ پتہ پولیس کو دے دیتا ہوں جمیل اپنے گاؤں بھاگ جائیگا۔ پولیس والے پکڑلا سکے گی۔ پھر دودھ اور پانی الگ الگ ہو جائیں گے۔"

ساجی نے کچھ سوچے بغیر کاغذ کا یہ پرزہ اخوداد کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے پھاڑ کر چو۔ پھینک دیا۔

"خبردار دادا!" — ساجی نے کہا۔ "آج جو حالت ہماری ہو رہی ہے۔ کل اُس کی ماں کی ہوگی۔" بد دعائیں نہ لینا۔ میرا دل کہتا ہے جمیل ڈاکو نہیں ہے۔"

اخوتھپڑ کھاٹ پر گر پڑا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ کاردار تیزی سے رُو بصحت ہو رہا تھا اور اب ہسپتال کے کمرے نکل کر برآمدوں اور لان میں آہستہ آہستہ گھوم پھر آتا تھا۔

جمیل کے زخم بھر نے لگے تھے اور وہ زخمی کیڑے کی طرح گھنے جنگل میں چھپا رہتا تھا یا شام بعد محرومیت کا جائزہ لینے گھوم آتا تھا۔ بارش تو بہر وز بہر ستی تھی لیکن قدرت نے اسے جو پناہ گاہ دی تھی، اندر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ جاتا تھا۔ سنانے کو ندی تھی جو بارش سے سیلابی دریا بن جاتی تھی اور جب بارش تھی تو جیند ہی گھنٹوں بعد یہ داسی آب جو بڑی مصروفیت سے سنگ ریزوں پر مل ترنگ بجانے لگتی تھی شناف ہو جاتا تھا۔

کھانے کے لیے جنگل بھر اپڑا تھا اور زخموں اور چوٹوں پر باندھنے کے لیے اسے دو چڑے پودے مل گئے تھے جو زخموں اور چوٹوں کے لیے اکسیر ہوتے ہیں۔ وہ اب لیے ڈگ بھر کے چلتا تھا اور بھی اپنے جسم کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ وہ ساجی سے ملنے کے لیے بے قرار رہا تھا۔ وہ اپنے گاؤں جا سکتا تھا سنے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ ہوا کیا ہے۔ اس کا ہے۔ انگوٹھی میں کیا راز ہے۔ اسے خیال یہ آرہا تھا کہ شاید ساجی کو کوئی جھانسے کی ترکیب کر رہا ہے رہ وہ کہ ساجی کا یہی خیال آتا تھا۔

وہ سیدھا سادہ دیہاتی تھا۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ پولیس کی عراست سے فرار کتنا بڑا جرم ہے نے ساوگی میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ساجی سے ملے گا اور اگر کسی نے ساجی پر ہاتھ اٹھایا، یا اسے میلی نظر دیکھا یا اخوداد کو کسی نے پریشان کیا تو وہ اس کا خون کر دے گا۔ وہ کاردار اور پولیس کے ساتھ خونریز جنگ کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

مرکا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ نیلوفر ہسپتال سے واپس آرہی تھی۔ مال روڈ سے گزر تے اسے یاد آگئیں اور وہ ایک دوکان میں چلی گئی۔ ہاتھ میں بڑے بڑے بنڈل اٹھائے جب باہر آئی تو ایک

سیفی عورت نے اسے روک لیا۔

"بیٹی!" — اس عورت نے بھکاریوں کی طرح کہا۔ "سامان اٹھا لے چلوں نیلوفر سامان اٹھوانا ہی چاہتی تھی لیکن زندگی میں پہلی بار ایک عورت نے اسے بیٹی کہا تھا۔ اس کا انداز اسے بھونا۔ بنڈل اسے دیتے ہوئے بولی — "اٹھا لو اماں!"

بہت مدت گزری کاردار نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ماں اُس وقت مر گئی تھی جب وہ ایک سال کی تھی۔ اور ایک سال بعد اس کا باپ بھی مر گیا تھا اور اسے کاردار نے پالا تھا۔ کاردار نے اسے کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی لیکن وہ ایک خلش سی سینے میں محسوس کرتی رہی مگر آج ایک عورت نے اسے بیٹی کہا اس کے سینے کی خلش جسے کاردار کی شفقت نے دبا رکھا تھا اُبھر آئی اور نیلوفر نے ماں کی محبوری کی شدت سے محسوس کیا۔ دل اس کا بھوت تھا ہی، اب یہ محبوری زخموں کو بے دردی سے چھیڑنے لگی۔ اس غریب سی عورت نے اسے بیٹی کہہ کر رلا دیا۔ وہ بنڈل اٹھا کر چل دی۔

نیلوفر اس عورت کے آگے آگے چلی جا رہی تھی اور اس کے احساسات میں ہلچل سی بپا تھی۔ اس نے عورتوں کو دیکھا اور سوچا کہ اس عورت کے چہرے سے مہرے سے مفلسی اور شفقت کے اثرات دھل جائیں تو کیس قدر خوبصورت لگنے لگے۔ عمر کے چوالیس پچاس سال تو اس عورت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ نیلوفر کو خیال آیا کہ اُسے ملازمہ کی ضرورت ہے۔

"اماں! کہاں رہتی ہو؟" — نیلوفر نے پوچھا — "کرتی کیا ہو؟"

"بیٹی!" — عورت نے تھکی تھکی آواز میں کہا — "بہت دور سے آتی ہوں۔ آج ہی یہاں پہنچی ہوں اور سوچتی ہوں میں کتنی پاگل ہوں۔"

"کیوں اماں؟ پاگل کیوں؟"

"بہت دن ہوئے" — عورت نے کہا — "میرا بیٹا نوکری کی تلاش میں گھوڑی پر گھر سے نکل آیا تھا میں نے بہت روکا تھا لیکن نہ رکا۔ اس نے کام مری سے خط لکھا تھا کہ ماں جی تم بھی آجاؤ۔ مجھے روز کا بھی مل گیا ہے ٹھہرنے کو ٹھکانہ بھی۔ چلا گیا، اتنا بھی نہ لکھا کہ وہ ٹھکانہ کہاں ہے۔ بس اتنا لکھ دیا کہ مری پہنچ جاؤ۔ بے چارہ خود ٹوٹا پھاٹا نہیں، کسی سے لکھوایا ہوگا۔ میں بھی پاگل، اتنا بھی نہ سوچا کہ مری بڑا شہر ہے۔ میرے دادا پردادا نے بھی نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ سوچا جا رہے گاؤں کی طرح گاؤں ہوگا، جا کے پوچھوں گی میرا بیٹا جمیل کہاں رہتا ہے تو لوگ فوراً بتا دیں گے۔"

نیلوفر اس کی سادگی پر مسکرانے لگی۔ اس سے اس کے اعصاب کا کھچاؤ کم ہو گیا۔ عورت سادہ سے معصوم سے لہجے میں بولے جا رہی تھی۔

"بیٹی!" — وہ کہہ رہی تھی — "تم اپنے بیٹے کا خواص کے میں اٹھ دوڑی۔ تین روز پیدل چلی۔ کل ٹھوکر لگ گیا پاس

www.paksociety.com
Azeem Paksamiyapoint

"اب سو جا بیٹی! دیکھ تیری آنکھیں نیند سے سرخ ہو رہی ہیں" — اور آنکھ کے جل دی۔

اُس رات نیلوفر بچیاں لے لے کے روتی — صبح اٹھی تو سینے کی گھٹن نہایں طور پر کم ہو چکی تھی۔ اس نے جمیل کی ماں کو بلایا — وہ آئی تو اسے دیکھ کر نیلوفر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ میں ملال کی آمیزش کے ساتھ شیرینی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

نیلوفر کو قرآن مجید پڑھنے کا خیال آیا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ قرآن پڑھنا نہیں جانتی نہ کوٹھی میں قرآن موجود ہے۔ وہ جمیل کی ماں کو بتانے سے بھی جھجک رہی تھی کہ اس کی شاندار زندگی قرآن کے تقدس سے محروم ہے۔ جمیل کی ماں کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور اس کے ہونٹ متحرک تھے۔ نیلوفر کو اس عورت پر رشک آنے لگا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ عورت خدا کے کس قدر قریب ہے اور وہ خوشحالی و شگفتگی جو اُس کے چہرے سے ٹپکتی ہے۔ اُسے کوٹھی اور کوٹھی کے اندر سجے سجائے سامان آسائش اور ہر شے سے گھن آنے لگی۔

"میرے لیے دعا کرو ماں جی ہونا ماں؟" — نیلوفر نے بھیک مانگنے کے لہجے میں پوچھا۔

"جو تمہارا کرے گا بیٹی!" — ماں نے تسبیح لپیٹ کر مٹھی میں لی اور نیلوفر کے سر اور منہ پر پھیر دی۔

نیلوفر پر رقت طاری ہو گئی اور وہ دل ہی دل میں خدا کے حضور جھک گئی۔

"قرآن کہاں رکھا ہے بیٹی!" — جمیل کی ماں نے پوچھا۔ نوکروں سے پوچھا تو دونوں ہنس پڑے تھے۔ ایک نے کہا۔ جہانگی اپنا کام کر۔

"ماں!" — نیلوفر نے لجاجت سے کہا۔ "میں قرآن ساتھ نہیں لائی۔ گھر میں گندنے کے لیے آئی ہوں۔"

"او تو سب کچھ تمہارے ساتھ آگیا، صرف قرآن نہیں آیا" — جمیل کی ماں نے کہا۔ "تمہیں یہ کسی نے نہیں بتایا کہ جس گھر میں قرآن نہ پڑھا جائے وہاں سے رحمت کے فرشتے رخصت ہو جاتے ہیں؟"

نیلوفر کے ذہن میں یکبارگی بے شمار باتیں آگئیں مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ جھینپ سی گئی۔

"قرآن منگوا دو بیٹی!"

"مجھے بھی پڑھاؤ گی؟" — نیلوفر کی زبان یوں رواں ہو گئی جیسے نہر کا کنارا ٹوٹ گیا ہو۔ کہنے لگی — "قرآن میرے اُجڑے ہوئے گھر کو لبادے گا؟ میرے دل کے زخموں کا مرہم بنے گا؟ میں بھٹک گئی ہوں، مجھے راستہ دکھا دے گا؟" — اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے آنسو پونچھے نہیں۔ بولتی چلی گئی — "میں غموں میں ڈوب چلی ہوں اماں! مجھے بچا لو" — اس نے لپک کر تایا کے پر اس اٹھایا اور جمیل کی ماں کی طرف بڑھا کر کہا — "لے جا زیور دولت لے لے مجھے قرآن لا دو۔ خود پڑھو اور مجھے پڑھاؤ۔"

جمیل کی ماں اسے دیکھتی رہی۔ وہ عالم فاضل نہیں تھی۔ سیدھی سادی۔ کوری ان پڑھ پہاڑن تھی لیکن عقیدے کے تقدس نے اسے نیلوفر پر غالب کر دیا۔

"قرآن تمہارا سہارا کر دے گا" — وہ یہی کچھ کر سکی۔

اور اُسی روز اس گھر میں قرآن آگیا اور دیواروں اور طاقوں نے پہلی بار قرآن کی آواز سُنی۔ جمیل کی ماں رات کے پچھلے پہر تلاوت کر رہی تھی اور دوسرے کمرے میں نیلوفر کے آنسو بہ رہے تھے۔

کاروبار بھلا چنگا ہو کر سیتال سے آگیا۔ اس نے رات اپنی کوٹھی میں غسل صحت کا ناغہ دیا۔ شادی کا منتظر تھا۔ راولپنڈی سے پولیس بلوا بلایا گیا تھا۔ شراب کے مٹکے خالی ہو گئے۔ نیلوفر سب کی توجہ کا مرکز تھی لیکن وہ کاروباری وجہ سے پارٹی میں موجود رہی ورنہ وہاں کبھی نہ جاتی۔ ڈنر کے بعد ڈانس شروع ہوا تو امیدواروں کا ایک ہجوم تھا جو نیلوفر پر ٹوٹ پڑا لیکن اس نے جھوٹے بہانوں کا سہارا لیا اور بغیر سب سے معذرت چاہی اور اس انبوہ سے نکل آئی۔

دوسرے روز کاروبار راولپنڈی چلا گیا۔ نیلوفر کو گزرنا تھا کہ وہ جلد روز بعد لوٹے گا لیکن وہ اگلے روز ہی آ گیا۔ شام پر جب نیلوفر کی کوٹھی میں آیا۔ اس کے ساتھ ایک خوش شکل اور خوش لباس آدمی تھا۔ کاروبار نے اسے نیلوفر سے متعارف کرایا تو وہ بولا کہا — "یہ میرے دوست ارشد صاحب ہیں۔ لاہور میں ان کی ٹیکسٹائل مل چل رہی ہے اور لائل پور میں ایک اور ملز نگا رہے ہیں۔"

ارشد چرب زبان آدمی تھا۔ وہ نیلوفر کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیلوفر پر رنج و الم کے جو پہاڑ گر پڑے تھے۔ ان سے نکل کر وہ ارشد کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکی۔ اس جسم کے خدوخال اور خوبصورت الفاظ سے بے تکلف ہونے کی کوشش اس مغرور بندہ دنیا کا رواج تھا۔ اور نیلوفر اس رواج سے اکتا گئی تھی۔

انسپکٹر خالد دوبار ساجی کے گھر گیا تھا اور اس نے ہر بار ساجی کو گہری نظروں سے دیکھا تھا اور گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ وہ جمیل کی گرفتاری کے لیے ساجی کو استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہ حسین پہاڑن اعتماد میں لی جا سکے تو وہ جمیل کے لیے ہم رنگ زمیں دام کا کام دے سکتی ہے۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار سندھ کے علاقے میں اس نے ایک خطرناک ڈاکو کو ایسی ہی ایک حسین لڑکی کی مدد سے گرفتار کیا تھا۔

اس نے دونوں بار ساجی سے چند باتیں پوچھیں تھیں لیکن ساجی نے ڈرے ہوئے بچے کی طرح اکھڑے اکھڑے جواب دیے تھے۔ انسپکٹر خالد کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ سادہ لڑکی ہے اور اس کی فطرت میں چالاکی اور عیاری کا شائبہ تک نہیں۔ وہ ساجی کی سادگی کو ہی استعمال کرنے کا پروگرام بنا کر ساجی کے گھر چلا گیا۔ اخود واہ اور ساجی نے اسے سہمی سہمی سی نگاہوں سے دیکھا لیکن خالد کے چہرے پر عام انسانوں کی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سماعوں کے سے لہجے میں "السلام علیکم" کہی اور بے تکلفی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس کی خیریت پوچھی اور فضا میں جو تکدر اور سرکاری پن چھا گیا تھا اسے کم کرنے کی کوشش کی۔

"بابا جی!" — اس نے کہا — "تم ذرا باہر چلے جاؤ تو دو چار باتیں ساجی سے پوچھ لوں!"

اجو کو چھڑکا سا لگا اور وہ حکم طلب نگاہوں سے انسپکٹر کو دیکھنے لگا۔ خالد بوڑھے کے چہرے پر لکھی التجا سمجھ گیا۔ بولا۔ "تم فکر نہ کرو بابا! جس طرح یہ تمہاری بچی ہے اسی طرح میری بھی بچی ہی ہے۔ میں بھی بیٹیوں والا ہوں۔ جو کہہ رہا ہوں مجبور کر رہی ہے۔ باہر نہ جاؤ، دروازے کے ساتھ جا کے بیٹھ جاؤ!"

اجو صحن میں جا بیٹھا۔ انسپکٹر خالد نے ساجی سے کچھ ایسے انداز سے باتیں کیں کہ اس کے دل سے پولیس کا خوف نکل گیا اور وہ کھل کر باتیں کرنے لگی۔ اس سے انسپکٹر خالد کو وہ تمام واقعہ سنایا کہ کس طرح وہ کار دار کے ہاں رہ دینے جایا کرتی تھی اور کس طرح وہ اسے کار میں بٹھا کر باہر لے گیا پھر جمیل میں اس وقت پہنچ گیا تھا جب کار دار اس پر دست درازی کر رہا تھا۔

انسپکٹر خالد کو گمان تک نہ تھا کہ کار دار نے فی الواقع ایسی حرکت کی ہو گی حالانکہ جمیل نے اسے بتایا تھا لیکن اس نے اسے محض بے وقوف یا دانہ ہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اب ساجی نے ساری بات سنائی تو انسپکٹر کو یقین ہونے لگا کہ یہ لڑکی جھوٹ نہیں بول رہی۔ وہ تجربہ کار پولیس انسپکٹر تھا چہرے پڑھنے کی مہارت رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جھوٹ کس لہجے میں بولا جاتا ہے۔ ساجی کا لب و لہجہ نرم اور صاف تھا۔ وہ جس سادگی اور معصومیت سے بول رہی تھی۔ وہ خالد کے دل میں اترتی جا رہی تھی اور اس کی نگاہ میں کار دار کی شخصیت مشکوک ہوتی جا رہی تھی۔

"لیکن ساجی!" — انسپکٹر خالد نے مشفقانہ لہجے میں کہا — "تمہاری بات سچ مان بھی لی جائے تو بات ختم نہیں ہو جاتی۔ جمیل پھر بھی مجرم ہے۔"

"کیوں؟"

"اس نے ایک کوٹھی میں ڈاکہ ڈالا ہے اور کوٹھی والے کو کہیں باہر لے جا کر قتل کر دیا ہے۔"

"کب؟"

"تھوڑے روز ہوئے۔"

"ہمارے گھر آنے سے پہلے کی بات ہو گی؟"

"نہیں، بعد کی.... جس روز تمہارے گاؤں کے کسی لڑکے کے بازو پر گولی لگی تھی، یہ اس رات کی بات ہے جمیل نے اس شہری کو دھمکی دی تھی کہ میں تمہاری لاش بھی گم کر دوں گا.... اور آج تک لاش نہیں ملی۔"

"جھوٹ۔" — ساجی اچک کر بولی۔ "جمعدار صاحب جی! بالکل جھوٹ! وہ ایسا نہیں۔ اس رات میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس رات وہ باہر نکلا ہی نہیں تھا۔"

"لیکن ہمارے پاس پکا ثبوت ہے۔"

"کیا؟"

"لو تم بھی دیکھ لو لیکن کسی سے بات نہ کرنا۔" — انسپکٹر خالد نے جیب سے انگوٹھی نکال کر اسے دکھائی اور کہا۔ "یہ انگوٹھی مقتول کی ہے۔ جمیل کی انگلی سے اتاری گئی ہے۔ اس نوٹ میں دیکھو۔"

ساجی نے ایک کونے کی انگوٹھی لے لی اور بولی۔ "جمعدار صاحب جی! یہ انگوٹھی تو میں نے جمیل کو دی تھی۔ بات میں ہوتی تھی جی!" — اس نے اپنی انگلی سامنے کر کے کہا۔ "اس نے مجھے یہ انگوٹھی دی تھی تو میں نے سے یہ انگوٹھی دی تھی۔"

"تم نے دی تھی؟" — انسپکٹر خالد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی۔" — ساجی نے کہا۔ "میں نے دی تھی.... جمعدار صاحب جی! وہ بُرا آدمی نہیں۔ بڑا شریف آدمی ہے۔ بس ایسے ہی کہنے لگا کہ یہ تم پہن لو۔ وہ مجھے اپنی بہن سمجھتا ہے جی! مجھے بھی وہ اچھا لگتا ہے۔ میں نے ڈولی میں پیسے جمع کر رکھے تھے۔ میں دو چار کیرے انگوٹھی بازار سے لے آئی۔ بہت منگتی ہے جمعدار صاحب جی! بالکل ہم ساتھ رو پلے پرانی تھی۔"

"کہاں سے خریدی تھی؟" — انسپکٹر نے چونک کر پوچھا۔

"نیچے والے بازار کے اندر ایک گلی ہے ناجی! وہاں ایک دوکان ہے۔ دوکان والا اردو بولتا ہے۔ تم نے اندر ایک صندوق سے نکال کر دی تھی۔" — ساجی نے کہا تھی کے لہجے میں کہا۔ "جمعدار صاحب جی! تو نہیں جمعدار صاحب جی! اللہ نے رزق دیا ہے، حق حلال کی کھاتی ہیں۔"

لیکن انسپکٹر خالد خلاؤں میں کھو گیا تھا اور اس کے جھوٹوں پر یقین شکر امبٹ آ گئی تھی جیسے خواب میں مسکرا رہا ہو اور خیالوں کی دنیا میں اسے فراموش کر گیا ہو۔

"میرے ساتھ چلو گی؟.... ہاں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہی پڑے گا ساجی!" — اس نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "مجھے اُس دوکان پر لے چلو۔" — اور اس نے ساجی کے دل و دماغ پر مکمل قبضہ کرنے کے لیے کہا۔ "اگر یہ ثابت ہو گیا کہ تم نے انگوٹھی وہ کار دار سے خریدی ہے تو میں اسے گرفتار کر کے جیل کو چھوڑ دوں گا اور سارے گاؤں کو بتا دوں گا کہ جمیل بے گناہ ہے اور اسے گاؤں میں آنے کی اجازت ہے۔"

ساجی چمک اٹھی اور وہ انسپکٹر کے ساتھ مری شہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ انسپکٹر نے اجو کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ وہ وسوسوں میں نہ پڑا رہے۔

دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا جب ساجی انسپکٹر خالد کے ساتھ اُس دوکان میں داخل ہوئی جہاں سے اس نے ٹوٹی عزیزی تھی۔ یہی کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ تھانے دار اور جانی پہچانی ساجی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں

www.paksociety.com
Azeem Paksitanipoint

اور منہ یوں کھل گیا جیسے پیٹھ میں کسی نے خنجر گھونپ دیا ہو۔ وہ اچھل کر اٹھا اور کاؤنٹر پر ہاتھ رکھ کر تنفس درست کرتا ہوا گیا۔

"اس سے لی تھی میں نے انگوٹھی۔" ساجی نے کہا۔

میمن پر سکتہ طاری ہو گیا۔

"یہ انگوٹھی تم نے بھی سیٹھ؟" ۔۔۔ خالد نے میمن کو انگوٹھی دکھاتے ہوئے تقل سے پوچھا۔

میمن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے انگوٹھی کو دیکھا پھر انسپکٹر کے چہرے کو سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر فرمانبردار نظروں سے ساجی کو گھورنے لگا۔

"یہ انگوٹھی تم نے بھی بیچی ہے؟" ۔۔۔ انسپکٹر خالد گرج کر بولا۔ "جلدی بولو۔"

"حضور! ۔۔۔ بات یہ ہے کہ ۔۔۔ جناب ۔۔۔"

"میرے سوال کا جواب دو۔"

"میں عرض کرتا ہوں نا حضور کہ! ۔۔۔"

انسپکٹر خالد نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کے بال پکڑ لیے اور بالوں کو ایسے زور سے کھینچا کہ میمن کا ماتھا کاؤنٹر پر جا لگا اور اس کے دانت کٹکٹانے لگے۔

"یہ انگوٹھی تمہاری دکان سے نکلی ہے۔" ۔۔۔ انسپکٹر خالد نے دانت پیس کر کہا۔ "سچ بولو ورنہ زندگی بھر جیل کو کے حوالات میں لے چلتا ہوں۔" ۔۔۔ خالد نے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا۔ "حرامزادے سے تیرا باپ بھی سچ بولے گا۔"

"حضور! چھوڑ دیجیے ہی رہا ہوں۔" ۔۔۔ میمن نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "بات تو کرنے دیجیے نا۔" ۔۔۔ خالد نے بال چھوڑ دیئے تو میمن بولا۔ "ہاں جناب! یہ میں نے ہی اس لڑکی کو دی تھی۔"

"تم نے کہاں سے لی تھی؟"

وہ کاؤنٹر نے ہاتھ جوڑ لیے اور بولا۔ "یہ بھی بتاتا ہوں حضور! لیکن آپ شاید یقین نہ کریں۔" ۔۔۔ اس نے دراز سے پنسل اور کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور کچھ لکھ کر کاغذ انسپکٹر کے آگے کر دیا۔ وہ یہ بات ساجی کی موجودگی میں نہیں کہنا چاہتا تھا اس لیے اس نے کاغذ پر لکھ دی۔

انسپکٹر خالد کو دھچکا سا لگا اور وہ حیرت زدہ اور شکی نگاہوں سے میمن کو گھورنے لگا لیکن میمن کے ہونٹوں پر فتح کی مسکراہٹ تھی۔

"مجھے معلوم نہیں جناب کہ یہ مال چوری کا ہے یا اس کا ذاتی ہے۔" ۔۔۔ میمن نے کہا۔ "بس کا مال اکثر میرے ہاں آتا ہے۔"

"اگر یہ غلط نکلا ۔۔۔" ۔۔۔ انسپکٹر خالد نے کہا۔ "تو تم جانتے ہو کہ تمہارا کیا حشر ہو گا۔"

"میں بال بچے دار ہوں حضور!" ۔۔۔ میمن نے کہا۔ "جھوٹ بول کر بچوں کو بھوکا نہیں مروں گا۔" ۔۔۔ اس نے میز کی نیچے والی دراز کھولی۔ چھوٹی سی ایک نوٹ بک نکال کر اس کے ورق الٹے اور نوٹ بک انسپکٹر کے سامنے رکھ دی۔ خالد کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ "حضور! ۔۔۔ دکان دار نے کہا۔ "اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو میں آپ کا گواہ ہوں۔ ملزم نہیں ہوں، نہ ملزم کی صفائی کا گواہ ہوں۔" ۔۔۔ اس نے لاپروائی سے پوچھا۔ "کیا یہ چوری کا مال ہے جناب؟"

"ہوں!" ۔۔۔ انسپکٹر خالد نے ڈائری اور انگوٹھی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا کسی اور طرف جا رہا ہوں۔ تم رات ساڑھے آٹھ بجے تھانے آ جانا۔ اگر یہ بات باہر نکل گئی تو اپنا رکھو۔ انجام بہت برا ہو گا۔"

"جو حکم حضور!" ۔۔۔ میمن دکان دار ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "کہو تو ابھی چلا چلوں جو حکم کریں گے لکھ دوں گا۔"

"ابھی نہیں رات کو۔"

انسپکٹر خالد سر جھکائے دکان سے نکلا اور گہری سوچ میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کے ساتھ مکمل گہرے ہوتے جا رہے تھے اور وہ بار بار ماتھے کو ہتھیلی سے پونچھ رہا تھا۔ ساجی بڑی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے اجو لاٹھی ٹیکتا چلا جا رہا تھا۔

"تم گھر چلی جاؤ۔" ۔۔۔ اس نے گھوم کر ساجی کو بوجھل سی آواز میں کہا۔ "اور دیکھو ساجی! تم میری بچی ہو۔ مجھے اپنا باپ سمجھو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں اگر تمہیں معلوم ہے کہ جمیل کہاں ہے یا وہ تمہیں کہیں ملتا ہو تو اسے کہو تھانے میں حاضر ہو جائے۔ میں اسے بچا لوں گا لیکن وہ تھانے میں آ جائے۔" ۔۔۔ اس نے اجو سے کہا۔ "یہ نادان لڑکی ہے۔ تم اسے سمجھاؤ اور خود بھی سمجھو۔"

"نہ جمعدار صاحب جی! پتہ نہیں آپ کو میری باتوں پر یقین کیوں نہیں آتا۔" ۔۔۔ ساجی نے بچوں کے سے لہجے میں کہا۔ "قسم پروردگار کی مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں۔ اگر کہیں نظر پڑا تو وعدہ کرتی ہوں کہ اسے تھانے لے آؤں گی۔"

"یہ ٹھیک کہتی ہے خان جی!" ۔۔۔ اجو بولا۔ "اگر وہ آ گیا تو آپ کو اطلاع دے دیں گے۔"

"شاباش!"

انسپکٹر خالد نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہا۔ "تم جاؤ اور اگر میں کسی سپاہی کو بھیج کر تمہیں بلواؤں تو فوراً اس کے ساتھ آ جانا۔ ڈرنے جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ دادا کو ساتھ لے آنا۔"

اجو اور ساجی چلے گئے تو انسپکٹر خالد یوں کندھے سکیڑے تھانے کو چل پڑا جیسے کندھوں پر ناگوار سا بوجھ آ پڑا ہو۔ وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا اور مسئلے الجھتے جا رہے تھے۔ اسی الجھن کا نتیجہ تھا کہ اس نے میمن کو رات ساڑھے آٹھ بجے تھانے آنے کو کہہ دیا اور اسے اسی وقت تھانے نہ لے گیا۔ اسے عاصمہ میں نہ یا نہ دکان کی تلاشی لی۔ وہ نوٹ بک از خود اٹھا لایا تھا اور بھول ہی گیا تھا کہ شہادت فراہم کرنے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کا یہ طریقہ غلط ہے۔ وہاں وہ سنیپوں کا ہونا لازمی تھا جو نوٹ بک کی برآمدگی اور دکان کی تلاشی کے وقت ہوتے لیکن مین کے انکشاف سے وہ اس قدر بوکھلا گیا تھا اور کیفیت کچھ ایسی ہیجانی ہو گئی کہ وہ لغزش آیا جس کا زخمی دکان سے نکلتے ہی دکان میں ظاہر ہونے لگا۔

وہ دکان سے نکلا تھا تو وہ دکاندار اسے اوجھل ہو جانے تک دیکھتا رہا تھا۔ پھر دوکاندار نے ٹیلیفون لیا تھا اور نمبر ملا کر کہہ رہا تھا۔۔۔ "ہیلو! آپ ہیں؟۔۔۔ خبر اچھی نہیں صاحب۔ انسپکٹر خالد آیا تھا۔ انگوٹھی کے پاس تھی اور وہ پہاڑن بھی اس کے ساتھ تھی جسے میں نے انگوٹھی دی تھی۔۔۔ جی ہاں! جی۔۔۔ نہ جانے میں نے اسے صاف بتا دیا ہے۔۔۔ یہ تو آپ کہتے ہیں نا! لیکن میری روزی اور عزت کا معاملہ ہے جب تک چلتا رہا میں چلاتا رہا۔ اب گنجائش نہیں تھی تو میں نے صاف بتا دیا۔۔۔ نہ جی! پنڈی کے سیٹھوں! آپ جانتے ہیں، میں بگڑا گیا تو وہ ساری عمر مجھ سے منہ نہ لگائیں گے۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس نے دکان کو نہیں لی۔ لیتا بھی تو کچھ نہ ملتا۔ باقی مال میں نے غائب کر دیا ہے۔۔۔ بس آپ کا نام لیا تو اسے یقین آ گیا تھا۔ کہنے لگا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے تھانے آ جانا اور چلا گیا۔۔۔ جی رات ساڑھے آٹھ بجے۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہ جی میں تھانے ضرور جاؤں گا اور وہ جو کچھ پوچھیں گے سچ سچ بتاؤں گا۔۔۔"

اور اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

*

انسپکٹر خالد کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ راستے میں جانے کتنے ہی لوگوں نے اسے سلام کیا۔ وہ لاشعوری طور پر سلاموں کے جواب میں سر کو جنبش دیتا چلا گیا۔ تھانے میں پہنچا اور اپنے کیبن میں جا بیٹھا۔ اس نے کہنیاں میز پر رکھ کر یوں سر جھکا لیا جیسے بسا طرح پر شطرنج کے کسی اگلی چال سوچ رہا ہو۔ ایسے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا جہاں مکمل احتیاط کی ضرورت تھی۔

کئی سوچ وچار میں ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور سورج سامنے پہاڑی کی چوٹی پر ڈوبنے لگا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں؟"

انسپکٹر خالد نے چونک کے دیکھا۔ دروازے میں ایک معزز صورت انسان کھڑا تھا۔ سر پر ہیٹ کیپ سرکے گھنے بال جھلک رہے تھے زیادہ تر سپید تھے مونچھ بھرا داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی جس کے طرح ہی سپید تھے اور ان کی عینک میں نورانی سا نور تھا۔ اس نے دلاتی پتلون اور اور خاصی قیمتی پشمینہ فور تھی آنکھوں پر بغیر فریم کے شیشوں والا چشمہ تھا۔ کھلتا ہوا قد لیکن نمایاں طور پر بگڑا تھا۔ اس آدمی کے سراپا بت اور وقار تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ شخص بڑا نہ ہوتا تو اس قدر دلکش نہ ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں اخروٹ کی لکڑی کا دستہ رکھتی دانت کا تھا۔ انسپکٹر خالد نے یہ چہرہ مری میں پہلے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس قسم کا باوقار چہرہ کبھی دیکھنے میں آیا تھا۔ وہ فلسفی معلوم ہوتا تھا۔

"تشریف لائیے۔" انسپکٹر خالد نے بے دلی سے کہا۔ وہ کوئی نیا کیس رجسٹر کرنے کے موڈ میں

"معقولات والی بات ہے۔۔۔" نووارد نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "مجھے نامی شرف الدین رازی۔" اس کی آواز میں ایک حد تک تصنع تھا لیکن آواز اس کے چہرے مہرے کی وقار اور پُراثر تھی۔

"میں حال ہی میں پاکستان واپس آیا ہوں۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تین برس انگلینڈ میں رہا۔ مجھے لاکپن سے ڈیٹیکشن کا خبط ہے جسے آپ سراغرسانی کہتے ہیں۔ میں انگلینڈ میں سکاٹ لینڈ یارڈ میں ذاتی طور پر ٹریننگ لیتا رہا ہوں۔ اس سے پہلے میں پاکستان میں شعلہ سراغرسانی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کتنا راتوں میں نے شکاری کے کھوجیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے تشکل کا فن کی تشکل دے دی ہے۔ میں پیشہ ورنہیں، نہ ماہر کی ضرورت ہے۔ البتہ کا دیا سرگودھا کے علاقے میں پانی بے شمار زمین ہے اور باغات بھی ہیں۔ چند دن ہوئے میری آیا ہوں سرے سے ہی رقبل اور ڈاکو کے پیروار دات ہوئی جس کا ملزم مفرور ہے اور مقتول کی لاش کا وہ باوقار لہجے میں بول رہا تھا اور انسپکٹر خالد اس سے متاثر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے انداز گفتگو کی پختہ کاری اور خلوص تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ بزرگ سایہ انسان کسی واردات کی رپورٹ لکھنے بھی خالد اس کی بات اتنی توجہ سے نہیں سن رہا تھا جتنا اس سے متاثر ہوا تھا۔

"میں نے کسی سے بات کیے بغیر اس کوٹھی کے گرد و پیش کا جائزہ لیا ہے — وہ کہہ رہا گذشتہ ہفتہ دس روز سے پہاڑوں اور جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں اس جگہ تک بھی گیا ہوں جہاں مقتول کے کپڑے ملے تھے۔"

"آپ کو کس نے بتایا تھا کہ کپڑے ملے تھے؟" — انسپکٹر خالد نے پوچھا۔

رازی ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی کا تاثر ایسا تھا جیسے کوئی جہاندیدہ استاد کسی شوخ کتب کی کوفی بولا۔ "محترم! آپ اسی پر حیران ہو گئے؟ میں آپ کو چند باتیں اور بتاؤں گا تو شاید آپ یقین نہ کریں گے۔ جہاں کے ملک میں، دراصل سراغرسانی سرے سے پیشہ ہے نہ ہماری پولیس اس طرف توجہ دیتی ہے۔ آپ لوگ واقعیت بالائے طاق دے کر واقعاتی بیان یا وعدہ معاف گواہ کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر یہ دونوں سہارے میں جھوٹ کثرت دے جاتے ہیں۔"

"تم ہر کیس میں یوں نہیں کرتے" — انسپکٹر خالد نے کہا۔

"بہرحال میں نے کل شام تک کچھ سراغ پا لیا ہے" — رازی نے کہا — "میں ایک عرصہ تک کو سکا جنگلوں کے سراغ اور تشکل کی کوشش اب کوئی تشکل کام نہیں ..... میں آپ بن سکتا کیونکہ قانون میری پوزیشن کو تسلیم نہیں کرے گا۔ آپ کو راہ دکھا سکتا ہوں" — اس نے رازداری کہا — "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ابھی چلیے۔ میرے پاس موٹر سائیکل ہے۔ میں آپ کو ایک جگہ لے جاتا ہوں۔ وہیں سے آپ کو اپنی منزل کے نشان نظر آئیں گے۔ میرا تشکل کے تفتیش شدہ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے میری راہنمائی آپ کے کام آ سکے۔"

انسپکٹر خالد نے ذرا سی بحث تمحیص کی تو اسے یقین ہو گیا کہ شخص بڑا نہیں مار رہا اور اس کے ساتھ جانا شاید سود مند ہو۔ خالد کو تشکل کے سلسلے کی تلاش کرنا تھا۔ اسے یمین و کاندار نے ایک سراغ دیا تھا۔ یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ انگوٹھی اس خاندان سے خریدی گئی ہے مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ کا شکار کوئی غریب گھرانہ ہوتا تو انسپکٹر خالد تفتیش میں اتنا پریشان نہ ہوتا۔ واردات خواہ کتنی ہی سنگین ہو

پیادہ واردات کا تشکل اونچے طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔"

تو بھی انسپکٹر کسی سنگین اور پیچیدہ واردات کی تحقیقات میں پرکاہ کو بھی رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ خالد رازی کے ساتھ چل پڑا۔

رازی اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر نیلو فر کی کوٹھی کے قریب لے گیا اور اسے واردات کے متعلق بتیں۔ خالد کو حیرت ہوئی کہ رازی کن باتوں کا علم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیسی ماہر سراغرساں کا ہی تو تھا۔ رازی بن سراغرسانی کے گر کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

پلٹ خالد کو شک سا ہوا کہ یہ آدمی کہیں خود ہی واردات میں ملوث نہ ہو۔ اس نے اس آدمی سے جو اپنا تا تھا۔ اس شک کی بنا پر کچھ پوچھنا چاہا مگر رازی نے اسے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور بولا — "میں کہا جا رہا ہوں وہ دیکھ لیں پھر آپ مجھ سے بہت سے سوال پوچھنا چاہیں گے۔ میں آپ کے سب تفصیل سے دوں گا۔"

سے وہ خاور کو خفیہ گلی روڈ پر لیے ستام پر لے گیا جہاں سڑک سے ہٹ کر ایک وادی شروع موٹر سائیکل جہاں تک اونچی نیچی راہوں پر چل سکتا تھا، اس نے چلایا پھر وہ کچھ فاصلے پر کھڑا کر اسے انسپکٹر خالد کو ساتھ لیا اور ایک بکری کی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ وہ بولتا جا رہا تھا اور دونوں اوپر چڑھتے تھے۔ بکری کی چوٹی پر پہنچے تو ان کے سامنے ایک فراخ وادی تھی۔ سامنے ایک اور پہاڑی تھی بلند تھی۔ یہ پہاڑی ایک اور پہاڑی سے ملتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان خاصا صاف تھا جو اس بلند پہاڑ اور اس سارے منظر پر گھنے جنگل کا سایہ تھا۔

مکان آپ کو نظر آ رہا ہے؟" — رازی نے چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر خالد سے

امکان؟" — خالد نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بلو! آپ کو نظر آ رہا ہے؟" — اس سے بائیں طرف چیل کے درختوں کا جھنڈ دیکھتے ہیں نہ جھاڑیں غور سے دیکھنے مکان ایک تو نہیں آ رہا؟"

— انسپکٹر خالد نے حیرت زدہ ہنسی ہنس کر کہا — "کیا وہ مکان ہے؟ وہ تو پہاڑی اور جنگل کا ابھرا ہے۔"

— رازی نے تنگ سی نظر سے دیکھا اور بولے کہا — "یہ علاقہ آپ کا ہے مگر آپ کو علم نہیں کہ اس نے شاید مکانوں اور چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کے کھنڈرات ہیں۔ کیسی وقت انگریزوں اور ہندوؤں تھیں لیکن ویران چھوڑ کر چلے گئے۔ چلیے میں آپ کو اس مکان میں لے چلتا ہوں۔"

www.paksociety.com
Azeem Paksitanipoint

سلاخ ہوگا۔ ایسا سلاخ کہ آپ تمام عمر سر پٹختے رہنے پر پا سکتے اور یہ کیس تمام عمر آپ کی ٹھوکر کی طرح لٹکا رہتا۔"

قریب گئے تو انکیٹر خالد نے دیکھا کہ وہ پختہ مکان ہے۔ ایک صدی سے غیر آباد نظر آتا تھا۔ میں بھی گھاس اور جھاڑیاں اُگ آئی تھیں اور دیواروں کا رنگ پیاز وں جیسا ہو گیا تھا۔ یہ پہاڑی کی ڈھلان کے اطراف میں بھی پہاڑیاں تھیں۔ موٹی موٹی بیلوں، اونچی اونچی گھنی جھاڑیوں اور پیڑوں کے جھنڈ نے مکان کو بعض درخت تو یوں لگتے تھے جیسے چھت پر اُگے ہوئے ہوں۔

"اندر چلیے" ــــ رازی نے خالد کو کندھے سے تھام کر آگے کرتے ہوئے کہا ــ

"نکل کر کمرے میں چلیے"

پہلا کمرہ بدبودار تھا۔ فرش اونچا نیچا تھا اور شور اور کائی سے اٹا ہوا تھا۔ صحیح سالم تھے خالد آگے بڑھا وہ کواڑ کھول کر اگلے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ پہلے کمرے سے زیادہ متعفن تھا۔ فرش گیلا تھا چھت اور دیواروں کا پلستر اکھڑا آیا تھا۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا لیکن کھڑکی اور روشن دان نہ تھے۔ فرش پر پتے پڑے ہوئے تھے۔ خالد رک گیا۔ رازی اس کے پیچھے تھا۔

"کیا ہے یہاں؟" ــــ انکیٹر نے گھوم کر پوچھا لیکن اس کی آواز حلق میں ہی رک گئی اور اس کا چہرہ کھل گیا۔ اسے خواب کا دھوکہ ہونے لگا۔ بڑے ہی خراٹے نے خواب کا دھوکہ۔

رازی کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ انکیٹر خالد کو ہتھکڑی باندھے دیکھ رہا تھا۔ رازی کا کیڑا پن سب وہی رازی جسے خالد نے منکر فلسفی اور بزرگ استاد سمجھ لیا تھا ہاتھ میں ریوالور لیے کس قدر خوار چہرے کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ آنکھوں میں ہولناک چمک اور ہونٹوں پر قہر آلود مسکراہٹ تھی

"کیا مطلب؟" ــــ انکیٹر خالد نے گھبراہٹ سے دبی دبی ٹوٹی آواز میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ....." ــــ رازی نے کہا ــ "انگوٹھی اور مہین کی ڈائری میرے حوالے کر دو"

"وہ..... وہ....." خالد بکلایا اور سنبھل کر بولا ــ "وہ میرے پاس تو نہیں"

"وہ تمہارے پاس ہیں" ــــ رازی نے ریوالور کی نالی اس پر سیدھی کرتے ہوئے کہا ــ جیب میں ہیں اور ابھی میری جیب میں آجائیں گی..... جلدی نکالو"

انکیٹر خالد اتنی جلدی شکست قبول کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے اچھل کر رازی کے مارا لیکن رازی تیز نکلا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ ذرا پرے کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے خالد کو خالد پٹخ کے گل گرا۔ رازی پیچھے ہٹ گیا اور انکیٹر خالد پھرتی سے اٹھنے لگا اور اپنے ریوالور ہاتھ رکھی لیکن کمرے کا دوسرا دروازہ کھلا اور دو آدمیوں نے خالد کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ وہ

رازی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر انگوٹھی اور ڈائری نکال لی۔ خالد بہت تڑپا لیکن ان دو آدمیوں نے اس کے بازو جکڑ لیے تھے۔

"میرا ریوالور تم نے لے لیا ہے" ــــ انکیٹر خالد نے چیلنج کے انداز میں کہا ــ "آؤ، اکیلے اکیلے میرے سامنے آؤ۔ بے شک ریوالور سے کے آؤ۔ بزدلو، تم جیسے ہو میں اکیلا ہوں"

رازی نے کھل کے قہقہہ لگایا اور بولا ــ "انکیٹر صاحب! دو سال سکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے مار کھائی ہے"

کمرے میں شام کا اندھیرا آ گیا۔ رازی خالد کو ان دو آدمیوں کے حوالے کر کے کمرے سے نکل گیا "یہاں سے بھاگنے کی کوشش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ مارے جاؤ گے" ــ ان دو آدمیوں سے ایک نے انکیٹر خالد سے کہا ــ "ہم تمہارے ہاتھ پاؤں نہیں باندھیں گے۔ کھانا باقاعدہ دے گا۔ تہ خانے کے باہر جا رہے دوست دن رات پہرے پر رہیں گے"

"مجھے یہاں قید کرنے کا مقصد؟"

"وہ بھی بتایا جائے گا" ــ اس آدمی نے جواب دیا ــ "میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ استاد جو کچھ تمہیں کہے وہ مان لینا"

وہ دونوں باہر نکل گئے۔

انکیٹر خالد کے کانوں میں دروازہ باہر سے مقفل ہونے کی آواز پڑی اور وہ کمرے میں شلنے اور غلطیوں پر پچھتانے لگا جو تھا نہ دانستہ کیا کرتے۔ اسے مہین کی دکان کی تلاشی قانون کے وضع کیے سے طریقے سے کرنی چاہیے تھی۔ برآمدگی کے ثبوت کے لیے دو شیشیوں کا ہونا ضروری تھا۔ اسے خود کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اسے اسی وقت تھانے لے جا کر اگر حوالات میں بند نہ کرتا تو کمشنر کو کمرے اسے تھانے میں پابند کر لیتا۔ اس کے بعد اس نے غلطی کی کہ ایک اجنبی کے ساتھ ٹھہرا۔

اس نے ایک غلطی یہ بھی کی کہ انگوٹھی اور ڈائری جو نہایت اہم برآمد شدہ اشیاء تھیں، اس نے اپنی جیب میں رکھی ہوئی تھیں۔

اس کے پاس ان لفظوں کا جواز تھا۔ وہ یہ کہ مہین نے اسے کاغذ کی پرچی پر کوئی ایسا نام لکھ دیا تھا شاید اونچے طبقے کا آدمی تھا یا شاید کوئی اعلیٰ افسر تھا۔ یا پولیس کا ہی کوئی افسر تھا۔ خالد اسے ریکارڈ پر سے جھک رہا تھا۔ اسے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ مہین نے جو کہ پرچی لکھی ہے وہ صحیح ہے۔ خالد کو یہ بھی آیا کہ اگر واردات میں کوئی بڑا آدمی شامل ہے تو اس کے ساتھ سودا بازی کر کے جیب گرم کی جا سکتی ہے۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس نے جو کچھ بھی سوچا، وہ ڈاواں ڈول ضرور ہو گیا تھا چکرا بھی گیا تھا۔ اور ایسے ہی کچھ حالات ہو گئے تھے کہ وہ بھیانک غلطی کر بیٹھا اور اب اس کی سزا شروع ہو چکی تھی — وہ فرار کے طریقے کے لیے بیٹھ گیا۔

رات گزر گئی۔ دن بھی گزر گیا۔ انسپکٹر خالد نظر نہ آیا۔ تھانے والوں کو اس کے متعلق تشویش ہونے لگی۔ کار دار سے پوچھا۔ نیلوفر سے پتہ کرایا۔ مجنی اور مجلوں پر جا کے دیکھا۔ اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ گاؤں میں جا کے دیکھا۔ وہاں کے لوگوں نے دو روز پہلے کی خبر سنائی کہ وہ وہاں گیا تھا۔ ساجی نے بتایا کہ اس نے اسے آخری بار بازار میں دیکھا تھا جب وہ اس کے ساتھ سیمین سیٹھ کی دکان میں گئی تھی۔ اجو دلا بھی ساتھ تھا۔

تھانے والوں کے لیے یہ انکشاف نیا تھا کہ ان کا تھانیدار ان دونوں کو ساتھ لے کر کسی سیمین میں گیا تھا۔ کیوں گیا تھا — اس کا جواب ساجی نے دیا کہ جو انگوٹھی جمیل کی انگلی سے اتاری گئی تھی ساجی نے اس سیمین سے خریدی تھی۔ ساجی کے سامنے خالد اور سیمین کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں اس نے خالد کے اسے۔ ایس۔ آئی کو بتائیں۔

پولیس والے اجو اور ساجی کو ساتھ لے کر سیمین کی دکان پر گئے مگر دکان بند پائی۔ سیمین کے گھر کیا گیا۔ گھر تھے تو اس کے گھر والوں نے بتایا کہ وہ دو روز سے غائب ہے۔ دکان پر گیا تھا پھر لوٹ نہیں آیا۔ مجسٹریٹ کو ساتھ لے جا کر دکان کا تالا توڑا گیا۔ کونے کھدرے کی تلاشی لی گئی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ نے دکان بند کر کے سیل کر دی۔

ہیڈ کانسٹیبل کو تاسف یہ تھا کہ انسپکٹر خالد ایک آدمی کے ساتھ باہر نکل گیا تھا پھر پولیس نہیں آیا۔ سے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون تھا اور اس کا نام کیا تھا۔ اسے صرف حلیہ یاد تھا جو اس نے بتا دیا۔

ساری نگری میں رازی کی تلاش کی گئی۔ چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں دیکھا گیا لیکن اس حلیے کا کوئی نہ ملا۔ ڈاک خانے سے چوکی والے ذیلی کانسٹیبل نے بتایا کہ خالد کو اس نے اس آدمی کے ساتھ موٹر سائیکل جاتے دیکھا تھا لیکن موٹر سائیکل کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔

ایک اور رات، ایک اور دن گزر گیا۔ پولیس والوں کو یقین ہو نے لگا کہ انسپکٹر خالد کو بھی اور سیمین انگوٹھی کی وجہ سے اغوا کر لیا گیا ہے اب یہ کیس تھانے کے بس سے نکل گیا تھا۔ اسے۔ ایس۔ آئی — راولپنڈی پولیس کو ٹیلیفون پر اطلاع دے دی۔ لگے ہی۔ ڈی۔ آئی۔ اے کے دو انسپکٹر پہنچ گئے جنہوں کیس اپنے ہاتھ میں لے کر از سر نو تحقیقات شروع کر دی۔

نیلوفر کو کئی بار سنائی ہوئی کہانی پھر سے سنانی پڑی اور کار دار کا زیادہ تر وقت پولیس والوں کے ۔ گزرنے لگا۔ نگری کے دس بیس بدمعاش، عادی مجرموں اور جانے پہچانے چہروں کی نئے سر

سے شامت آ گئی۔ ان انسپکٹروں کے دل میں ذرہ بھر رحم نہ تھا۔ وہ سربراہ اذیت اور تشدد کی زبان میں کرتے تھے۔ ان کے نام راستوں پر سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی متعین کر دیئے گئے اور مال روڈ کی گہما گہمی میں مجرموں اور سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمیوں کا ایک مجموعہ بنا دیا گیا لیکن نئے سٹاف کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ کیس کی تمام کڑیاں گم ہو چکی تھیں۔ نہ انسپکٹر خالد تھا نہ ہمیں جمیل تھا نہ انگوٹھی۔ لے دے کے ساجی رہ گئی تھی جو جمیل والوں کے لیے سب سے زیادہ کمزور کڑی تھی۔ نیلوفر کو علم ہی نہیں تھا کہ اس نے آفتاب کی جو تصویر بیان کی تھی وہ ساجی نے جمیل کو دی تھی اور وہ کسی دکاندار سے خریدی گئی تھی۔ کاروار کو بھی انگوٹھی متعلق اتنا ہی علم تھا جتنا نیلوفر کو۔

اجو اور ساجی کا گاؤں ایک بار پھر پولیس کے جگولوں کی زد میں آ گیا۔ سی۔ سی۔ آئی۔ اے کے انسپکٹر اور ان سٹاف طوفان کی طرح جاتے اور گاؤں والوں کا دم خشک کر کے لوٹ آتے تھے۔ اجو دلا صدمے سے ہلکا ہوا جا رہا تھا۔ اسے اپنی جوان پوتی کی عزت کا شدید فکر لگا رہتا تھا۔ آئے دن اسے پولیس والے اپنے ساتھ لیے پھرتے رہتے تھے۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ پولیس والوں کو اتنی ہوش بھی کہاں تھی کہ وہ ساجی سے کھل کھیلنے لگتے۔ انہیں تو اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ ڈی۔ آئی۔ جی دن میں ایک بار ٹیلیفون پر ان سے تحقیقات کے متعلق ضرور پوچھتا تھا۔ وہ راولپنڈی میں بیٹھا ان کے لیے آفت بن گیا تھا۔

ساجی کے متعلق وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ وہ سادہ سی بیٹان ہے اور بے ضرر۔ اجو دلا کے آنسوؤں اور چیخوں نے بھی ان پر گہرا اثر کیا تھا۔ انسپکٹروں نے اسے بارہا یقین دلایا تھا کہ ساجی اس کی اپنی بچی ہے خود ساجی نے اسے کہا تھا کہ یہ لوگ بڑے نہیں اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن دادا اکثر روتا ہی رہتا تھا۔

ساجی کے دل سے پولیس کا خوف نکل گیا۔ اسے اب صرف جمیل کا غم تھا۔ وہ اب بھی ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتی تھی جیسے جمیل نے رسیے سے دستک دی ہو۔ وہ تو اسے خوابوں میں سینکل کرنے لگا تھا۔

جمیل ساجی کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ دونوں کے درمیان جذباتی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا تعلق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماند پڑنا جانتے ہے جمیل کو کسی وقت دل سے اتار دینا ساجی کے لیے مشکل نہیں تھا۔ مشکل نیلوفر پر آ پڑی تھی۔ اس کا مسئلہ اجاگر کیا تھا۔ آفتاب اس کا صرف خاوند ہی نہیں تھا، وہ ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔

نیلوفر اب اس خود فریبی پر زندہ تھی کہ آفتاب قتل نہیں ہوا حالانکہ انسپکٹر خالد بھی اور کار دار بھی اسے پورے وثوق کے ساتھ کہہ چکے تھے کہ آفتاب قتل ہو گیا ہے۔ اس نے اس اتنا تلخ حقیقت کو کسی حد تک قبول کر بھی لیا تھا مگر جمیل کی ماں کی باتیں سن کر اس نے فوراً اس حقیقت کو اگل دیا کہ آفتاب قتل ہو چکا ہے۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پھر اسے قرآن نے سہارا دیا۔ جمیل کی ماں بازار سے قرآن لے آئی تھی۔ نیلوفر قرآن پڑھنا نہیں تھی۔ اسے نماز بھی نہیں آتی تھی لیکن وہ آخر مسلمان تھی، اس نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا تھا لیکن اسے یہ تو یقین تھا کہ وہ مسلمان تھے۔ اس لئے جوں ہی قرآن اور نماز کا نام آتا اسے ایسا سکون محسوس ہونے لگتا ڈوبتے وقت اسے کسی نے سہارا دے دیا ہو۔ اسے اس سے ندامت محسوس ہوتی تھی کہ وہ نہ قرآن سکتی ہے نہ نماز۔

جمیل کی ماں کے آنے سے پہلے اس کا معمول یہ تھا کہ سورج نکلنے کے بعد اس کی آنکھ کھلتی تھی وہ پہلا کام یہ کرتی تھی کہ بیٹی کو پیتی تھی۔ پھر سوچتی تھی کہ اسے ابھی بستر سے نکلنا چاہیئے یا نہیں۔ گھر میں ڈوا اور آفتاب کے اعوا کے بعد تو اس کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ رات بہت دیر تک جاگتی اور بے چین رہتی تھی اور وہ سرے سے دن اکثر ایسے ہوتا کہ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت اس کی آنکھ کھلتی اور اس کا دل غم کی گرفت میں جکڑا ہوا ہوتا تھا۔

اب اس کے گھر میں یہ انقلاب آیا کہ صبح کا دھندلکا ابھی چھٹا نہیں تھا کہ دھیمی دھیمی مترنم نسوانی آواز سے اس کی آنکھ کھلتی تھی۔ وہ اس آواز میں تقدس محسوس کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ساتھ والے کمرے میں اس کی نئی نوکرانی قرآن کی تلاوت کر رہی ہے لیکن اسے یہ آواز کسی ایسی عورت کی لگتی تھی جو ان پڑھ ہو نہیں ہو سکتی تھی، یہ آسمانوں کی آواز تھی۔

یہ آواز اور اس کی موسیقی اس کے دل کو ہلکا ہلکا کر دیتی تھی۔ اس کا دل پہلے کی طرح غم کے میں جکڑا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ایسے لگتا جیسے وہ نہیں سمجھتی کیا ہے، اسے رہی ہے اور یہ سہارا جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

نیلوفر اٹھتی، غسل خانے میں جاتی، نہاتی اور نئی نوکرانی جس کے متعلق اسے معلوم نہیں تھا کہ کے خاوند کے قاتل کی ماں ہے، کے پاس جا بیٹھتی جمیل کی ماں قرآن بند کر کے نیلوفر کے سر سے تک پھونک مارتی اور تسبیح اس کے سر اور منہ پر پھیر دیتی تھی۔ پھر وہ نیلوفر کو ناز پڑھاتی پھر قرآن کا سبق دیتی۔ وہ نیلوفر کی نجات کے لیے ہزارات اس کے پلنگ کے گرد گھومتے ہوئے سورہ منزل کا کیا کرتی تھی۔

"بیٹی!" — ایک روز اس نے کہا تھا — "میں نے تیرے سہاگ کے لیے زندہ پیر کے مزار تین روپے کا نذرانہ مان رکھا ہے اور سوا روپے کا اپنے بیٹے کے لیے۔"

نیلوفر کی بے بسی اور غم زدگی کی انتہا تھی کہ اسے جمیل کی یہ باتیں اور عقیدے اونگھی سی روحانی قوت دینے لگے۔

ایک شام نیلوفر نے اسے کہا — "جی چاہتا ہے ان پکی سڑکوں سے ہٹ کر دور جنگل میں نکل جاؤں۔۔۔"

وہ ساتھ چلو ماں آؤ ذرا لکھوم آئیں۔"

جمیل کی ماں پہاڑی نشیب و فراز سے واقف تھی۔ وہ نیلوفر کو قریب ہی ایک پہاڑی راستے پر لے گئی۔ یہ راہ ذرا اوپر جا کر ایک ڈھلانی میدان میں اترتی تھی، جہاں ناشپاتیوں اور جنگلی اخروٹوں کے گھنے جھنڈ تھے اور ارد گرد بلند ہی پر جیل چیڑ کے سال سال کر تے پیڑ کھڑے تھے۔ نیچے گھاس کا سبزہ زار تھا، وہیں سے سامنے ایک جھرنا گرتا نظر آتا تھا جس کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آواز فضاؤں کے پیچ کھیچ پیدا اپنا راگ الاپ رہے تھے اور یہ ساری آوازیں ایک سی مترنل اور ایک سی راگ پر منتظم تھیں۔ نیلوفر نے یہ آواز پہلے سنی تو تھی لیکن قدرت کی نغمگی سنی تو اسے یوں قرار آنے لگا جیسے اس کی روح جو رہ گئی تھی نئی زندگی لے کے جی اٹھی ہے۔ اس پر وجد طاری ہونے لگا۔ بے خودی اور خود فراموشی سی!

"جی چاہتا ہے اور دور نکل جاؤں" — اس نے مخمور سی ہنسی ہنس کر کہا۔

"نہ بیٹی!" — جمیل کی ماں نے کہا — "تھک جاؤ گی۔ ان چیڑ بیے پہاڑوں پر تم بھلا کیسے چل سکو گی۔۔۔ آؤ چلیں، شام ہو رہی ہے۔"

شادی سے پہلے وہ اکل کار۔ دار کے ساتھ اور شادی کے بعد آفتاب کے ساتھ مری آیا کرتی تھی۔ وہ کار میں آتی اور کار میں ہی سیر کو نکلتی تھی۔ کبھی پیدل گئی بھی تو نچوڑ دو جا کر لوٹ آیا کرتی تھی۔ اس کی سیر میں تھکن نہ ہوتی تھی۔ تھا جس کے سخت دیہی محسوس کرتی تھی جیسے یہ پہاڑ اور جنگل اسے یہ پڑاس کی تفریح کے لیے بنائے گئے کیے گئے ہوں۔

اس روز وہ اپنی مصنوعی دنیا سے اتنا دور ایک پہاڑن کے ساتھ سیر کو نکلی اور یہ پہاڑن اپنے انداز سے سیدھی سادی باتیں کرتی تھی نوبلوفر کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے یہ قیمتی کپڑے اتار کر پہاڑیوں جیسا سے کپڑے کا لباس پہنا دیا ہو۔ اس نے اپنی چال میں بھی تبدیلی محسوس کی۔

وہ واپس نہیں آنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے خیالوں میں جو انقلاب آگیا تھا اس میں وہ روحانی قرار محسوس خود بھی تھی جمیل کی ماں کے ساتھ وہ واپس آگئی اور اس رات نیند سے پہلے اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا جیسے وہ اس کل پش وادیوں اور باش سے، جھیلے اور نکلتے چشموں میں جنی پلی ہے وہ اپنے گھر لوٹ جانا ہے۔

جمیل کی ماں روزمرہ کی طرح اس کے کمرے میں سورہ منزل پڑھنے آئی اور پڑھ چکی تو نیلوفر نے اسے بٹھا لیا۔ وہ تالیں بیٹھی تو نیلوفر نے اسے ایک کمر بند سے پکڑا اور اٹھا کر پلنگ پر بٹھایا۔

"مقدس بستر سے۔ قرآن، نماز اور دعائیں مجھے یہ سی خوشیاں نوازیں گی؟" — اس نے جمیل کی ماں سے

www.paksociety.com
Scanned by Muhammad Azeem Paksitanipoint

سوال کیا۔

جمیل کی ماں نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا۔ سر کے اشارے سے کہا۔ "ہاں" اور شہادت کی انگلی آسمان کی طرف کردی۔ وہ اٹھی۔ تسبیح نیلوفر کے سر اور منہ پر پھیری، اور مسکرا کر باہر نکل گئی۔

نیلوفر کو اگر کوئی عالمہ فاضلہ وعظ سناتا تو شاید اس پر یہ اثر نہ ہوتا جو جمیل کی ماں کے سر اور خدا کی طرف اٹھی ہوئی شہادت کی انگلی کے اشارے سے ہوا۔ اور جمیل کی ماں کی مسکراہٹ میں جو تاثر تھا۔ وہ اس کی روح تک اتر گیا جیسے خدا نے اسے وعدہ دے دیا ہو کہ تیری خوشیاں تجھے لوٹا دی جائیں گی۔

دوسرے روز کاروار نیلوفر کے ہاں آگیا۔ اس کے ساتھ ارشد تھا جو راولپنڈی سے اس کے ساتھ آیا تھا اور کاروار نے نیلوفر سے متعارف کرایا تھا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا نیلوفر کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے دوران ارشد نیلوفر میں گہری دلچسپی لیتا رہا اور اس کے ساتھ وہ تنہا نہ بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ کچھ تو وہ خوش گلو اور شگفتہ مزاج تھا اور کچھ کاروار اسے نیلوفر کے سامنے یوں پیش کر رہا تھا جیسے وہ جہاں کی بادشاہی کا صحیح وارث ارشد ہی ہے۔ مگر نیلوفر کو اب ان باتوں اور اس انداز سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کاروار کی خاطر برداشت کرتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ارشد تو چلا گیا۔ کاروار وہیں رہا اور اس نے نیلوفر کے ساتھ اس کے مستقبل کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ اس نے نیلوفر کو طویل داستان سنادی کہ اس نے کس طرح اسے پالا ہے۔ اس کی خاطر شادی نہیں کی اور اپنے کاروبار کی طرف بھی پوری توجہ نہ دے سکا۔ آفتاب کے ساتھ اس کی شادی کر کے اپنے کاروبار میں جس قدر تصرف ہو گیا تھا مگر اس حادثے نے وہی بوجھ پھر اس کے کندھوں پر چھین لیا ہے۔

"تم جانتی ہو نیلو! میں احسان نہیں جتا رہا۔ میرا مطلب یہ ہے۔۔۔" اس نے کہا۔ "کہ میرا کاروبار ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ ادھر ہتھیں میں جن کی طرف توجہ نہ دوں تو فصل مزارعے کھا جاتے ہیں مگر آج کے یوں اٹھ جانے سے میں پھر اپنی زنجیروں میں بندھ گیا ہوں جن سے میں آزاد ہو گیا تھا۔" اس نے آہ بھری اور بولا۔ "نیلو! تمہیں جو چوٹ لگی ہے اس کا درد تمہارے سوا اور کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ میں ہوں جو تمہارا وہ مونس اور غم خوار ہوں۔"

نیلوفر کو یہ احساس تو تھا نہ رہا ہی اس کا واحد مونس و غمخوار ہے لیکن آفتاب کے قتل کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسے پاس بٹھا کر ہمدردی کی اتنی زیادہ باتیں کر رہا تھا۔

"نیلو بیٹی!" ۔۔۔ کاروار ڈھیلے سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے مری سے چلے جانا چاہیے کیونکہ اطلاعیں مل چکی ہیں کہ میری غیر حاضری کاروبار کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ مجھے اب لاہور، منٹگمری، کراچی کوئٹہ اور جانے کہاں کہاں جانا پڑے گا۔ ورنہ کاروبار پر وہ زد پڑے گی کہ سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔ میں تمہیں

نہیں لیے پھروں گا نیلو! اور اب میں تمہیں یہاں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔ اس لیے اگر میری ساس ہی اور بھی تو نہیں جانتا تھا کہ کیوں اور کوئی چارہ کار نہیں۔۔۔ تم اور سسری شادی کر لو نیلو!"

"شادی؟" ۔۔۔ نیلوفر نے چونک کر کہا۔

"ہاں نیلو! شادی؟" ۔۔۔ کاروار نے خود اعتمادی سے کہا۔ "ارشد میرا پرانا دوست ہے جس اسے تمہارے لیے یہاں لایا ہوں۔ شادی میں زیادہ دیر نہ ہو اور میں فارغ ہو جاؤں۔"

"انکل" ۔۔۔ نیلوفر حیرت زدہ ہو کے بولی۔ "کل ایک سرا ہے آج دوسرے کے ساتھ شادی کر لوں؟ دنیا مجھے کیا کہے گی انکل!"

"دنیا کسی کو اچھا نہیں کہا کرتی نیلو!" ۔۔۔ کاروار نے کہا۔ "میں دنیا کی پرواہ کرنے والا نہیں اور میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تم دنیا کی نہیں ہو۔ ایسی دیہات کے گنوار لوگ کیا کرتے ہیں کہ دنیا کیا کہنے گی۔ ہماری سوسائٹی میں جو ہوتا ہے وہ دنیا کی پرواہ کے بغیر کیا جاتا ہے۔" ۔۔۔ اس نے نیلوفر کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں تمہیں جذبات اور سوسائٹی کے بے بنیاد خدشوں سے نکال کر حقیقی دنیا میں لانا چاہتا ہوں۔ مجھ پر کرم ہو اور اپنے آپ پر بھی ترس کھاؤ۔ میں چاہتا ہوں بلکہ یہ حقائق کا تقاضا ہے کہ تم اپنا گھر بسا لو اور میں بے فکر ہو کر اپنے کام دھندے میں لگ جاؤں، بہت نقصان ہو رہا ہے۔"

"تو آپ چلے جائیے نا انکل!" ۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ "مجھے آپ کی مصروفیات کا خود بھی بہت خیال ہے۔ میں تو میری فکر کیوں کرتے ہیں انکل۔ دلوں کی بھی تو نہیں۔" ۔۔۔ اس کی آواز دب سی گئی بولی۔ "ابھی تو آفتاب صاحب کی لاش بھی نہیں ملی۔ پھر بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں زندہ ہی ہوں۔"

"اپنے آپ کو دھوکہ دینے والی بات ہے نیلو!" ۔۔۔ کاروار نے پیار بھری ترشی سے کہا۔ "آفتاب ڈوب چکا ہے۔ شہادت اور ثبوت مل چکا ہے۔ وہ اب زندہ دلوت کے نہیں آسکے گا۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے ابھی بیس برس کی بھی ہو میں تمہیں اسی عمر میں ہو گئی ہوں۔ میں کڑھتے سڑتے تو نہیں دیکھ سکوں گا۔۔۔ میری بات مانو نیلو! میں چپکے سے شادی کا دعوت کر دیتا ہوں۔ تم دونوں کراچی چلے جانا۔"

"انکل!" ۔۔۔ نیلوفر کا سر جھک گیا۔ "پھر اس نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "آپ کی سہولت سمجھتے ہوئے میں بھی سمجھ نہیں آتی کہ جس خاوند کی میں نے اپنی اپنے ہاتھوں دفن بھی نہیں کیا۔ اسے بھلا کر دوسرا بیاہ لیے چلوں۔"

"سوچ لو نیلو!" ۔۔۔ کاروار نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میری ساری باتیں پیش نظر رکھنا اور یہ نہ بھولنا کہ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا اور اپنے ساتھ لیے لیے بھی نہیں پھر سکتا۔"

اور وہ باہر نکل گیا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نیلوفر بیٹھی اسی خلا میں گھور رہی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے کادار بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دل پر یوں ہول طاری ہونے لگا جیسے کادار اسے اندھے کنوئیں میں دھکیل گیا ہو۔ اسے یہ وہم بھی ہو رہا تھا جیسے اس نے خواب دیکھا مگر اسے جلدی احساس ہو گیا کہ یہ خواب نہیں تھا۔ اس کے گرد اُنکل کادار کی باتیں بھڑوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے آفتاب زندہ ہے اور ایک دو روز میں لوٹ آئے گا۔

اسے دکھ ہوا اور غصہ بھی آیا کہ اس کا اُنکل جذبات سے کس قدر عاری ہے۔ وہ اس کا بوجھ سر سے اتارنا نہیں پھینکنا چاہتا ہے۔ آفتاب کی زوجیت میں اس نے چھ ہی مہینے گزارے تھے۔ اس قدر قلیل مدت جیسے شب عروسی کے پھول بھی ابھی نہیں مرجھائے تھے۔

اس کے ذہن میں کادار کی باتیں اور اپنے جذبات متصادم ہونے لگے اور اس کی سوچ و فکر اس تصادم میں پلنے لگی۔ وہ اوندھے منہ صوفے پر گری اور ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

جانے کتنی دیر گزری ہوگی کہ اس نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ اس نے اٹھا کے دیکھا۔ جمیل کی ماں اس پر جھکی ہوئی تھی۔

"کیوں بیٹی؟" ماں نے اس کے گال تھام کر کہا۔ "پھر وہی بات؟"

جمیل کی ماں ہی تو تھی جو اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اب اس جانکاہ تنہائی اور روح کش صورت حال میں جب اس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری تھی جمیل کی ماں کے ہاتھ کے لمس نے اسے ڈوبنے سے بچا لیا۔ کون تھا جیسے وہ بیٹھے کے انگارے دکھاتی؟ کادار تو اپنی سنا کے چلا گیا تھا اور وہ نیلوفر کے جذبات سمجھنے پرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

نیلوفر نے بیٹھی جمیل کی ماں سے اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے اور نیلوفر نے وہ ساری باتیں اسے کہہ سنائیں جو اسے کادار کہہ گیا تھا۔

"بیٹی!" نہ ۔۔۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور حیرت زدہ لہجے میں بولی ۔۔ "مر جانا مگر ایک شادی پر دوسری شادی نہ کرنا۔۔۔ اور بیٹی!" اس نے رازداری سے پوچھا ۔۔ "تمہاری اپنی کوئی جائیداد یا سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں؟ تم اب بھی اپنے چچا کی محتاج ہو؟"

"ہیں تو۔" نیلوفر نے یوں کہا جیسے اس کی ڈھارس بندھ گئی ہو بولی ۔۔ "ہماری اپنی ایک کوٹھی ہے میں کرائے پر چڑھی ہوئی ہے۔ اپنی ایک کوٹھی الگ ہے۔ یہ کوٹھی بھی اپنی ہے یہ سب جائیداد میری ہے۔ تو ان کا کرایہ ہی بہت ہے۔ بنک میں بھی روپیہ جمع ہے۔"

پہاڑوں کی آنکھیں اور منہ کھل گیا۔ اس قدر جائیداد؟ وہ نیلوفر کو یوں تکنے لگی جیسے زمین پر اسی لڑکی بادشاہی ہو۔ اس نے تسبیح لپیٹ کر مٹھی میں دبا لی۔

"بس بیٹی! یہ کیا غم ہے! تو تو محلوں کی رانی ہے۔ تجھے کسی کی کیا محتاجی ۔۔" اس نے لو کھلائے ہوئے

سے بھیج میں کہا ۔۔ "اونسو۔ پونچھے تانے کسی کے بھی نہیں ہوتے۔ وہ اب مسیں کوری سیں اٹھائے گا اب تجھے کند چھری سے اتار تا کر بھینک رہا ہے۔ صاف کہہ دو بیٹی! میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔ جب جی چاہے گی نکاح کروں گی۔"

وہ فرش پر بیٹھ گئی اور مٹھی کھول کر ایک نظر تسبیح کو دیکھ کر بولی ۔۔ "سن بیٹی! میں تیرے جتنی جوان تھی جب میرا خاوند ایک طوفانی رات اولولہاں ہو کر مر گیا تھا۔ ایک بچہ اور ایک پیٹ ساتھ تھے۔ خاوند کو موت اٹھا لے گئی۔ بیٹی کو انسان اٹھا لے گئے۔"

"کون اٹھا لے گئے؟" ۔۔ نیلوفر نے چونک کر پوچھا۔

"بتاؤ بیٹی!" ۔۔ جمیل کی ماں کے آنسو نکل آئے۔ اس نے دکھ زدہ الفاظ میں کہا ۔۔ "میں تو بھول جانا چاہتی ہوں کہ یہ کیا ہوا تھا۔ میں کہہ رہی تھی میرا خاوند مرا تو مردوں نے میرا جینا حرام کر دیا۔ کوئی منت کرتا تھا۔ کوئی ڈراتا تھا۔ کوئی مزدوری کے لالچ دیتا تھا۔ بندہ بندے سے ڈرا تا تھا۔ بیٹی! ہر جب بھی شادی کی سوچی یوں لگا جیسے میرا خاوند مرا نہیں کل پرسوں واپس آ جائے گا۔ اس عمر کو آگئی ہوں بیٹی! دل نے ایک بار بھی نہ چاہا کہ شادی دوسری کروں۔ تو قصہ سنی ہوا ہے بیٹی! اگر بن جائے تیرا خاوند زندہ ہی ہو۔ اللہ کرے وہ زندہ ہو اور میری بیٹی کا سہاگ ہرا ہو جائے۔۔۔ میں تو غریب تھی جب بھی شادی نہ کی۔ تم تو حسن والی ہو۔"

اور جمیل کی ماں نے کچھ ایسا تاثر پیدا کر دیا کہ نیلوفر کے جذبات میں بگولے اٹھنے لگے۔ احساسات میں طوفان بپا ہونے لگے۔ جذبات اور احساسات کا طوفان اس کی ذہنی کیفیت میں بیدار کر گیا اور اس نے محسوس کیا کہ اب اُنکل نے شادی کا مسئلہ اٹھا لیا تو وہ اُنکار نہ دے گی۔ اسے محسوس ہونے لگا اُنکل نے اس سے ساتھ ہمدردی کی باتیں نہیں کی تھیں بلکہ اس کے آنگن میں انگارے بکھیر کر اسے انگاروں پر چھینک دیا ہے۔ جمیل کی ماں نے مٹھی کھول کر تسبیح کو دیکھا، اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے تسبیح پر پھونک ماری پھر تسبیح کے دانوں کے دانوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے چلانے لگی ۔۔ ایک دانہ ادھر ایک ادھر۔ تین دانے رہ گئے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"شادی نہ کرنا بیٹی!" ۔۔ اس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے غیب کی آواز کو دہرا رہا ہو۔ "تسبیح کے تین دانے! میرے شوہر نے کہا تھا کہ تسبیح کے مرکزی حصے کے جو تھے دانے کے بعد تین دانے ہاتھ آئیں تو خواجہ خضر علیہ السلام آ کر چھ سات سو فرلانگ کو ایک ہی منزل پر لے آتے ہیں۔ تم دھن والی ہو بیٹی! بڑھ کر یہ باتیں جھوٹی جھوٹی سی لگتی ہیں۔ پر دل میں رسول خدا کی محبت ہو تو تسبیح کے دانے جھوٹ نہیں بولتے۔۔۔ بیٹی! تم محلوں کی رانی ہو۔ رانی ہی رہو گی۔"

نیلوفر پر رقت سی طاری ہو گئی اور اسے یوں لگا جیسے کسی عظیم قوت نے اس پر سایہ کر لیا ہو اور اسے یہ حوصلہ اور استقلال دے دیا ہو۔ اس نے شدت سے چاہا کہ جمیل کی ماں اسی لب و لہجے میں یہی باتیں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جمیل کو چھین لے چلی ہو۔

"جب تک یہاں ٹیوں تمہیں قرار ہوں گا"

"مجھے اپنا ٹھکانہ بتادو میں وہاں آجایا کروں گی"

"نہیں ساجی!"۔۔۔ جمیل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔ "یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے تم نہ آنا"

"تم کرو"۔۔۔ ساجی نے کہا۔۔۔ "بھاگ کے ستمارے لیے مکھن اور روٹیاں لے آتی ہوں"

جلدی آجاؤں گی کسی کو خبر نہ ہوگی"۔۔۔ اور وہ جمیل کے جواب کا انتظار کیے بغیر چل پڑی۔

"دیکھو ساجی!"۔۔۔ جمیل نے کہا۔۔۔ "ایک ماچس اور دیا لیتی آنا"

"موم بتیاں لے آؤں؟"۔۔۔ ساجی نے کہا۔۔۔ "میں نے گھر میں چار پانچ رکھی ہوئی ہیں"

"وہی لے آنا"

اور ساجی دوڑ پڑی۔

اس کے جانے کے بعد جمیل جھاڑیوں میں چھپتا باہر نکلا۔ اس کی گھوڑی ذرا پرے چر رہی تھی جمیل نے وسل بجائی تو گھوڑی نے سر اٹھا کے کان کھڑے کر لیے جمیل نے پھر وسل بجائی اور بولا "ہٹکی"!

گھوڑی آہستہ آہستہ اس طرف چل دی جدھر سے آواز آتی تھی جمیل اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ پہنچی تو اس نے جمیل کو دیکھ لیا۔ وہ بے تاب ہو کر اتی جمیل نے بیٹھے بیٹھے منہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ گھوڑی نے کھڑے کھڑے اور دھیمے دھیمے ہنہنانے لگی۔ وہ جمیل کی بلائیں لے رہی تھیں اور اس کے ساتھ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے وہ بہت سمجھ رہی ہو۔ یہ گھوڑی اس کے بچپن کی ساتھی جھاڑیوں میں سر سراہٹ ہوتی، شاید کوئی ٹیٹر پھڑپھڑا کر اڑا تھا جمیل سرک کے اوٹ میں ہو گیا۔ گھوڑی بھی اس کے پاس جا رکی اور جھک کر منہ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

بہت دیر گزر گئی۔ جمیل اور گھوڑی جدائی کے زخم سہلاتے رہے۔ ساجی صبح کی بچی ہوئی سوکھی کی روٹی پر بہت سا مکھن رکھ کے لے آئی اور گڑوی میں سیر بھر دودھ بھی اٹھا لائی۔ جمیل کو بہت دنوں کے بعد کھانا ملا تو اس نے پیٹ بھر کر کھایا اور اسے اونگھ آنے لگی۔

"میں سو جاؤں"۔۔۔ ساجی بولی۔۔۔ "میں پرے چلی جاتی ہوں۔ یہاں کوئی نہیں آتے گا"

"کوئی آئے تو آہستہ سے کھانس دینا"۔۔۔ جمیل نے کہا اور لیٹ گیا۔

ساجی اوٹ سے باہر نکل تو جمیل کی آنکھ لگ گئی لیکن گھوڑی بار بار کھر مارتی تھی اور جمیل کی ذات آتی تھی اور ساجی اسے گھسیٹ گھسیٹ کر پرے کر رہی تھی۔ گھوڑی نے چرنا ہی چھوڑ دیا اور ایک ساجی سے رستہ چھڑا کر جھاڑیوں میں گھس گئی اور سوتے سوتے جمیل کو سونگھنے لگی۔ جمیل کی آنکھ کھل گئی۔ ساجی نے اسے بتایا کہ گھوڑی پرے ہنستی ہی نہیں۔

چھوڑ دو اسے خود ہی ہٹ جائے گی اور وہ پھر سو گیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی گھوڑی پرے چلی گئی تھی۔ ساجی جمیل کے پاس آ بیٹھی اور اس سے پوچھا۔ "تم ڈاکو ہو جمیل؟ ..... قاتل ہو؟ سچ بتاؤ۔ تمہیں اللہ کی قسم!"

جمیل نے اس کا شک رفع کرنے کی پوری کوشش کی اور بتایا کہ وہ اس کی عزت کی خاطر حوالات سے بھاگا ہے۔

"مگر اب تو پتہ چل گیا ہے کہ انگوٹھی کہاں سے آئی تھی"۔۔۔ ساجی نے کہا۔

"تم نہیں جانتی ساجی!"۔۔۔ جمیل نے کہا۔۔۔ "خطرہ ابھی ٹلا نہیں"

"کہاں چھپے رہتے ہو؟"۔۔۔ ساجی نے پوچھا۔

جمیل نے اسے بتا دیا۔

"اس چھوٹی سی ندی کے کنارے شاہ ٹبر طرط کا پیڑ ہے"۔۔۔ جمیل نے اسے کہا۔۔۔ "وہیں کھڑے ہو کر وہ پتھر بجایا کریں گا..... لیکن ساجی! کیا کرو گی آ کے؟ نہ ہی آؤ تو اچھا ہے۔ اسی پہاڑ کے پیچھے ڈھلان اترو تو ذرا کھلا میدان ہے۔ اس کے ساتھ دو ٹیکریاں چڑھو تو مری کی کوٹھیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ کوئی آواز نہیں پھر بھی کوئی بھروسہ نہیں آتے جاتے کوئی دیکھ نہ لے"

جمیل وہاں سے چلنے لگا تو ساجی نے اس کے گال دونوں ہاتھوں میں تھام لیے جمیل نے اس کے ہاتھ ہٹا دیے اور بولا۔۔۔ "نہیں ساجی! مجھے ابھی ثبوت پر یہ ثابت کرنا ہے کہ میں ڈاکو اور بدمعاش نہیں"

وہ جس طرح گھنے جنگل سے نمودار ہوا تھا اسی طرح جنگل میں غائب ہو گیا اور ساجی کے آنسو بہہ نکلے۔

سی۔ آئی۔ اے کے دونوں انسپکٹر واردات کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش میں جم کر مصروف تھے۔ انہوں نے چند ایک مشتبہ آدمیوں کو تھانے بلا کر، ٹھوک بجا کر دیکھ لیا تھا لیکن انہیں سر سوا اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ مخبر اور سراغرساں ہر طرف پھیلے ہوئے جنگل کا سینہ چاک کر رہے تھے۔ انہیں اب یہ بھی یقین نہیں تھا کہ مجرم اسی جنگل میں ہیں۔ آفتاب کے خون آلود کپڑے تھانے میں پڑے تھے لیکن ہوش کا نشان تک نہیں ملا تھا۔ انسپکٹر خالد اور میں دو کان دار کو بھی جیسے مری کے پہاڑوں نے نگل لیا تھا۔ پاؤں کے نشان ملنے تھے نہ سوال ہی بن رہا۔ بارش ہر روز برس کر نقوش دھو ڈالتی تھی۔

چند آدمی اونچی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتے تھے اور چاروں طرف فضاؤں میں اڑتی چیلوں اور گدھوں کو دیکھتے رہتے تھے جہاں کہیں انہیں یہ مردار خور پرندے چکر میں اڑتے یا نیچے اترتے نظر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آتے۔ پولیس کے آدمی بھاگ کر وہاں پہنچتے تھے لیکن وہاں انہیں ہر بار مُردار ہی نظر آتا تھا۔ نہ آفتاب کی لاش ہوتی نہ انکپٹر خالد کی اور نہ نسمین کی۔ پہاڑی علاقے کے جنگلوں میں لاشوں کی نشاندہی جیلیں اور گدھ ہی کیا کرتے ہیں اور جب لوگ وہاں پہنچتے ہیں تو لاش کا کچھ ہی حصہ سچا ہُوا ملتا ہے۔

کاردار کے پیش نظر تو جیسے اب یہی ایک مقصد رہ گیا تھا کہ نیلوفر شادی کرے۔ اس نے ارشد کو نیلوفر کے اعصاب پر سوار کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی تھی۔ ارشد نے از خود بھی نیلوفر کے دل پر قبضہ کرنے کا ہر حربہ آزما دیکھا تھا لیکن نیلوفر نے اسے اپنے انکل کے دوست سے بڑھ کر کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

ارشد صبح ہی صبح آگیا اور بولا۔ "نیلو! آؤ تمہیں کہیں دور لے چلوں۔ کھانے پینے کے لیے ہوٹل۔ الائٹلا گاڑی میں ہم لہرا لیا ئیں۔ دور، اوپر کوہ تک چلتے ہیں۔ شام کو لوٹ آئیں گے۔ کاردار نے تمہیں پنڈی اور مری میں قید کر رکھا ہے۔ آؤ تمہیں زمین کی فردوس میں لے چلوں..... سچ کہتا ہوں نیلو! واپس نہ آنا چاہو گی۔"

"ارشد بھائی!" — نیلوفر نے ارشد کو بھائی مدد چوکا دیا۔ کہنے لگی — "میں زمین کی فردوس میں ہی تھی لیکن اس پر جہنم کا سایہ پڑ گیا ہے۔ جانے کیوں امید لگائے بیٹھی ہوں کہ چھٹنے ہو نے یہ سائے ڈھل جائیں گے اور میری جنت....."

"نیلو!" — ارشد نے اس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا۔ "جھوٹی امیدوں پر کب تک جیو گی؟..... شاید کاردار کو بھی تمہاری ذات سے اتنی دل چسپی نہیں جتنی مجھے ہے۔"

"ارشد بھائی! مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں کہ میری ذات سے کتنے زیادہ دل چسپی ہے۔" نیلوفر نے اداس سے لہجے میں کہا۔ "آپ کو برا تو لگے گا لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ بات صاف ہی کر دوں تو اچھا ہے..... انکل مجھے کہہ چکے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ شادی کر لوں لیکن میں دوسری شادی نہیں کروں گی۔"

"تم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ نہیں کیا نیلو!" — ارشد نے چوٹ کھائے ہُوئے لہجے میں کہا — "مجھے شادی سے نہیں تمہاری ذات اور تمہارے غموں سے دل چسپی ہے۔"

"اگر آپ کو میرے صدمے کا زہر بھی خیال ہوتا تو مجھے سیر و تفریح اور پکنک کی دعوتیں نہ دیتے۔ میں انکل سے کہہ دوں گی۔ آپ بھی کہہ دیں کہ میں شادی نہیں کروں گی۔"

ارشد سر جھکائے باہر نکل گیا۔

ارشد کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد کاردار آگیا۔ اس کے لب و لہجے اور رویے میں ترشی تھی جو باتیں کرتے بڑھنے لگی۔ نیلوفر ایسے سلوک کے لیے تیار نہیں تھی، اسے گمان تک نہ تھا کہ اس کا انکل نگرل

بھی ہو سکتا ہے۔

"تم نے ارشد کی توہین نہیں کی۔ مجھے بھی ذلیل کر دیا ہے" — کاردار نے کمرے میں تیزی سے چلتے پھرتے کہا۔ "تمہیں ذرا سا بھی احساس ہوتا کہ میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے تو تم مجھ پر قربان ہو جاتی۔"

"میں آپ پر قربان ہو سکتی ہوں اور ہو جاؤں گی" — نیلوفر نے رندھیائی ہُوئی آواز میں کہا۔ "لیکن ابھی شادی نہیں کروں گی" — وہ روہڑی اور سسکیاں لے کے بولی۔ "ابھی نہیں انکل! ابھی نہیں۔"

"تمہیں شادی کرنی پڑے گی" — کاردار نے تڑخ کر کہا۔ "مجھے دنیا میں کچھ اور بھی کرنا ہے۔ میں تمہارے ساتھ پابند نہیں رہ سکتا۔ تم مانو گی تو مجھے زبردستی کرنی پڑے گی۔"

نیلوفر یوں سہم گئی جیسے یہ شخص اس کا چچا نہیں جس نے اسے پالا پوسا تھا۔ یہ کوئی اور ہے جو اسے اپنی زر خرید لونڈی سمجھتا ہے۔ اس احساس نے اسے تڑپا دیا مگر اس کے آنسو تھم گئے۔

"اگر آپ زبردستی کا فیصلہ کر چکے ہیں تو مجھ سے پوچھنے کا مقصد؟" — نیلوفر پہلے ہی مجروح تھی، زخمی نہ کی طرح ٹوٹ پڑی — "زبردستی کر لیں۔ میرے خاوند کو کوئی زبردستی اٹھا لے گیا ہے۔ اب آپ مجھے زبردستی اٹھا کر کسی کے حوالے کر دیں۔ لیکن انکل! مجھے ابھی تنہا چھوڑ دیں۔"

"نیلو! عمر بھر کھجاؤ گی؟"

"عمر میں اور کیا بھی کیا ہے" — اس نے اداس سی بے رخی سے کہا اور کھڑکی کھول کر سامنے کی پہاڑی پر ایستادہ چیل کے گھنے پیڑوں کو دیکھنے لگی۔ پیڑوں کے سائے میں سپید سپید اور نیلے نیلے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ بہار کا عطر بیز جھونکا آیا اور نیلوفر کی پیشانی پر بکھرے ہوئے چند ایک بالوں کو بڑے پیار سے سہلا کر اُسے نیا حوصلہ دے گیا۔ وہ گھومی اور کاردار کا سامنا کرتے ہُوئے پختہ سی آواز میں بولی — "آپ مجھے اپنے آپ پر بوجھ نہ سمجھیں۔ میں اب آپ کی محتاج نہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے اس کا اجر آپ کو خدا دے گا اور میں عمر بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔ میں اپنے آپ کو اب سنبھال سکتی ہوں۔ میرے لیے آپ بلاوجہ پریشان ہُوئے جا رہے ہیں۔"

"اوہ!" — کاردار نے طنز لہجے میں کہا — "تمہارا دماغ اس قدر اونچا چلا گیا ہے؟..... نیلوفر!" — اس نے چیلنج کے انداز سے کہا — "تمہیں شاید احساس نہیں کہ میرے بغیر تمہاری کوئی ہستی نہیں۔ کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لوگ تمہیں صرف میری داشتگی سے جانتے پہچانتے ہیں۔ مجھ سے الگ ہو کر تم ایک بے آسرا بیوہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لوگ دو روز میں تمہیں آفتاب کی طرح گم کر دیں گے۔"

نیلوفر ایک بار پھر پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جیسے اس پر کاردار کی باتوں کا ذرہ بھر اثر نہ ہُوا ہو۔ کاردار اس کے رویے اور بے رخی سے جل اُٹھا۔

www.pakistanipoint.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"نیلوفر!" — کاروار عتاب آلود آواز میں بولا — "میں تمہیں صرف ایک دن کی مہلت دیتا ہوں۔"

نیلوفر تیزی سے گھومی لیکن کاروار تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے کس گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد جمیل کی ماں آ گئی۔

"تمہارا چچا بہت اونچی بول رہا تھا؟" — اس نے پوچھا — "کیوں؟"

"کہتا تھا شادی نہیں کروں گی تو میں زبردستی کروں گا۔" — نیلوفر نے دبی ہوئی آواز میں جیسے کہا — "میں اکیلی ہوں، وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔" — اور نیلوفر کو تنہائی اور کسمپرسی کا تلخ سا احساس ہونے لگا۔

"اماں" — اس نے لہجے میں اپنائیت کا رنگ بھر کے کہا — "تم اب چلے جانے کی نہ سوچو۔ شام کو بازار اور مال روڈ کا چکر لگا آیا کرو۔ تمہارا بیٹا کسی ہوٹل یا بیکری میں ملازم ہو گیا ہو گا۔ مل جاتے تو اسے بھی یہیں لے آؤ۔ میں اسے نوکری دے دوں گی لیکن تمہیں اب جانے نہیں دوں گی۔" — اس نے جمیل کی ماں کے گلے تھام کر پیار سے کہا — "تم اتنی اچھی ماں ہو..." اور اس کی آواز حلق میں ہی دب گئی۔

"چند روز اور تمہاری خدمت کروں گی بیٹی!" — جمیل کی ماں نے کہا — "بیٹا مل گیا تو اس سے پوچھوں گی۔ شاید وہ مان جائے۔"

نیلوفر کو کاروار کی ذات پر بھروسہ تھا۔ وہی اس کا سہارا تھا مگر یہ سہارا سرکتا نظر آ رہا تھا اور نیلوفر یوں رہ رہی تھی جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک رہی ہو۔ کاروار اس کے لیے سیلابی دریا کا کنارہ تھا کہ اسے کنارہ بھی ڈوبتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی بے چین اور پریشان تھی۔ نیند ہی نہ آتی۔ سینے میں گھٹن سی تھی جو بڑھ رہی تھی۔ وہ سونے کے کمرے میں لیٹی بہت کوشش کر رہی تھی۔ اس کی دو شادی کے متعلق کاروار کا فیصلہ اسے رہ رہ کے ڈس رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اسے زندہ دفن کر کے پر مقبرہ تعمیر کیا جا رہا ہے۔ تجربہ ہٹ میں اس قدر بڑھی کہ وہ اچھل کے بستر سے نکلی اور برآمدے میں نکل آئی۔ جمیل کی ماں برآمدے میں جا رہی تھی۔

"اماں!" — نیلوفر بولی — "میں ذرا گلوں پھر نہ آؤں؟..... دل اس قدر اداس ہے کہ کمرے میں بیٹھ نہیں جاتا۔"

"جاؤ نا بیٹا!" — ماں نے پیار سے کہا — "پر کہیں دور نہ نکل جانا۔ سڑک سڑک پر رہنا۔ کوئی پتہ نہیں، بارش آ جائے۔"

"اماں!" اس روز تم نے لستی کے ساتھ سکتی کی روٹی کھائی تھی۔" — نیلوفر نے اداس سی مسکراہٹ

"ہے بیٹی! برسے نے ٹھنڈی الماری میں دبی رکھی ہوئی ہے۔ لستی بھی بنا دوں گی۔"

وہ باہر نکل گئی۔ آبادی سے دو جا کر وہ سڑک سے ہٹ کر پہاڑی کے تنگ سے کھاؤ میں داخل ہو گئی۔ اس کے پاؤں تلے گیلے پتھر اور گھاس تھی اور اوپر چل کے پہاڑوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ پھول پتوں کی بھینی بھینی بو نے اس پر نشے کی سی کیفیت طاری کر دی۔ روح کے زخموں کی ٹیسیں تھم گئیں اور وہ اور تیز چلنے لگی۔ سامنے بادل کا پیچ سا ٹکڑا اس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ جب اس ٹکڑے نے اسے قریب تر پایا تو نم ناک آغوش میں چھپا لیا تو نیلوفر نے بے خودی میں آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھ پھیلا دیں۔

بادل آگے نکل گیا۔ اس کی خنکی نے نیلوفر کے دل و دماغ سے حقائق کی تلخیاں دھو ڈالیں۔ دل میں سوندھا پن رہا۔ سینے میں گھٹن نہ رہی۔ ایک میل کے نم آلود پتے اس کے رخساروں کو چھیڑتے پرے ہٹ گئے۔ نیلوفر کو روحانی کیف محسوس ہونے لگا۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ دور کی کا نرد نرد، پتا پتا اور گلی گلی نکھر آئی تھی۔ نیلوفر چٹانوں پر چڑھ رہی تھی اب وہ شعوری طور پر چلی جا رہی تھی۔ اس نے دراز کر کے اوپر دیکھا اور چیل کے تنے کو تھام کر گہری سانس لی۔ جس کا ایک اور گلا چیل کے پیڑوں کو چھیڑ چھاڑ کر بھاگ رہا تھا۔ پھر جیسے کہاں سے ایسے ہی تین چار گلے اب دوسرے کے تعاقب میں نیلوفر کے قریب آ گئے۔ وہ مسکرا دی اور آگے بڑھ کر ان بادلوں میں سے گزرنے لگی۔ ڈھلان پر اس کا پاؤں پھسلا لیکن وہ سنبھل گئی اور سنگھے کی ڈالی کا سہارا لے کر پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ ایسا روحانی سکون جیسے یہ بادل اس کے دکھ درد سب کو دھو ڈالنے کے لیے ہی آسمانوں سے اتر رہے ہوں۔

نیلوفر کے شعور پر خمار طاری ہو گیا۔ ایک طلسم ساحر پہاڑوں کی ہریالی دکھیارے دلوں پر طاری کر دیا کرتی ہے۔ لاشعوری قوتوں نے بھر کر عقل و دل کا رشتہ توڑ دیا۔ وہ گرد و پیش کو بھلا بیٹھی اور تتلی کی طرح اوپر ہی اوپر آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ وہ چوٹی پر گئی اور دوسری طرف نیچے اترنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر ایک سیکری پر چڑھ رہی تھی۔ اسے وقت اور فاصلے کا زعم بھر احساس نہ رہا۔ دل و دماغ حقائق سے فرار کی نذروں سے سرشار ہوئے جا رہے تھے۔ وہ سیکری پر گئی تو دوسری طرف سے میدان نظر آیا جس میں بکھرے بکھرے درخت اور ہری سبز گھاس تھی۔ اس گھاس میں پھول اور پودے مہک رہے تھے۔ نیلوفر بھاگ کے نیچے اتری اور میدان میں چلی گئی۔

وہ تھک گئی تھی لیکن اس تھکن میں بھی لذت سی تھی۔ وہ گھنی گھاس پر چت لیٹ گئی۔ اس کی حرکت پر تتلیاں اڑنے لگیں۔ تتلی اڑتی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ سر کی تکیوں سے تتلی کا تعاقب کرنے لگیں۔ تتلی ایک پھول پر جا بیٹھی۔ نیلوفر کی نظریں تتلی تھی اور اس کا ذہن نیند سی جست میں برسوں کی مسافت پھاند کر بچپنے میں جا پہنچا اور سولہ اٹھارہ کے تتلی کے پیچھے بھاگ

www.paksociety.com

اٹھی۔ بلی اڑ لی اور گھاس میں چھپنے بڑھتے ایک پھول پر جا بیٹھی۔ نیلوفر دبے پاؤں آگے بڑھی لیکن وہاں سے بھی اڑ کر اور آگے چلی گئی۔

تتلی کے تعاقب میں نیلوفر میدان سے اُتر گئی۔ وہ اب پاگل پن کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔ احساس ہی نہ رہا کہ وہ گھنے جنگل میں جا پہنچی ہے۔ وہ میدان سے نیچے اتری اور ایک اونچی سی پرچھائی تھوڑی سی دیر بعد وہ ایک کٹاؤ میں داخل ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سرسبز پہاڑوں کی دیواریں تھیں۔ آب وادی تھی جس میں گھنا جنگل تھا۔

سورج پہاڑوں کے عقب میں چلا گیا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا اور بادلوں کے دھندلکے کو گہرا کر دیا۔ نیلوفر کو جنگل کی آغوش میں چھوٹی سی ندی بہتی نظر آئی تو وہ اس طرف چل دی۔

یکایک بارش شروع ہو گئی۔ پہلی ہی بوچھاڑ سے وہ یوں ٹھٹھک کے رک گئی جیسے خواب سے جاگ اٹھی ہو۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو اسے جنگل کی ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔

بارش اور تیز ہو گئی۔ ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی۔ بارش کے قطرے اسے کنکریوں کی طرح لگنے لگے وہ گھبرا کر حقائق کی دنیا میں آ گئی۔ اس کے کپڑوں سے پانی بہہ رہا تھا اور شام کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ بارش تیز اور تند نائے دار چھینٹے اور آندھی کے تھپیڑے اسے جھنجھوڑ کر احساس دلا رہے تھے کہ وہ بہت نکل آئی ہے اور پہاڑی راہوں پر بارش اور اندھیرے میں چلنا خودکشی کے برابر ہے۔

وہ تو بھول ہی گئی تھی کہ کس سمت سے آئی تھی۔ اندھیرا گہرا اور بارش تیز ہو رہی تھی اور وہ ڈھ پر چل کے تنے کو تھامے کھڑی تھی۔ وہ چل پڑی مگر دو سرے ہی قدم پر پاؤں پھسل گیا۔ اگر جھاڑی دونوں ہاتھوں سے پکڑ نہ لیتی تو لڑھکتی نیچے جاتی جہاں اب گھٹنے گھٹنے پانی بڑی تیزی سے بہا رہا تھا۔

اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ خوف سے جسم تھر تھر کانپنے لگا اور اس کے آنسو بہل آئے۔ داہوں میں طوفانِ بادوباراں کا ایسا ہیبت ناک شور تھا جیسے جنگل کے سبھی درندے باہر آ کے بہت چنگھاڑ اور چیخ چلا رہے ہوں۔ نیلوفر ابھی تک اسی جھاڑی کو مضبوطی سے پکڑے کھڑی تھی جس نے گرنے سے بچا لیا تھا۔

ایسے قیامت کے وقت اسے جبل کی ماں اور اس کی تسبیح یاد آئی اور جب اسے خیال وہ سورۃ منزل نہیں جانتی اور نہ ہی کبھی اس نے قرآن پڑھا ہے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے خدا سے روٹھ گیا ہو۔ اس کے ذہن سے کوٹھی اور کوٹھی کی تمام تر آسائشیں بیکار کی نکل گئیں، اور ایک؟ رہ گیا۔ اسے کلمہ شہادت یاد تھا۔ اس نے چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور سسکی لے کر خدا سے مخاطب ہوتی لیکن ایک چیخ نکل آئی اور وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کے ہونٹوں سے خود بخود سے آہ نکل اور لب ساکت ہو گئے۔ سینے سے نکلے ہوئے ان دو لفظوں نے اسے سہارا دیا۔ جھاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ

ہی تھی اور پاؤں تلے گھاس جیسے سرک رہی تھی۔ جبل کے پیڑوں اور گھنی جھاڑ سے جھکڑ کے تند تھپیڑے غراتے ہوئے گذر رہے تھے۔ نیلوفر نے ایک بار پھر بے بس ہو کر آسمان کی طرف دیکھا اور اس کے سینے سے چیخ نکل گئی پھر اس نے چلا کر کہا۔ "میرے خدا! آج کی رات نہ روٹھ، تجھے تیری خدائی کا واسطہ میرے خدا۔"

اور وہ جھاڑی چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ سر گھٹنوں میں چھپا لیا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس نے اچانک سر اٹھایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں ایسی قوت آ گئی ہے جو اس طوفان کا مقابلہ کر سکے گی۔ اس نے ہاتھ کے اندھیرے میں جبل کے ایک پیڑ کا سہارا لیا اور ڈھلوان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگی پھر چند قدم بے سہارا چلی لیکن ہوائی تند ہی نے اس کے قدم ہلا دیئے۔ دم بھر کو رکی اور جبل پر چڑھ گئی۔ دو قدم آگے ایک اور پیڑ کا سہارا لیا اور بیٹھ گئی۔ اس کے دانت ٹھٹھرا رہے تھے۔ خوف سے بجنے لگے اب وہ رکنا نہیں چاہتی تھی اور وہ مسلسل کلمۂ شہادت کا ورد کیے جا رہی تھی۔

پیڑوں، پتھروں، جھاڑیوں اور بیلوں کو تھام تھام کر، بیٹھ بیٹھ کر سرک سرک اور قدم بہ قدم چل کر وہ ڈھلان کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے گھنی جھاڑیں یہ تنگ راستہ سے ہیں بھی کیں قدم آگے جا کر یہ راستہ ذرا فراخ ہو گیا۔ وہ اب بیٹھ کے سرک رہی تھی۔ وہ اٹھی اور بغیر سہارے کے چل پڑی۔ آگے اسے اندھیرے میں دیوار سی نظر آنے لگی۔ اس نے قریب جا کر ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا وہ گھنی جھاڑیوں، بیلوں اور پودوں نے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے گھنم گھنا تھا جو راہ روک رکھی ہے۔ نیلوفر وہیں رک گئی اور جھاڑی کے اندر بیٹھ گئی۔

ادھر ابھی دیر بعد بارش تھم گئی۔ آندھی گھٹاؤں کو اڑانے لگی اور سپید بادلوں سے چاندنی چھن چھن کر آنے لگی۔ یوں لگا جیسے بے پھٹ رہی ہو۔ اس دھندلے دھندلے اجالے میں نیلوفر کو گھنی جھاڑیں گف سی نظر آنے لگی۔ چہرہ اسوں کی نمی بھی تھی لیکن گفیں اس نے مری کے جنگل میں کئی بار دیکھی تھیں۔

وہ سرک کے گف کے مشابہ آ پہنچی۔ چاند نے چھٹتے بادلوں سے نکل کر نیلوفر کو سارا منظر دکھا دیا۔ وہ واقعی گف تھی لیکن اس کا سیاہ کالا اندھیرا مشہور بہت ہی ڈراؤنا تھا۔ اس کے اندر سانپ بھی ہو سکتا تھا اور کوئی درندہ بھی۔ خوف سے اسے بچپن کی ڈراؤنی کہانیاں یاد آنے لگیں جنہیں وہ خیالی قصے سمجھتی رہی تھی لیکن اس رات اسے وہ سارے قصے سچے اور واقعی معلوم ہونے لگیں۔ جنوں اور بھوتوں کی کہانیوں میں ایسے ہی کا اکثر ذکر آتا تھا۔

جن بھوت کیا یاد آئے کہ اس میں جو تھی سہی سکت تھی۔ وہ بھی نہ رہی۔ اسے اپنا امید وار ارشد یاد آیا جسے وہ ٹھکرا چکی تھی۔ اس نے سوچا اگر اب ارشد اور اسد آ جائیں تو وہ ان کے قدموں میں گر جائے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

فرہاد کر سکے گی؟ — اکمل! میں ارشد سے شادی کروں گی۔ مجھے گھر لے چلو!"

اس نے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے اور بلند آواز سے خدا کو پکارنے لگی۔ اسے کچھ قدرے غم جھوٹا لگیں ہر شو پھر اندھیرا چھا گیا۔ ٹھٹھیں پھر اٹھیں اور یکبارگی چمک کے بگرج اٹھیں۔

نیلوفر نے دعا کے لیے پھیلائے ہوئے ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور اس کے سینے سے چیخ نکل گئی۔ بارش پھر برسنے لگی اور یک لخت تیز ہو گئی۔

نیلوفر سرک کے گٹ کے منہ میں چلی گئی۔ گٹ میں دفعتاً نرم سی روشنی پھیل گئی اور یہ روشنی بڑھنے لگی۔ نیلوفر کا دل ڈوب گیا اور وہ اٹھ کر بھاگنے لگی لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ گئی اور نیلوفر اس ہاتھ کی گرفت میں تڑپنے لگی۔ وہ جسم کا تمام تر زور لگا رہی تھی لیکن گرفت سخت تر رہی تھی۔ نیلوفر نے اس ہاتھ پر دانت گاڑھ دیئے اور اس قدر زور سے دبائے جیسے بوٹی نوچ لے۔

"پاگل نہ نیلوفر کی ذات" — ایک آواز گونجی — "میں انسان ہوں جنگل کا درندہ نہیں!"

نیلوفر کے دانت اکھڑ گئے اور تڑپتا جسم ساکن ہو گیا۔

"اٹھ بیٹھو" — ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مردانہ آواز نے کہا — "کون ہو؟ کہاں سے آئی کیسے آ پہنچی ہو؟"

"راہ بھول کے یہاں آ پہنچی ہوں" — نیلوفر نے ڈرے ہوئے بچے کی طرح روتے کہا۔ "بارش بہت تیز تھی" — اس نے سہمی لی اور رندھیانی ہوئی ملتجی آواز میں بولی — "مجھ پر رحم کھائیں۔ خاوند قتل ہو گیا ہے۔ انسان ہو تو تمہیں خداوند کریم کا واسطہ کہ...." اور اس کی چیخ نکل گئی۔

گٹ میں پھر روشنی پھیل گئی۔ اس نے دیکھا۔ ایک آدمی موم بتی جلا رہا تھا۔ موم بتی کی لو پھیلی تو کانپ اٹھا۔ دل ڈوب گیا اور اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس نے اس آدمی کو پہچان لیا —

"عثمان؟" — نیلوفر نے ہیبت زدہ آواز میں کہا — "میرے خاوند کے قاتل؟.... بھوتنی؟"

اس نے بے بس سی نظر ادھر ادھر دیکھا اور روتے ہوئے بولی — "اوہ خدایا تو نے مجھے منہ میں لا پھینکا" — اور بیل کو دیکھ کر قہر آلود آواز میں بولی — "مجھے بھی مار دے ظالم! مجھ سے کرنے سے پہلے مجھے مار دے الٹیرے!" — اس نے بازوؤں سے سونے کی چوڑیاں اور بندے اور انگلی سے انگوٹھی اتار کر جمیل کے آگے پھینک دی اور بولی — "یہ لے خدا کو سونپے چلا ہے۔ میرے خاوند کو قتل کیا اور میرا گھر لوٹ لیا۔ پھر میرے سچا کو لوٹنے کی کوشش کی کھانی سے گرا دیا.... یہ لے لے کر میری جان بھی لے لے۔ میری آبرو پر ہاتھ نہ ڈالنا"

وہ ہچکیاں لے لے کر عتاب آلود آواز میں بولے جا رہی تھی اور جمیل اسے بے بس نگاہوں کی آہ و زاری اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہ رہی ہو۔

"خبردار کی ذات" — وہ بڑے تحمل سے بولا — "میں کسی کا قاتل نہیں۔ میں لٹیرا اور ڈاکو بھی نہیں۔ میں آبرو سچا بیکار ہوں۔ لوٹا نہیں کرتا.... ڈرو نہیں.... یہاں تک تم کیسے آ گئیں؟"

"الو ہتے نکل بھی تو بارش آ گئی اور میں بھٹکنے لگی...." نیلوفر نے جرم طلب لہجے میں کہا — "راہ بھول کر یہاں تک آ پہنچی.... دل سیانی ہے یا لوگوں کی طرح سے ہٹ کر جنگل میں آ گئی۔ اب خدا کا ہی بھروسہ ہے!"

"یہ بیس لو" — جمیل نے چوڑیاں، بندے اور انگوٹھی اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا — "بارش تھم جائے تو یہاں گھر چھوڑ آؤں گا.... قہ ایسی جگہ آ پہنچی ہو جہاں سے دن کی روشنی میں بھی نہ نکل سکو گی۔ خاموشی سے بیٹھی رہو!"

جمیل خاموش ہو گیا۔

نیلوفر چپ چاپ کانپ رہی تھی۔

*

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گنف میں بے رحم سا سکوت تھا جو پراسرار بھی تھا، خوفناک بھی۔ بارش کا ہنگامہ آہستہ آہستہ رہا تھا۔ نیلوفر کو سردی کی بارش بہت اچھی لگا کرتی تھی مگر اس بھیانک گنف میں قید ہوتی تو اسے سے نفرت سی ہونے لگی جیسے اتنی تیز بارش اسے اس گنف تک پہنچانے کے لیے برسی ہو مہم بتی کی تھرکتی لو میں دیکھا۔ اوپر گھنی بیلوں اور پتوں نے گنف کتنا ہو کر چھت بنا رکھی تھی۔ بھی انہی بیلوں کی تھیں جن کے ساتھ جھاڑیاں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ نیچے خشک گھاس اور پتے بچھے ہوئے تھے۔

ایک دو جگہوں پر چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اتنی تیز بارش میں تو اس چھت سے نہیں بہنا چاہیے تھا لیکن یہ گنف چند ایک درختوں کے تنوں کے درمیان قدرت نے بنا درخت ایک دوسرے کے قریب تھے۔ ان کا بھی گنف پر چھایا ہوا تھا۔ یہ بلندی پر تھی اور تین پہلوؤں پر ٹیکریاں تھیں۔ اس لیے کسی کو گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی چھپا بیٹھا ہے گا ساخت میں مری کے دیہات کے گڈریوں کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ جہاں کہیں ایسی بلیں اور جھاڑ تھے انہیں گنف کی شکل دے دیتے اور باقی کام قدرت کر دیتی تھی۔ مری کے جنگلوں میں پناہ گاہیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں جو بارش میں گڈریوں اور مسافروں کو پناہ دیتی ہیں۔

یہ گنف کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ عجوبہ یہ تھا کہ نیلوفر جسے اپنے خاوند کا قاتل سمجھتی تھی اور جو ا دلیر اور نڈر تھا کہ تھانے کی حوالات سے بھاگ گیا تھا۔ وہ اس کے قبضے میں آ گئی تھی۔ وہ نہیں سکتی تھی کہ یہ آدمی اسے بخش دے گا اور اسے ایک مظلوم بیوہ سمجھ کر بھائیوں جیسا سلوک کرے گا جمیل کا انداز ایسا تھا جو نیلوفر کا خون خشک کر رہا تھا۔ وہ نیم دراز، چھت پر نگاہیں جمائے ہوئے جیسے اسے اپنے پاس بیٹھی ہوئی اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

نیلوفر نے اپنے آپ کو یہ دھوکہ دینے کی بھی کوشش کی کہ یہ خواب ہے مگر حقیقت اس کی خود فریبی کو یوں نگل لیا جس طرح اس گنف نے اسے اپنے پیٹ میں اتار لیا تھا۔ اس کا زندہ وجود اسے بڑی ہی بھیانک حقیقت کا احساس دلا رہا تھا۔ اس نے جمیل کو دیکھا۔ اس

بتی کی زرد روشنی ناچ رہی تھی جمیل خبر بود تھا۔ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے سیاہی مائل بال سے چھپے لگ رہے تھے۔ اس کا چہرہ شباب کی حرارت سے دمک رہا تھا۔ سنگریلو فر کو یہ چہرہ بتی کی کہانیوں کے ان کرداروں کی طرح ڈراؤنا لگ رہا تھا جو راتوں کو شہزادیوں تک کو اغوا کر لے نے تھے۔ وہ اس جیسی حسین لڑکیوں کی غرہ فروخت بھی کرتے تھے۔ ان کرداروں میں جادوگر بھی یوں پسند لڑکیوں کو بہیما نمزکر کے اپنا غلام بنا لیتے ہیں یا ان پر سکتہ طاری کر کے انہیں اٹھا لے نے تھے۔

نیلوفر نے ہندوستان کے ان نامی گرامی ڈاکوؤں کی بھی کہانیاں پڑھی تھیں جن کے قصے ہوں نے کتابوں کی صورت میں لکھے اور انہیں فلما بھی سے۔ ان میں اس نے شہزادیوں جیسی یں کے قصے بھی پڑھے تھے جو ڈاکوؤں کو دل دے بیٹھیں اور شاہانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ان کے ساتھ تی تھیں۔ بعض ڈاکو لڑکیوں کو دل دے بیٹھے۔ ان میں سے بعض کا انجام یہ ہوا کہ انہی لڑکیوں کے ہوئے گرفتار ہو گئے اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے محبت کی خاطر ہمارہ زندگی ترک کر دی۔

نیلوفر کو یہ کہانیاں جو زیادہ تر افسانے اور ناول تھے یوں یاد آنے لگیں جیسے کھلی ہوئی کھڑکی سے کے جھونکے آتے اور دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے ذہن میں سوچوں اور خیالوں کا ہوجاتا اور فوراً بعد اس کا ذہن اپنے اُجڑے ہوئے سماک کی طرح ویران ہو جاتا۔ اگر جمیل اُس ساتھ باتیں کرتا رہتا تو وہ شاید آنا نہ ڈرتی۔ اسے جمیل کی خاموشی اور بے نیازی زیادہ ڈرا رہی تھی۔ کا انداز ایسا تھا جیسے شیر نے ہرن کو مار کر اپنی کچھار میں لا رکھا ہو اور اسے یقین ہو کہ اس کے کوئی یہاں سے اٹھا نہیں سکتا۔

نیلوفر کو جب الف لیلیٰ کے کردار یاد آتے تو وہ اپنے آپ پر بے نیازی نرم اور سکتے کا اثر محسوس نے لگی جیسے وہ جمیل کے اشاروں پر ناچنے لگے گی۔ جمیل اس کے ساتھ جیسا بھی سلوک کرے گا حمت کے بغیر خاموشی سے بلکہ خوشی سے قبول کرے گی۔ اس خیال نے اسے بے حس کر دیا وہ سرتاپا مفلوج ہو گئی معلوم ہوا۔ اب کوئی اس کے جسم میں خنجر گھونپ دے۔ بجلی کے ننگے تار جسم لگا دے، اسے درد کا احساس تک نہ ہوگا۔ اس کے حلق میں جو گولہ سا اٹک گیا تھا وہ حلق سے یاد گیا تھا۔ وہ جو گھٹن محسوس کر رہی تھی وہ ختم ہو گئی۔

جمیل نے آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور نیلوفر کو دیکھا۔ لڑکی کی تمام حسیں یکلخت بیدار ہو گئیں اُسے احساس ہونے لگا اور اس کا جسم یوں لرزا جیسے جمیل کی شرارتی سی آنکھیں بجلی کے ننگے تاروں کی ں کے جسم کے ساتھ چپک گئی ہوں۔ اس نے جمیل کو جرم طلب نگاہوں سے دیکھا۔ جمیل نے آہ وہ نیلوفر کے چہرے سے نظریں ہٹا کر موم بتی کے تھرکتے شعلے کو دیکھنے لگا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نیلوفر کو ذکر یاد آ گئے جن کی جھوٹی سچی کہانیاں اس نے کتابوں اور رسالوں میں پڑھی تھیں۔ کے ذہن میں آتی کہ ہو سکتا ہے یہ آدمی مجھ سے محبت کرنے لگے اگر اس نے محبت کا اظہار کیا تو میں اس کی محبت قبول کر لوں گی، پھر اس کے دل پر قبضہ کر کے اسے گرفتار کروا دوں گی.... اسے اپنی آبرو کا خیال آ گیا اور یہ سوال اس کے ذہن میں زہریلے کیڑے کی طرح رینگنے لگا ــــ کیا اس کی قید سے آزاد ہونے یا اسے گرفتار کرانے کے لیے میں یہ قیمت دے سکوں گی؟ مجھے یہ قیمت دینی چاہیے؟

اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی، اور اس کیفیت میں اسے جمیل کی ماں کا خیال آ گیا، اور اس کے ذہن میں اس پہاڑن کے پرخلوص اور پراثر الفاظ گونجنے لگے ــــ "جس گھر میں قرآن نہ پڑھا جاتا ہے دلوں سے رحمت کے فرشتے رخصت ہو جاتے ہیں.... قرآن شریف تمہارا سہاگ سر کر دے گا... جو مولا کرے گا بیٹی!"

"تم مسلمان ہو؟" ــــ نیلوفر نے جمیل سے پوچھا۔ یہ اس نے ارادہ کر کے نہیں پوچھا تھا۔ یہ سوال اس کے ہونٹوں سے آم کی گٹھلی کی طرح پھسل کر نکل گیا تھا۔

"تم مجھے مسلمانی کا واسطہ دے کر مجھ سے آزاد ہونا چاہتی ہو؟"

نیلوفر کی زبان پھر گنگ ہو گئی۔ وہ جمیل کے چہرے پر نظریں گاڑے اسے دیکھتی رہی۔

"میں مسلمان ہوں" ــــ جمیل نے کہا ــــ "لیکن ایسا مسلمان نہیں جیسے تم لوگ ہو۔ میں گناہوں کی دنیا کا مسلمان نہیں ہوں میں مسلمان کے پیچھے کو گولی مار کر اسے دھتکارنے والا مسلمان نہیں ہوں۔"

"اس پیچھے کو میری غلطی سے گولی لگی تھی" ــــ نیلوفر نے اپنے اندر بولنے کی طاقت محسوس کی کہنے لگی ــــ "اگر میرا خاوند مجھے گھسیٹ نہ لاتا تو میں اس پیچھے کو اپنے جسم سے اس سے دگنا خون دے دیتی جتنا میری گولی سے بہہ گیا تھا... وہ بچہ زندہ ہے یا مر گیا تھا؟"

"زندہ ہے" ــــ جمیل نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا ــــ "چھرے کھال کو چیر گئے تھے۔ وہ دونوں بعد ٹھیک ہو گئی تھا۔"

"اتنی سی بات پر تم نے میرا گھر لوٹ لیا" ــــ نیلوفر نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ اور اختلاف تھا لیکن نیلوفر اسے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جمیل کو مشتعل کرنے سے ڈرتی تھی۔ اس نے کہا ــــ "تم میرے خاوند کو اٹھا لے گئے اور اسے قتل کر کے لاش بھی غائب کر دی...." نیلوفر کی آواز رندھیا گئی۔ اس نے ہچکی سی لی پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔

جمیل نے نہایت آہستہ آہستہ گردن گھما کر نیلوفر کو دیکھا مگر چپ رہا۔ پھر آہ لے کر چھت کو گھورنے لگا۔ دو تین لمحوں بعد بولا ــــ "تمہارے بالوں اور کپڑوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ موسم اچھا نہیں ٹھنڈ نہ جائے گی" ــــ وہ ٹھہری ٹھہری آواز سے بول رہا تھا۔ میں تی بجھا دیتا ہوں۔ قمیض اتار کر میرا کرتہ پہن

ہے لیکن صاف ہے۔ آج ہی دھویا ہے" ــــ کچھ سوچ کر کہنے لگا ــــ "ایک غریب کا کرتہ نہ پہننا بنے کپڑے اتار کر نچوڑ لو اور جسم میرے کرتے سے پونچھ لو۔"

میں نے چھوٹک مار کر بتی بجھا دی۔

ف پھر خاموش ہو گئی۔ بارش تھم گئی تھی۔ وادیوں میں بہتے ندی نالوں کا شور اور پیڑ پودوں سے وں کی ہلکی ہلکی چیخیں جیسی جو نیلوفر کو اپنے دل کی آوازیں سن کر سنائی دے رہی تھیں جمیل نے ندر کر نیلوفر کی گود میں پھینک دیا۔ نیلوفر دم سادھ کر بیٹھی رہی۔ وہ اس آدمی کی موجودگی میں کپڑے اتارنے ہو سکی۔ وہ جان گئی کہ اس آدمی کا غشا یہی ہے کہ وہ کپڑے اتارے دے۔

جی کپڑے پہنے رکھوں گی" ــــ نیلوفر نے بے بس اور ملتجی آواز میں کہا۔

ٹ میں بھیگی ہوئی خشک گھاس اور پتوں میں حرکت ہوئی۔ اندھیرے میں نیلوفر سمجھ گئی کہ یہ آدمی اس بڑھ رہا ہے۔ اس کے اور جمیل کے درمیان ڈیڑھ ایک قدم کا ہی فاصلہ تھا۔ جمیل ہاتھ لمبا کر کے ی کو پکڑ اور اپنے قریب گھسیٹ سکتا تھا۔ نیلوفر گھاس کی آواز پر سکڑا اور سہم گئی۔

میں کپڑے نہیں اتاروں گی" ــــ اس کے منہ سے فریاد نکل گئی۔

اس نے جمیل کے جسم کا کوئی حصہ اپنے گھٹنوں کے ساتھ لگا محسوس کیا اور یہ جسم اس کے گھٹنوں باہر نکل گیا۔

جمیل باہر نکل گیا تھا مگر نیلوفر پر خوف اور دہشت کی انوکھی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ دل ڈوبنے کانپنے لگا۔ اسے تلخ سا خیال آیا کہ وہ کمزور سی لڑکی ہے اور آبرو کی حفاظت کے لیے کچھ دسکتی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

مم نے کپڑے تبدیل کر لیے ہیں؟" ــــ جمیل نے تھوڑی دیر بعد باہر سے پوچھا۔

نیلوفر کو اچانک محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک موت واقع ہو گئی ہے۔ اسے فوراً پتہ لہ آفتاب کی نیلوم لگ گئی ہے۔ اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ خدا نے عورت کو مرد کی تفریح تی کے لیے پیدا کیا ہے۔ کوئی مرد اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائے خواہ گھسٹ میں پکڑ لے عورت ہے۔

یہ خیال آتے ہی اسے اپنے جسم سے گھن آنے لگی جیسے جسم اس کا اپنا نہ ہو۔ وہ اپنے جسم دست بردار ہو گئی اور اسے اسی مردکی غلیظ مکلیت سمجھنے لگی جس کے جنگل میں وہ آ پھنسی تھی۔ اسے یہ احساس رہا تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ آفتاب نے اس کے اس احساس کو عقیدہ بنا ڈالا تھا، اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ اس نے شکست تسلیم کر لی اور قمیض اتار دی، پھر شلوار اور دونوں کو نچوڑ کر جمیل کے کرتے سے جسم پونچھا۔ وہ ہر لمحہ جمیل کے اندر آنے اور دبوچ لینے کی

www.paksociety.com
Azeem Paksitanipoint

منتظر رہی۔ وہ ذہنی طور پر اب ہر طرح کی ذلت کے لیے تیار ہو چکی تھی۔

"کپڑے پہن لیے؟" ۔۔۔ باہر سے آواز آئی۔

"پہن رہی ہوں!" ۔۔۔ نیلوفر نے لرزتی آواز میں کہا۔

سکوت چھا گیا

"میں آجاؤں؟" ۔۔۔ جمیل نے ذرا سی دیر بعد پوچھا۔

"آجاؤ۔" ۔۔۔ نیلوفر کی دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔

جمیل نے اندر جا کر موم بتی جلائی۔ دیکھا۔ نیلوفر نے اس کا کرتہ نہیں پہنا تھا اور اپنے ہی کپڑے سمیٹ کر سینوں پہ لیے تھے۔ وہ جمیل کو جم طلب اور شکست خوردہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"بارش تھم گئی ہے۔" ۔۔۔ جمیل نے متانت سے کہا۔ "آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

نیلوفر کو دھچکہ سا لگا۔ جیسے تیز رفتار گاڑی چلتے چلتے رک گئی ہو۔ اس نے ابھی چوڑیاں اور بندے نہیں پہنے تھے۔ جمیل نے ان چیزوں کو اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "یہ اٹھا لو۔" ۔۔۔ اور وہ بتی کو پھونک مار کر باہر نکل گیا۔

جب نیلوفر باہر آئی تو جمیل اسے ساتھ لیے چل پڑا۔

"میرا بازو پکڑ لو۔" ۔۔۔ جمیل نے کہا۔ "پھسلن چلنے نہیں دے گی۔ گر پڑی تو جانے کتنی دور نیچے جا پڑو گی اور سیلابی پانی ساتھ ہی بہا لے جائے گا۔"

نیلوفر نے ڈر کر اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ دو ہی قدم چلے تھے کہ نیلوفر کا پاؤں پتھر سے پھسلا اور وہ اوندھے منہ گرنے لگی لیکن جمیل نے لپک کر اس کی کمر دبوچ لی۔ پھر اس کا بازو نیلوفر کی کمر کے گرد لپٹا رہا۔

جمیل ان پر خطر راہوں سے واقف تھا، نیلوفر کو تھامے ہوئے چپ چاپ بلندی سے اتر آیا۔

"سچ کہتے ہو مجھے گھر لے جا رہے ہو؟" ۔۔۔ نیلوفر نے ڈرے ہوئے بچے کی طرح پوچھا۔

"تو اور کہاں لیے جا رہا ہوں؟" ۔۔۔

نیلوفر چپ ہو گئی۔ وہ چند قدم اور آگے چلے گئے۔ آگے ندی کا شور تھا جیسے سیلابی دریا دور اوپر سے آبشار کی صورت میں گر رہا ہو۔ جب وہ ندی کے کنارے پہنچے تو چاند گھٹاؤں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ بارش سے دھلی فضا میں چاند نی بہت شفاف تھی۔ وہ ندی کے کنارے رک گئے۔

"ہمیں اس ندی سے گزرنا پڑے گا؟" ۔۔۔ نیلوفر نے سہم کر پوچھا لیکن اب کے اس کی آواز میں

ندی کی جھلک بھی تھی۔

"اور کوئی راستہ نہیں۔" ۔۔۔ جمیل نے کہا۔ "پانی گہرا تو نہیں لیکن پہاڑی ندیوں کی تندی پاؤں جمنے نہیں دیتی۔"

وہ سیلابی ندی کے کنارے زور کے کھڑے تھے۔ مٹیالے پانی کی لہریں بڑی ہی ہیبت ناک تھیں۔ اچانک نیلوفر اس کے قدموں میں دوزانو بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر فریاد کی ۔۔۔ "اللہ کا واسطہ! اتنا بتا دو کہ مجھے کہاں لیے جا رہا ہے۔ مجھے قتل کرنا ہے تو فوراً کر دو۔ یہ ساتھ جو سلوک کرنا ہے فوراً کر۔ میں تیرا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔ پاپی! جو پاپ کرنا ہے تو کر لے لیکن تجھے خدا اس دنیا میں سزا دے گا۔"

جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تنومند تھا۔ لڑکی نازک سی تھی۔ جمیل نے جھک کر نیلوفر کو اٹھایا پھر دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا اور ندی میں اتر گیا۔ پانی اس کے گھٹنوں سے ذرا ہی اوپر تھا لیکن بہت تیز تھا۔ تین چار بار پھسلا۔ پانی کی تیزی نے کئی بار اس کے پاؤں اکھاڑے اور ہر بار نیلوفر بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کے ساتھ لگ گئی۔ جمیل اپنا کرتہ گف میں بھینچ کر اٹھاتا تھا۔ نیلوفر کے گال اس کے سینے سے لگے ہوئے تھے۔ اس بھرے بھرے سینے کی ہلکی ہلکی بو اور لمس نے اس پر ایسی کیفیت طاری کر دی جو نیلوفر کے لیے انوکھی تھی۔ وہ اس جسم سے ڈر بھی رہی تھی اور اسی جسم کو پناہ بھی سمجھ رہی تھی۔ تیز پانی کی کیفیت اسے بے بس کر رہی تھی۔

دوسرے کنارے پر جا کر جمیل نے نیلوفر کو بازوؤں سے اتار دیا اور اسے ساتھ لیے آگے بڑھا۔

پھسلنے، سنبھلنے، لڑکھڑانے بیلوں اور جھکی جھاڑیوں سے بچتے بچاتے وہ اس بلند میدان تک آ گئے جس سے نیلوفر تسلی کے تعاقب میں دوڑی تھی۔ چاندنی میں یہ جگہ دن کی نسبت کہیں زیادہ دل کش لگ رہی تھی۔ وہ دونوں چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟" ۔۔۔ نیلوفر نے پوچھا۔ "باتیں کرتے رہنا۔ مجھے ڈر آتا ہے۔"

"کیا باتیں کروں؟" ۔۔۔ جمیل نے باوقار سے لہجے میں کہا۔ "تم مجھے اپنے خاوند کا قاتل اور لٹیرا سمجھتی ہو۔ اور یہ بھی کہ میں نے متمدر سے بچا کر بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں کون کہ میں نے کچھ کہا نہیں کیا تھا تو تم کہو گی کہ جھوٹ بولتا ہے ... میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ شاید وقت اور قدرت خود اس راز سے پردے اٹھا دے۔"

"پھر تم بھاگے کیوں تھے؟"

"کیوں کہ میں بے گناہ ہوں۔" ۔۔۔ جمیل ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بول رہا تھا لیکن اس کی آواز میں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یکبارگی عتاب آگیا۔ چلتے چلتے رکا اور نیلوفر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اور جیسے میں نے کہانی میں پھینکا تھا اسے میں قتل ہی کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے ایک پہاڑن لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ اچھا شکار میں پہنچ گیا لیکن وہ کار میں بیٹھ کر بھاگ اٹھا۔ میں گھوڑی پر تھا۔ میں اس کے پیچھے گیا اور اسے جا لیا۔ میرا خیال تھا وہ مر چکا ہوگا لیکن وہ مرا نہیں۔ تم کہتی ہو وہ تمہارا چچا تھا۔ مجھے نہ اس وقت معلوم تھا کہ یہ اس لڑکی کا چچا تھا جسے میں نے ایک پہاڑی بچے کو گولی ماری ہے۔ نہ آج معلوم ہے کہ وہ کون ہے اگر وہ تمہارا چچا ہے تو مجھے اس کے مرنے کا دکھ نہ ہوتا۔ اگر میرا چچا بھی ہوتا تو بھی دکھ نہ ہوتا۔ دکھ یہ ہے کہ وہ مرا نہیں۔"

نیلوفر کہہ گئی اور جمیل کا بازو پکڑ کر اسے بھی روک لیا اور حیرت زدہ آواز میں پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ ..... اس نے کیا کیا تھا؟"

جمیل نے اسے تمام واردات سنا دی۔ نیلوفر کے آنسو نکل آتے۔

"کیا وہ ایسا بھی کر سکتے ہیں؟" ـــ نیلوفر نے پوچھا۔

"دولت والے کیا کچھ نہیں کر سکتے؟"

"تھک گئی ہوں۔" ـــ نیلوفر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ذرا بیٹھ جاؤں۔"

"یہاں نہیں، گھاس بہت گیلی ہے۔ آگے چلو۔" جمیل نے کہا۔ "لیکن تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ میں تمہیں جلدی گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔"

نیلوفر اداس سی ہنسی ہنس پڑی جس میں بے بسی بھی تھی، تنکوے اور طنز کے لہجے میں بولی۔ "میرے لیے پریشان ہونے والا کوئی نہیں۔"

جمیل نے جیسے سنا ہی نہ ہو چل گیا۔ ذرا آگے جا کر رکا اور نیلوفر کو ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ بارش تو تھم چکی تھی لیکن درختوں کے پتے ابھی تک بارش کے قطرے ٹپکا رہے تھے۔

"اور جو انگوٹھی تم نے میری انگلی میں دیکھی تھی۔" جمیل نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے اس لڑکی نے دی تھی جو اس روز میرے ساتھ تھی جس روز تم نے بچے کو گولی ماری تھی۔ اس لڑکی نے وہ انگوٹھی بازار سے خریدی تھی۔"

"وہ لڑکی تمہاری کیا لگتی ہے؟" ـــ نیلوفر نے اداس اور شکست خوردہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں لگتی۔"

"پھر وہ کیوں تمہارے ساتھ تھی؟" ـــ نیلوفر نے پوچھا اور جمیل کو خوش کرنے کے لیے خوشامدانہ سے لہجے میں کہا۔ "وہ تمہیں چاہتی ہوگی۔ تم خوبصورت جوان ہو نا..... تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

"کچھ نہ کچھ ایسے کرتے ہیں۔" جمیل نے گیلی گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس

سے مجھے پیار ہے۔ مجھے تم سے بھی محبت ہے کیونکہ تم دکھی ہو، ڈری ہوئی ہو۔ میں پکڑا بھی نہ جاؤں، پھر بھی تمہاری کوٹھی میں چھپ کر آؤں گا..... اور سنو لڑکی جو کچھ بھی تمہارا نام ہے، مجھے پیچھے کا انتظام لینا ہو تا تو میں لے لیتا جہاں تم نے یا تمہارے خاوند نے اسے گولی ماری تھی۔ ہم لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ ہماری ہوبیلیاں تمہاری دنیا میں جاتی ہیں تو تمہارے مرد انہیں بے آبرو کر دیتے ہیں اور ان کی راہ میں سنہرے جال بچھاتے ہیں، مگر ہم ہماری دنیا میں آؤ تو ہم تمہاری راہ میں پھول بچھاتے ہیں۔"

جمیل کا انداز اور لہجہ ایسا تھا جس میں جرم اور گناہ کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی۔ جھلکی نہیں تھی، بھی تھی۔ نیلوفر کو سکون سا محسوس ہونے لگا۔

"ہم دولت اور عزت کے اسیر نہیں ـــ جمیل کہہ رہا تھا۔ "ہم پہاڑی لوگوں کے دل پہاڑوں کی طرح سرسبز ہوتے ہیں لڑکی! ہم جب جوان ہوتے ہیں تو کسی ہوٹل میں، کسی کوٹھی یا بیکری میں نوکری کر لیتے ہیں یا کھیتوں میں جاتے ہیں۔ بچپنے عمر گزارتے ہیں۔ ہم پہاڑوں کی ٹھنڈک میں پیدا ہوتے ہیں اور ہوائی میدانوں کی گرمی میں جلا کر وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور ہماری خاک پہاڑوں کے پتھروں میں آ ملتی ہے..... ہم لٹ جاتے ہیں، ٹوٹتے نہیں۔"

جمیل پر وجدانی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ نیلوفر اپنے وجود میں انوکھا سا تاثر محسوس کر رہی تھی۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا اور وہ چاہنے لگی تھی کہ اسی چاندنی میں اسی آدمی کے پاس بیٹھی اسی طرح باتیں سنتی رہے۔

"ہم ایک دوسرے کے دکھ درد لوٹ لیا کرتے ہیں۔" ـــ جمیل نے کہا۔ "کوئی ٹوٹتے رشتے ہم سے اپنے پاس بٹھا کر اس سے دکھ بانٹ لیتے ہیں لڑکی! جانتے تمہارا نام کیا ہے۔ ساون کی جھڑی ہے اس پر ہمارے دکھ۔ جو ڈالتی ہے اور ہم ہنس ہنس کے جیتے ہیں کبھی دن کو ان وادیوں میں آنا لڑکی! کسی بھرے کے پاس بیٹھا کوئی گڈریا لڑکا ہونٹوں میں کنگ دبائے بجا رہا ہوگا اور اس کی نشست میں چیل کے پنڈوں کی سال سال میں کوئی چرواہا نمبری کے نغمے بکھیر رہا ہوگا۔ تم بھول جاؤ گی تم کو، کبھی ہو سہانی دسو گھنے کے مرلیں آ کے سینے کا روگ بھول جاتے ہیں۔ ہم جھرنوں کے گیتوں میں جنم لیتے ہیں لڑکی! ہم قاتل نہیں، لٹیرے بھی نہیں....."

جمیل نے ہلکی سی چیخ لی اور چپ ہو گیا۔ اس کا سر جھک گیا۔

"اتنی بہت دیر ہو گئی ہے لڑکی!" ـــ جمیل نے چونک کر کہا۔

"میرا نام نیلوفر ہے۔" ـــ نیلوفر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے تھے؟ پیچھے ہوئے تھے؟"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem

"میں یہیں رہتا ہوں"۔۔۔ جمیل نے متین سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "چاہو تو کل پولیس کو لے آنا، پر ایک بات بتا دوں لڑکی! اتمہارے خاوند کے قتل میں پولیس اگر مجھے بھی پکڑنا چاہتی ہے تو میں اپنی وادیوں میں پولیس کی گولی سے مرجاؤں گا وہ مجھے پھانسی کے تختے تک نہیں لے جاسکیں گے۔ چاہو تو کل ہی پولیس کو لے آنا، لیکن انہیں بتا دینا کہ جسے پکڑنے چلے ہو وہ یہیں ملے گا نہیں۔ انہیں یہ بھی بتا دینا کہ میں اس ڈاکو اور قاتل کی کچھار میں جا بھٹکی تھی اور وہ مجھے گھر چھوڑ گیا تھا۔"

"میں انہیں یہ ضرور بتاؤں گی"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ "پھر انہیں یقین آجائے گا کہ تم ڈاکو اور قاتل نہیں ہو تم مجھے گھر چھوڑ آؤ۔ میں تھانیدار سے کہہ دوں گی کہ تم بہت نیک انسان ہو۔"

"ہمارا خدا تمہارے تھانیدار سے زیادہ بڑا ہے"۔۔۔ جمیل نے کہا۔ "جو تھانیداروں کو معلوم نہیں ہوتا وہ صرف خدا جانتا ہے۔ اگر میں تمہارے تھانیدار کو تمہاری طرح خدا سمجھتا تو اس کی حوالات سے کبھی نہ بھاگ سکتا۔ میں نہیں اس لیے گھر میں لے جارہا کہ تم تھانیدار سے کہو کہ میں شریف آدمی ہوں میں اگر تمہارے ساتھ نیکی کر رہا ہوں تو فدائے تم سے کرا رہا ہوں مجھے خدا کو خوش کرنا ہے تھانیدار کو نہیں میں جانتا ہوں تم ابھی تک مجھے ڈاکو اور قاتل سمجھ رہی ہو۔ تم جو کچھ کر رہی ہو مجھے خوش کرنے کے لیے کر رہی ہو۔"

نیلوفر نے کسی غیبی قوت سے بے بس ہو کر جمیل کے کندھے تھام لیے اور پیار سے بولی۔ "آؤ میرے گھر چلو۔ وہاں انہیں پکڑنے کوئی نہیں آئے گا، لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ انسپکٹر خالد لاپتہ ہے اور وہ حسین دکاندار بھی غائب ہو گیا ہے جس سے انگوٹھی برآمد ہوئی تھی۔"

"لیکن خدا تو لاپتہ نہیں ہوا"۔۔۔ جمیل نے کہا۔ "اٹھو چلیں۔"

ڈھلوانیں اترتے اور چشموں پر پھسلتے، جھاڑیوں اور درختوں سے بچتے وہ چلتے گئے۔ نیلوفر کئی بار پھسلی اور جمیل نے ہر بار اسے تھام لیا۔ تین چار بار تو دونوں کے سینے ٹکرا گئے۔ گال مس کر گئے اور مُنہ سے مُنہ لگ گئے۔

نیلوفر اپنے حسن اور دل کشی سے آگاہ تھی۔ اس لیے سوچا یہ مرد فرشتہ ہے یا بے جان پتھر! اسے یہ بھی خیال آیا کہ یہ شخص پاگل ہی تو نہیں ہے؟ اس نے کہیں پاگل پن میں ہی تو ڈاکے اور قتل کی واردات نہ کی ہو؟ لیکن اس کی باتیں، پاگلوں والی نہیں تھیں۔ ان باتوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ نیلوفر جمیل کی ذات میں تحلیل ہوتی گئی۔ اسے ابھی یقین نہیں آیا تھا کہ اسے وہ اس کے گھر ہی لے جارہا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر بھی تو لے جاسکتا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ یہاں رہتی اور ڈاکے کی واردات کے لیے چھپا ہوا ہو۔

ان تمام خدشوں اور وسوسوں کے باوجود نیلوفر یہ احساس غالب آرہا تھا کہ یہ شخص اتنا بڑا ہے جتنا وہ سمجھتی ہے۔ اسے خدا یاد آیا اور یہ بھی کہ اس نے گھر میں جو نئی نوکرانی رکھی ہے وہ بھی خدا کی باتیں کرتی

ہے، اور یہ شخص بھی خدا کی ہی باتیں کرتا ہے۔

"خدا!... اوہ میرے خدا!"۔۔۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کو پکارا۔ "تو کہاں ہے؟"

نیلوفر کی کوٹھی میں۔۔۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ جمیل کی ماں نے آٹھ بجے مکئی کی روٹی پکا کر لسی بنالی تھی اور نیلوفر کی راہ تکنے لگی تھی۔ نیلوفر اسے بکری چرانے کو کہہ گئی تھی کہ اماں! آج بھی اسی طرح کی مکئی کی روٹی پکا دینا اور لسی بھی بنا لینا جیسی کہ روز کھلاتی تھی۔ بارش شروع ہوئی تو جمیل کی ماں سے چین نہ ہونے لگی تھی۔ پھر لمحے گزرتے گئے اور وہ بے چین ہی ہوتی چلی گئی۔ رات نو بجے کا وار آیا تو جمیل کی ماں نے بتایا کہ بی بی جی سیر کو نکل گئی تھی ابھی لوٹی نہیں۔ وہ نصف گھنٹہ بیٹھا اور چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے فون پر پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ نیلوفر ابھی نہیں آئی۔

پھر کار دار نے دو مرتبہ فون کیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ نیلوفر جا کہاں سکتی ہے؟ اسے بتائے بغیر راولپنڈی تو نہیں چلی گئی؟ وہ دیکھ چکا تھا کہ لڑکی اس سے باغی ہو گئی ہے اور منی مانی کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

گیارہ بج چکے تھے جب جمیل نیلوفر کی راہنمائی میں اسے ساتھ لیے سڑک پر آیا۔

"وہ سامنے میری کوٹھی ہے"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ اپنی کوٹھی کی تباہی دیکھ کر اس کی آواز میں جان پیدا ہو گئی تھی۔ دل خوف سے آزاد ہو گیا۔

"اب مجھے لوٹ جانا چاہیئے"۔۔۔ جمیل نے کہا۔ "تم جاؤ"۔۔۔ اور اس نے نیلوفر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھے بے شک بھول جانا، اپنے خدا کو کبھی نہ بھولنا۔"

"چلیے آؤ"۔۔۔ نیلوفر نے اثبات سے کہا۔ "میں ساتھ ہوں"۔۔۔ اس نے جمیل کی کلائی تھام لی اور بولی۔ "ذرا دیر رک کے چلے جانا۔"

جمیل چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ یہ لڑکی اسے دھوکے میں گرفتار کرا دے گی۔ جب وہ کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوئے تو نیلوفر آگے آگے تھی۔ کوٹھی کے پہلو میں کار دار کی کار کھڑی تھی۔

"تم چلے جاؤ"۔۔۔ نیلوفر نے گھبرا کر کہا۔ "میرا پیچھا آیا ہوا ہے"۔۔۔ جمیل چلنے لگا تو نیلوفر نے کہا۔ "شاید میں نہیں پھر بھی دیکھنے آؤں۔ وہیں ملو گے نا"۔۔۔ پھیکی سی ہنسی سے بولی۔ "میں جی آؤں گی، پولیس نہیں آئے گی"۔۔۔ اس نے جمیل کا ہاتھ دبایا اور برآمدے میں داخل ہو گئی۔

ان کے عقب میں۔۔۔ برآمدے میں کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری تو جمیل تیزی سے گھوما اور بھاگا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اٹھا۔ وہ اسی کی ماں تھی جو نیلوفر کے قدموں کی آواز سن کر جلی آ رہی تھی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ جمیل بھاگتے سے ٹکرا گیا۔ ماں کے سنبھلنے تک جمیل رات کے سکوت میں غائب ہو چکا۔

"تم آگئیں بیٹی!" ماں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "یہ کون تھا؟ بھاگ کیوں گیا ہے؟ تم نے دیکھا تھا؟ کوئی چور اچکا تو نہیں تھا؟"

"وہ میرے ساتھ آیا تھا۔" نیلوفر نے کہا۔ "میں باہر نکلی تو باہر آگئی اور میں اس کی جھگی۔ بیچارہ غریب سا آدمی ہے۔ مجھے یہاں تک چھوڑ گیا ہے۔ بہت جلدی میں تھا۔ اسی لیے دوڑ گیا۔"

"کیا مالا ڈوں بیٹی؟ مجھے تو تمہارے فکر نے ادھ موا کر دیا ہے۔"

"لے آؤ۔"

کاردار بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ نیلوفر کو دیکھتے ہی بولا۔ "کمال تھیں تم؟ اور یہ کون رکھا ہے؟" ۔۔۔ اس نے رعب سے پوچھا۔ "کہاں گئی تھی؟"

نیلوفر کو یوں صدمہ ہوا جیسے کھلی فضاؤں میں اڑتے کسی نے دلوچ کر اسے پنجرے میں دیا ہو۔ جمیل نے اس پر جو انکشاف کیے تھے اور جو سلوک کیا تھا اور اس پر جو کیفیت طاری کر دی تھی جل کر ایک وقت بن گئی جس نے نیلوفر کا انوکھا سا حوصلہ دیا۔ اس کی نظروں میں کاردار کا روپ بدل گیا۔

"انکل!" ۔۔۔ نیلوفر نے دبے دبے سے غصے سے کہا۔ "میں کہیں بھی جاؤں آپ کو کیا؟"

گھومنے نکلی تھی۔ بارش آگئی اور اب لوٹ آئی ہوں۔"

"نیلو!" ۔۔۔ کاردار نے دھیمی مگر عتاب آلود آواز میں کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم باغی ہوتی ہو۔ خاوند کے بعد جوان لڑکی کا یہ رویہ۔۔۔"

"انکل!" ۔۔۔ نیلوفر نے جھنجھلاہٹ سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے نہیں چھوڑ دیتے؟"

"صرف اس لیے کہ تم میری نازک ترین ذمہ داری ہو۔"

"انکل! آپ اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کیوں نہیں کر لیتے؟"

"تم نادان ہو نیلو! میری ذمہ داری اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک تم دوسری شادی نہ کر لو۔"

"لیکن انکل! میں اس وقت تک دوسری شادی نہیں کروں گی جب تک آفتاب زندہ یا مارا جاتا۔ اور جب تک اس کے قاتل نہیں پکڑے جاتے میں دوسری شادی نہیں کروں گی۔۔۔ اگر شادی کروں گی ہی نہیں۔"

قاتل اسی نے جس نے مجھے لوٹنے کی کوشش میں قتل کر جانا چاہا تھا۔" کاردار نے کہا۔

"وہ جنہ ذلیل ہے۔" ۔۔۔ کہا ۔۔۔ "پھر تمہیں یقین آ جائے گا کہ آفتاب زندہ ہے یا مُردہ۔"

"وہ قاتل نہیں ہے۔ اس کے آپ کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔" نیلوفر نے بھرپور ادرک کے انداز میں کہا۔ "بلکہ آپ نے ایک سیدھی سادی دیہاتن پر دست درازی کی تھی۔"

"کیا بک رہی ہو؟" ۔۔۔ کاردار نے گرج کر کہا۔ "یہ قبیح! اپنے چچا پر الزام لگاتے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"یہ الزام نہیں انکل!" ۔۔۔ نیلوفر نے خود اعتمادی سے کہا۔ "جس شام آپ زخمی ہوئے تھے، اس رات میں آپ کے کمرے گئی تھی اور میں نے آپ کے ڈرائنگ روم میں دو دو کی کاکٹر پی لیکن تھی۔ میں نے ملازموں سے پوچھا تو سب نے کہا تھا کہ چند دنوں سے ایک لڑکی دودھ دینے آتی ہے، شاید یہ اسی کی ہے اور خانساماں نے بتایا کہ اس شام لڑکی آپ کے ساتھ کار میں کہیں گئی تھی۔"

کاردار کے جرم سے پردے جمیل نے چاک کیے تھے۔ کاردار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یک لخت بم کی طرح پھٹا۔ "تم نے یہ بکواس کہاں سے سنی ہے؟ سراغ رساں بنی پھرتی ہو بے حیا۔۔۔ زبان کھینچ لوں گا۔"

"اور وہ انگوٹھی اس لڑکی نے ملازم کو دی تھی جسے آپ کار میں بٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے۔" ۔۔۔ نیلوفر نے کاردار کی دھمکی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ اسی دکاندار سے خریدی گئی تھی جو انگوٹھی خالد کے ساتھ لاپتہ ہو گیا ہے۔"

"نیلو!" ۔۔۔ کاردار نے دانت پیس کر پوچھا۔ "سچ بتاؤ تم کہاں سے آئی ہو؟ کہاں گئی تھی؟ تمہارے دماغ میں یہ جھوٹ کس نے ڈالا ہے؟ وہ کوئی سیلا دشمن ہوگا۔"

"آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے؟" ۔۔۔ نیلوفر نے کاردار کی لال انگارہ آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "دیکھتے انکل! میں اب آپ کی محتاج نہیں رہیں آپ کے فیصلوں کی پابند نہیں۔ مرنے والے نے تمام جائیداد میرے نام منتقل کر دی تھی اور اسلام آباد میں جو کوٹھی بن رہی ہے وہ بھی میری ہے۔"

"اچھا؟" ۔۔۔ کاردار نے طنز سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "یہ نشہ طاری ہے بیگم صاحبہ پر؟۔۔۔ کبھی اس جائیداد کے کاغذات بھی دیکھے ہیں؟۔۔۔ پاگل لڑکی! اس جائیداد کا مالک میں ہوں۔ آفتاب نے جانے کس مصلحت کی بنا پر اپنی جائیداد میرے نام منتقل کر دی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کا انتظام میں ہی چلاتا تھا۔۔۔ تو اب بھی میری مناج ہے مرُدود!"

"یہ جھوٹ ہے" ۔۔۔ نیلوفر نے تن کر کہا لیکن سمجھ کے رگ تنی اور گھبرا کر بولی۔ "اوہ۔۔۔ وہ کاغذات بھی چوری ہو گئے ہیں۔ وہ بھی دراز میں رکھے تھے۔"

"چوری نہیں ہوتے۔" ۔۔۔ کاردار بولا۔ "وہ میرے پاس ہیں۔ کوٹھی میں جائیداد کا کوئی کاغذ نہیں تھا۔"

کاردار جان چکا تھا کہ نیلوفر کسی نہ کسی ذریعے سے چند ایک سچی باتوں کا علم ہو گیا ہے لیکن حیران تھا

Scanned By Waqar Azeem

کہ وہ ذرا یہ کون سا ہے۔ وہ نیلوفر کا پھپھا ٹھہرا لب ولہجہ اور اس کا ہاؤ بھاؤ بھی دیکھ رہا تھا اور یہ اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب دوسری شادی کے لیے محض باتوں سے آمادہ نہیں ہو گی۔

"میری جاہ اور آپ اتنی آسانی سے مطمئن نہیں کر سکیں گے انکل!" ۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ "میری میں میری اپنی بادشاہی ہے۔ یہاں اب آپ کا حکم نہیں چلے گا۔"

نیلوفر دلیر لڑکی نہیں تھی لیکن اس کی زبان سے یوں جرأت اور دلیری سے باتیں نکل رہی تھیں۔ اس کے اندر کوئی انجانی قوت سرایت کر گئی ہو۔ وہ اس قوت سے واقف نہیں تھی مگر اس نے یہ کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ وہ ایسی دلیرانہ باتیں کس قوت کے زیر پر کر رہی ہے۔

"میں جاہ تمہارے محروم ہو گئی تو بھی آزاد ہوں!" ۔۔۔ اس نے کاردار سے کہا۔ "مجھے چاہیے بہت ہیں۔ اپنے آپ کو بڑی اچھی قیمت پر بیچ سکتی ہوں۔ میں غریب اور بھکاری بن گئی تو بھی اپنی میں اپنے آپ کو رانی سمجھوں گی۔"

کاردار کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا مگر بدلا ٹھہرا رنگ ڈر، خوف یا خفت کا نہیں بلکہ یہ ایسا تاثر تھا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کی نظروں میں نیلوفر کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

"رانی!" ۔۔۔ کاردار زہر آلود ہنسی ہنس دیا اور دھیمی سی آواز میں بولا۔ "کاغان کی گھٹ میں سوئی کانٹتی ہوئی بچی جسے عزت اور فاقوں نے کشمیر سے کاغان دھکیل دیا تھا، گھر سے بے گھر کر آج کسی کی جاتیہ اور بادشاہی کے خواب دیکھ رہی ہے۔ اپنے آپ کو رانی سمجھ رہی ہے۔"

"کیا کہا آپ نے؟" ۔۔۔ نیلوفر نے استعجاب سے پوچھا۔

"سن آج تجھے تیری اصلیت بھی بتا دوں۔" کاردار پر نیلوفر نے بھروسہ کیا تھا جس کا رنگ سیاہ تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کی نشان لی جس سے وہ نیلوفر کو بے بس اور مجبور کر سکے۔ ا ٹی پاتی پر پاؤں رکھا اور نیلوفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پر اسرار اور ڈرامائی سے لہجے میں بولا۔ برس گزرے تو کاغان کی ایک گھٹ میں بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تیرے جسم پر گرم کپڑا نہ تھا۔ تیرا ماں باپ بھوک اور افلاس کے مارے خانہ بدوش تھے تو ہر سے کام کی چیز تھی۔۔۔۔ چھ سال کی بچی میں لپٹی ہوئی۔ سردی سے مرتی ہوئی بچی۔۔۔۔ وہ رات طوفانی تھی۔ تیرے ماں باپ تجھے اور تیرے گوگھٹ میں بٹھا کر لکڑیاں چننے چلے گئے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ میں وہ آدمی ساتھ لیے صبح سے کر رہا تھا۔ ہم تجھے اغوا کرنا چاہتے تھے اور ہم نے تجھے اغوا کر لیا۔ پھر میں تجھے کسی دولت مند کا لیے پالنے لگا میں نے تجھے گوڑے کر گوگھٹ سے اٹھا کر کوٹھیوں میں پالا۔ تجھے دنیا بھر کی آسائش رکھ کر تیرے ذہن سے بچپن کی سب یادیں دھو ڈالیں۔ صرف تجھے ہی نہیں، میں نے تمام دنیا دلا دیا کہ تو میری بھتیجی ہو۔ آفتاب میرا سپلا کا بک تھا جس کے ہاتھ میں نے تجھے اچھے داموں بیچ

بھی تجھے میری بھتیجی سمجھتا رہا ہے اور مجھے ایک معزز آدمی۔ اچھا ہوا وہ مر گیا ہے۔ اب میں تجھے دوسرے کا بک کے ہاتھ بیچوں گا۔"

نیلوفر کے ہونٹ لرز رہے تھے اور اس کے سامنے کمرے کی ہر چیز تیزی سے ایک چکر میں گھوم رہی تھی۔ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں انکل! آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔۔۔ ڈرا رہے ہیں نا؟ میں آپ کی بھتیجی ہوں نا؟" ۔۔۔ اور شکست خوردہ اور خوف زدہ سی ہنسی ہنسنے لگی۔

کاردار اسے رینگنے والے بے بس کیڑا سمجھتے ہوئے بولتا ہی چلا گیا۔ "تو مجھے کہتی ہے کہ تو آزاد ہے؟ تو میری محتاج نہیں؟ ۔۔۔ اور تو کہتی ہے کہ میں تجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔۔۔ بے بس لڑکی! تیری تمام عمر اب دھوکے کے قلعہ میں گزری ہے اور گزر جائے گی۔" ۔۔۔ اس کی آواز یک لخت بلند ہو گئی بولا جا اور چیخ چیخ کر کہہ کہ تجھے کاردار نے اغوا کیا تھا۔ تیری کوئی نہیں سنے گا۔ قانون اور پولیس میری مٹھی میں ہے۔ زمانہ جانتا ہے تو میری بھتیجی ہے۔ میں اور صرف میرے دو ساتھی جانتے ہیں کہ تجھے کاغان ایک کھوہ سے اٹھایا گیا تھا۔

نیلوفر تھر تھر کانپتے لگی بلی کی طرح چیخی اور چلا کر بولی۔ "نکل جا یہاں سے، بردہ فروش! عصمتوں کے بیوپاری! میرے خاوند کو تو نے ہی قتل کیا ہو گا۔ تجھے دوسرے کا بک کی ضرورت تھی نا۔۔۔ مجرم، بدکار۔"

کاردار نہیں بڑا اور بولا۔ "میں بیوپاری ہوں۔ قاتل نہیں۔ میں ڈاکو بھی نہیں۔ لاہور، پنڈی اور مری کے سوشل اور سرکاری حلقوں میں میرا مقام بہت بلند ہے۔۔۔۔ اور کان کھول کر سن لے۔۔۔۔ تجھے میری مرضی کے مطابق دوسری شادی کرنا ہو گی۔ نہ کرو گی تو وہیں سنیما دیا جاؤ گی جہاں ہر رات تیرا نیا بندہ ہو گا اور صبح صبح فتہ ہو گا۔ میرے ایک اشارے پر تجھے دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا جائے گا۔"

رات گزرتی جا رہی تھی۔ نیلوفر کا کمرہ کاردار کی دھمکیوں اور پر اسرار ڈراؤنی باتوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ ان کی تاثیر اور ہول ہر طرف پھیل گیا تھا۔ نیلوفر کبھی تو ڈھے کی کیفیت طاری ہوتی تھی کبھی وہ کاردار کے قدموں میں گر پڑنے کو تیار ہو جاتی تھی، کبھی کوئی قوت کاردار کا منہ نوچ لینے کو اس کے سینے سے لپٹ جاتی تھی۔ وہ بیک وقت بزدل بھی تھی۔ نڈر بھی، آزاد بھی، اسیر بھی، لیکن بے آسرا تھی اور اسے رہ رہ کر آفتاب یاد آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ زندہ ہوتا تو کاردار کو گولی مار دیتا۔

اس بے بسی میں اسے جمیل بھی یاد آیا اور جمیل کے خیال نے اسے سنبھالا دیا۔ اسے یوں بن سائبان ہوا جیسے جمیل اس کی آبرو کا رکھوالا ہے۔ جس انداز سے اسے جمیل گھر چھوڑ گیا تھا اس کے بعد وہ کیوں نہ سمجھتی کہ جمیل اس کے دکھ درد کا ساتھی ہے لیکن اس خیال سے دل ڈوب گیا کہ وہ تو دور ہے اور کسی دوسری دنیا کا انسان ہے۔ پھر تلخ سا خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے جمیل ہی الواقع مجرم ہو۔ ان جانے؟

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"ایک بار پھر سوچ لے۔" کاروار نے کہا۔ "میری مانے گی تو وہی بادشاہی کرے گی جس کے تو خواب دیکھ رہی ہے، ورنہ۔۔۔" اور وہ باہر نکل گیا۔

نیلوفر کا ذہن خالی ہو گیا، پھر اسے چکر آ گیا۔ وہ صوفے پر یوں گر پڑی جیسے اس پر غشی طاری ہو گئی ہو۔ اسے کاروار نے جو کچھ کہا تھا، وہ ہضم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی کہ کسی ملک کا قانون اتنا کمزور ہو سکتا ہے کہ جس طرح کاروار نے کہا تھا اس طرح کسی شہری کی مٹھی میں آ جائے۔ البتہ نیلوفر نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کا انکل کاروار سوسائٹی میں کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ رکھتا ہو، آدمی اوچھا ہے۔ اس نے نیلوفر کو خوفزدہ اور بے بس کرنے کے لیے ایسی باتیں کی ہیں تاکہ وہ دوسری شادی کرے اور کاروار اپنے کاموں میں مصروف ہو جائے۔

اسے یہ بھی خیال آیا کہ جمیل نے کاروار کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ جھوٹ ہو گا، مگر اس پہاڑی اور گنوار کی باتوں اور کاروار کی باتوں میں جو فرق تھا وہ نیلوفر کو کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ جمیل کی وہ قیدی بن گئی تھی اور جمیل اسے گھر چھوڑ گیا تھا۔ کاروار کی وہ قیدی نہیں تھی لیکن کاروار اسے اپنا قیدی سمجھ رہا تھا۔

نیلوفر کا دماغ سوچنے اور سمجھنے سے معذور ہو گیا۔ اس نے کاروار کی سہ پہر کی باتوں کو ذہن سے اگل دیا۔ اس کھڑی شوفی ذہنی کیفیت میں اسے یاد آیا کہ آفتاب کی دو انشورنس پالیسیاں ہیں۔ دونوں پچاس پچاس ہزار روپے کی تھیں۔ جائیداد پر اگر کاروار کا ہی قبضہ ہو گیا تھا تو یہ دو انشورنس پالیسیاں نیلوفر کے لیے کافی تھیں، مگر اسے اچانک یاد آیا کہ پالیسیوں کے کاغذات بھی غائب ہیں۔

جمیل کی ماں کمرے میں آئی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ماں نے دیکھا کہ نیلوفر کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کے آنسو رہ رہے تھے۔

"کیوں بیٹی!" ۔۔۔ نیلوفر کو اپنی نوکرانی کی سرگوشی سنائی دی۔ اس آواز پر نیلوفر کی پلکیں کھل گئیں۔ جمیل کی ماں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "بارش میں بھیگتی رہی ہو۔ بال خشک کر لو۔ تمہارا چہرہ غصے میں پول رہا تھا۔ میں کھانا لے کر آتی اور دوا لے لیتی۔"

اس وقت نیلوفر کو ایسے ہی ایک ہمدرد کی ضرورت تھی جو چہار بھرے لمس سے اس کے دکھے دل اور کرائے اعصاب کو سہارا دے۔ جمیل کی ماں اسے ڈوبتے وقت تنکے کا سہارا دے رہی تھی۔

"کچھ کھا لے بیٹی!"

"کھا لوں گی اماں!" ۔۔۔ اس نے جمیل کی ماں کو [illegible] دیکھتے ہوئے کہا۔

کے سینے میں جوالا مکھی کا سا بھڑک اٹھا تھا انہیں اگل دینے کو تڑپنے لگی۔ بے چین ہو کر بولی۔ "دل جل رہا ہے اماں!" ۔۔۔ اس نے سسکی لی اور کہا۔ "جی چاہتا ہے خاوند تو مر گیا ہے، میں کیوں جیتی رہوں؟ کیا فرق پڑ جائے گا اس دنیا میں اگر میں مر جاؤں تو؟" ۔۔۔ اور وہ ہچکی لے کر خلاؤں میں گھورنے لگی۔

"نہ بیٹی!" ۔۔۔ جمیل کی ماں نے کہا۔ "ایسا کفر منہ سے نہ نکالو۔ زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ کے کاموں میں دخل نہ دو۔ اللہ پر بھروسہ اور یقین رکھو۔۔۔ آج بھی وہ دوسری شادی کے لیے کہہ رہا تھا۔"

"آج تو اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ کفار ذلیل اور گھٹیا آدمی ہے۔" ۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ "اس نے مجھے ڈرانے کے لیے ویسی ہی باتیں کی ہیں جیسی بچوں کو ڈرانے کے لیے کی جاتی ہیں۔"

جمیل کی ماں یوں چپ ہو گئی جیسے ان بڑے لوگوں کی باتیں اس کی سمجھ سے بالا ہوں۔

نیلوفر دکھیاری سی ہنسی ہنس پڑی اور بولی۔ "کہتا تھا پندرہ برس گزرے ہیں، تمہیں کاغان کی [illegible] کھوہ سے اٹھا لایا تھا۔۔۔ وہ دراصل مجھے یہ جتانا چاہتا ہے کہ میں اتنے غریب ماں باپ کی بیٹی تھی کہ ان کا اپنا کوئی ٹھکانہ اور کوئی ٹھکی بھی نہیں تھی اور وہ مجھے کھوہ میں اکیلی چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔" ۔۔۔ نیلوفر پھر ہنس پڑی۔

جمیل کی ماں چونک اٹھی۔ اس کا ذہن ایک ثانیے میں پندرہ سولہ برسوں کی گزری ہوئی پٹ [illegible] تدت پھلانگ کر کاغان کی اس کھوہ میں جا پہنچا جہاں سے اس کی معصوم بچی کو ایک طوفانی رات کے اندھیرے اور ہنگامے میں کوئی اٹھا لے گیا تھا۔ نیلوفر اپنا غم ہلکا کر رہی تھی۔ جمیل کی ماں کو اپنا دکھ یاد آ گیا۔ اس کے دل کا یہ زخم سہت ہی گہرا تھا۔ معصوم بچی کو کوئی اٹھا لے گیا اور اس کے خاوند پر درخت کا تنہ گرا اور وہ مر گیا تھا۔ پیچھے جمیل رہ گیا تھا۔ وہ بھی بچہ تھا۔ اب ماں اس بچے کے پیچھے ماری ماری پھر رہی تھی۔

وہ قالین پر بیٹھ گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ نیلوفر کو سکھی کی روٹی اور تسلی دینی ہے۔ نیلوفر کی سننے والی کون تھا۔ جمیل کی ماں ہی تھی جس کے دل میں اتنا خلوص اور پیار تھا کہ نیلوفر اسے نوکرانی نہیں، ماں سمجھنے لگی تھی۔ اس کی زبان کھلی تو وہ بولتی ہی چلی گئی۔ جمیل کی ماں کو ہر ایک بات سنائی گئی جو اسے کاروار نے کہی تھی۔ جمیل کی ماں اس طرح اٹھک کر سن رہی تھی جیسے نیلوفر اسے اپنی بچی کے اغوا کی روداد سنا رہی ہو۔ وہ اور اس کا خاوند اسی طرح اپنی بچی کو کھوہ میں بلکتا کر لیٹ چلے گئے تھے۔

"میں جانتی ہوں اس نے جھوٹ بولا ہے۔" ۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ "اپنی بات منوانے کے لیے اس نے یہ بکواس گھڑی ہی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ہو سکتا ہے بیٹی!" ۔۔۔ جمیل کی ماں نے کہا۔ "[illegible] کی بچی کو اغوا [illegible] والے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کسی خاتون سے نہیں ڈرا کرتے۔"

"تو کیا میں اغوا کی ہوئی ہوں؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں"۔۔۔ جمیل کی ماں نے کہا۔ "تم خانہ بدوشوں کی بچی ہوتی تو اغوا کرنے والے تمہیں کوٹھی میں بسا کر رانی نہ بناتے۔ ہماری لڑکیاں اغوا ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں لوگ بہلا پھسلا کر بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ کوئی شادی نہیں کرتا۔ انہیں وہاں جا بٹھاتے ہیں جہاں تم کہتی ہو کہ تمہارے چچا نے کہا ہے کہ میرات ان کا نیا خاوند ہوتا ہے اور وہ ہر صبح ہیرا ہوتی ہیں۔ اللہ تمہیں محفوظ رکھے بیٹی!۔۔۔ تم یہ بھی ہو سکتا ہے اپنے سر سے اتار نے کی کوشش کر رہا ہے۔ اتنا غم نہ کرو۔۔۔ میں تمہارے لیے روٹی لاتی ہوں۔"

نیلوفر کی جھوک مر چکی تھی۔ اس کے اعصاب پر کارواں اور جمیل بدروحوں کی طرح قابض ہو گئے تھے۔ دونوں کی باتیں اس کے گرد سینکڑوں بھڑوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو گیا تھا کہ کون اچھا کون برا ہے؟ جھوٹ کیا اور سچ کیا ہے؟ وہ سمجھی کی روٹی اس لیے کھا رہی تھی کہ جمیل کی ماں کا دل ہو ٹوٹے۔ اس لیے بڑے پیار سے اس کی فرمائش پر روٹی پکائی اور لسی بنائی تھی۔ اس کا ہاتھ مشین کی طرح نوالہ توڑتا اور منہ میں ڈال رہا تھا۔ کبھی ہاتھ نوالہ پکڑے منہ سے کچھ دور رک جاتا اور نیلوفر کی آنکھیں ٹھہر جاتی تھیں۔

جمیل کی ماں اسے بڑی ہی غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی بچی یاد آ گئی تھی۔ اس کی بچی کا نام ہاجرہ تھا۔ اس لڑکی کا نام نیلوفر تھا۔ ماں تصوروں میں اپنی بچی کو نیلوفر کی عمر میں لا کر دیکھ رہی تھی۔ نیلوفر بھی خوبصورت لیکن ماں نیلوفر کو زیادہ خوبصورت سمجھ رہی تھی۔ اگر ہاجرہ ماں کے پاس ہوتی تو جوان ہو کر کسی بیماری مزدور کی بیوی اور نیلوفر جیسی کسی شہزادی کی کوٹھی میں نوکری کر رہی ہوتی۔ اس کا دل کی بھاڑ پونچھ۔ روٹی پکڑے کے چکر اور بچے جلنے میں گم ہو چکا ہوتا۔

جمیل کی ماں نے اپنے دکھے ہوئے دل کو سہلانے کے لیے تصوروں میں اپنے آپ کو یہ بھی دکھایا کہ نیلوفر ہی اس کی محنتہ ہاجرہ ہے مگر اس تصور سے وہ جھینپ گئی۔ وہ خواب میں بھی نیلوفر کو نیلوفر کے روپ میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی جسے اس نے اوپر نہ آنے دیا۔ اس کے جی میں آئی کہ نیلوفر کو سنا دے کہ اس کی بچی کس طرح اغوا ہوئی تھی لیکن وہ رکی۔ اس کوٹھی میں نوکری کے پہلے روز اس نے نیلوفر کو اتنا ہی بتایا تھا کہ خاوند مر گیا ہے اور بچی کو اٹھا لے گیا تھا۔ نیلوفر نے اس سے پوچھا تھا کہ بچی کو خان اٹھا لے گیا تھا جمیل کی ماں نے اس

کے انکار سے نیلوفر کے آگے اگلنے سے اس لیے گریز کیا تھا کہ یہ تو خود کھیاری اور عزدہ ہے۔

اب بھی اس نے اپنی بچی کی یاد کو اور اس کے غم کو اپنی ذات میں ہی گم کر دینے کی کوشش کی۔ نیلوفر نے کھانا کھا لیا۔ تب جمیل کی ماں کو خیال آیا کہ نیلوفر نے کپڑے نہیں بدلے۔ کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور شلوار کیچڑ سے لتھڑی ہوئی تھی۔ وہ کئی جگہ گری تھی۔ اس کی شلوار پر گھاس کے ہرے ہرے نشان بھی تھے۔

"یہ کپڑے تو بدل لو"۔۔۔ جمیل کی ماں نے کہا۔ "دیکھو تو کیچڑ سے کیا حال بن گیا ہے"۔۔۔ وہ اٹھی اور بولی۔ "تم بیٹھو، ہمیں لاؤ جی دیں"۔

وہ کپڑے لے آئی۔ نیلوفر کپڑے بدلنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف چلی تو ماں نے کہا۔ "یہیں بدل لو بیٹی اور سو جاؤ۔ نیند لگ جائے گی۔ اس وقت نہانا مت۔ میں تولیہ لاؤں گی۔ یہیں جسم پونچھ لو"۔۔۔ وہ دوڑ کر تولیہ لے آئی۔ نیلوفر نے ابھی کپڑے نہیں بدلے تھے۔ وہ کپڑے بدلنے کے موڈ میں تھی ہی نہیں۔

"ٹھہرو، قمیض میں اتروا دیتی ہوں۔ دیکھو کس قدر گندی ہو گئی ہے"۔۔۔ وہ۔ اس نے نیلوفر کو معصوم بچی سمجھتے ہوئے اور اس کی چھچھا۔ سٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی قمیض اتار دی۔

عورت کا عورت سے پیار ہوتا ہے۔ اس عورت کو تو نیلوفر نے ماں کا درجہ دے رکھا تھا ذرا سی دیر میں اس کی جھوک دور ہو گئی۔ جمیل کی ماں اس کا جسم تولیے سے پونچھنے لگی اسے پھر اپنی ہاجرہ یاد آ گئی۔ اس کے ہاتھ رکنے لگے اور یاد کا قافلہ پھر چل پڑا۔ وہ سوچنے لگی۔۔۔ "میری ہاجرہ زندہ ہوتی تو اس کا جسم بھی اتنا ہی خوبصورت۔ اتنا ہی نازک اور ایسا ہی گداز ہو گا؟"

نہیں ایسے جسم تو انسانوں سے نہیں۔ محنت کرانے والوں کے ہوتے ہیں۔ خدمت کرنے والوں کے جسم تو پتھر ہو جاتے ہیں۔

وہ نیلوفر کے جسم سے ہوئے ریشم جیسے ملائم بال تولیے میں سمیٹ کر خشک کرنے لگی تو نیلوفر کے اندر سے اور پھڑکنے ہو گئی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ پھر اس کا دایاں ہاتھ نیلوفر کے سینے پر آہستہ آہستہ پھیرنے لگا۔

"جذبا لگتا ہے تمہارا"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ "مجھے یہ بتانے کے لیے کوئی بھی زندہ نہیں کہ یہ زخم کب کیسے آیا تھا۔ خاصا لمبا چوڑا زخم ہے۔ نشان بہت برا لگتا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں یہ زخم کب کا ہے؟"

جمیل کی ماں کو خوفزدہ سی جیسی چپ لگ گئی تھی۔ وہ نیلوفر کے کندھے پر زخم کے اس بھدے سے نشان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس نشان کے کندھے پر اسی جگہ اور اسی جیسا زخم کا نشان تھا۔ یہ نشان اس کی بچی کے اندر سے ایک سال پہلے کا تھا۔ وہ ایک درخت پر چڑھتے گر گئی تھی

www.paksociety.com

اور ایک نوکیلے پتھر نے اس کے کندھے کے پیچھے کو کاٹ دیا تھا۔ اس کے ماں باپ ایک دیہاتی جراح سے علاج کراتے رہے تھے۔ زخم بے ڈھب اور گہرا تھا۔ جراح جانے اس میں کیا کچھ بھرتا رہا جس سے زخم تو ٹھیک ہو گیا لیکن وہاں ابھرا ہوا ایک نشان رہ گیا جو بڑا ہی بھدا لگتا تھا۔

اچانک اسے نیلوفر کی سنائی ہوئی وہ باتیں یاد آ گئیں جو اسے کاروار کو کہا گیا تھا۔ "کاغان کی ایک کھوہ سے تجھے اٹھایا تھا جہاں تو میٹھی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ تیرے ماں باپ لکڑیاں چننے چلے گئے تھے.... طوفانی رات.... خانہ بدوش کی بچی!"

ماں تڑپ اٹھی۔ اس نے نیلوفر کے بال سمیٹ کر گردن بائیں طرف اور ذرا آگے کو دیکھا۔ وہاں ایک سیاہ تل تھا جو چھوٹا سا نیس تھا۔ اس کی باجرہ کی گردن پر بھی تل تھا۔ گوری گردن پر یہ تل بڑا اچھا لگتا تھا۔

جمیل کی ماں نے ایک اور بات دیکھی جو وہ پہلے روز سے ہی نیلوفر میں دیکھ رہی تھی۔ نیلوفر کسی سے بات کرتے وقت دائیں یا بائیں گردن گھما کر دیکھتی تھی تو وہ گردن کو بڑا ہی پیارا سا خم دیا کرتی تھی۔ ماں کو یاد تھا کہ جمیل کا باپ کہا کرتا تھا۔ "باجو جب گردن گھماتی ہے تو کتنی پیاری لگتی ہے!"

نیلوفر کی یہ عادت آج بھی ویسی ہی تھی اور گردن کا خم بھی وہی تھا۔

ماں کے سینے سے ہوک اٹھی۔ ایک چیخ تھی جو آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح امڈ آئی تھی لیکن ماں نے ہونٹوں کو بھینچ کر حلق میں ہوئی اس چیخ کو سینے میں ہی بھسم ہو جانے کے لیے روک دیا۔ اس کے بازو آگے کو پھیل چلے تھے لیکن ماں نے تمامتر قوت صرف کر کے بازوؤں کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ اسے خیال آ گیا کہ بچی پہلے ہی دکھی ہے۔ اگر میں اسے بتا دوں کہ میں تیری ماں ہوں اور تجھے میری گود سے نوچا گیا تھا تو اسے اور زیادہ دکھ ہو گا۔ بچی اس وقت محلوں کی رانی ہے۔ دکھی تو ہے پر میری طرف دور کی نظروں تو نہیں کھا رہی۔

تھوڑی ہی دیر پہلے اس نے اپنے غمزدہ دل کو بہلانے کے لیے اپنے آپ کو یہ خوبصورت فریب دیا تھا کہ نیلوفر اس کی باجرہ بیٹی ہے مگر جب اسے ثبوت مل گئے کہ نیلوفر ہی اس کی گمشدہ بچی ہے تو اس نے اپنے آپ کو یہ فریب دینے کی کوشش کی کہ نہیں، یہ میری بچی نہیں۔ کاروار کی باتوں نے اس کے شکوک رفع کر دیئے تھے۔

اس نے چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے اور وہ اپنی بچی کو سینے سے لگا لینے کو بھی بیتاب ہونے لگی وہ پلنگ کے وہ پائوں میں پلٹنے لگی۔ ماں نے احساسات کو پس ہی جانے دیا اور جذبات کو کچل دینے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف ہو گئی۔

"نیند آ رہی ہے اماں!" — نیلوفر نے تھکے ماندے لہجے میں کہا۔

"سو جا باجو بیٹی!" — ماں کے منہ سے اپنی گمشدہ بچی کا نام نکل گیا۔

"کیا کہا اماں؟" — نیلوفر نے گردن کو وہی بچپن والا پیارا سا خم دے کر ماں کی طرف دیکھا اور خفیدی سی ہنسی ہنس کے پوچھا۔ "یہ کیا نام دے دیا مجھے اماں؟"

ماں کو بڑی زور کا ہچکی لگا۔ اس کا جسم تھرکا لیکن سنبھل گئی اور بولی۔ "میری جو بچی گم ہو گئی تھی اس کا نام باجو تھا۔ آج تم سے باتیں کر کے وہ یاد آ گئی اور اسی کا نام منہ سے نکل گیا۔" ماں نے ہچکی کو دبا لیا۔ "سو جا میری بیٹی!.... سو جا۔"

اور وہ جلدی جلدی کمرے سے نکل گئی۔

*

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سی۔آئی۔اے کے انسپکٹر فرشتے نہیں تھے۔ جادوگر اور جوتشی نہیں تھے۔ آفتاب کے قتل کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا مگر واردات آفتاب کے قتل سے بہت آگے بڑھ گئی اور پیچیدہ ہو چکی تھی۔ انسپکٹر خالد لاپتہ ہو گیا تھا جس کا مارے ساجی نے انگوٹھی خریدی تھی اور بھی لاپتہ تھا۔ اس سے پہلے جمیل نام کا ایک ملزم بکڑا گیا تھا مگر وہ بڑی دلیری سے حوالات سے پھر پولیس کے شکنجے سے نکل گیا تھا۔

سی۔آئی۔اے نے راولپنڈی ضلع اور آزاد کشمیر کے تمام تھانوں کو نوٹس بھیج دیئے تھے جن میں جمیل، انسپکٹر خالد اور سمین دکاندار کے حلیے اور عمر اور واردات کی تفصیلات لکھی گئی تھیں۔ تمام تھانوں کو کہا گیا تھا کہ ملزموں کی تلاش میں سرگرم ہو گئے تھے۔

مری کے تھانے میں سزا یافتہ اور عادی مجرموں کی شامت آئی۔ جتنی بھی۔ اب وہ آدمی ایسے لاتے آتے تھے جو دو تین بار کے سزا یافتہ اور بتجربہ کار جرائم پیشہ تھے۔ وہ مری میں گھومتے پھرتے پکڑے گئے تھے۔ ان پر اتنا تشدد کیا گیا کہ انہوں نے راولپنڈی کی بک ڈکیتی کا اقبال جرم کر لیا۔ ان سے ایسی کئی وارداتیں ملتی جلتی تھیں جن سے امید بندھ چلی تھی کہ آفتاب کے قتل اور اس سے وابستہ دوسری وارداتوں کا سراغ مل جائے گا مگر وہ انکار کر رہے تھے۔ پولیس نے انہیں یہ بھی کہا کہ ان میں سے جو بھی تمام شہادت اور ثبوت مہیا کرے گا اسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا۔ پھر بھی وہ مری کی وارادت سے لاعلمی ظاہر کرتے رہے۔

ایک انسپکٹر نے ان کے اقبال جرم کی یہ قیمت بھی پیش کر دی کہ ان کی راولپنڈی والی ڈکیتی کو ل کر دی جائے گی۔ ان دونوں نے یہ پیش کش بھی قبول نہ کی تو یقین ہونے لگا کہ مری کی وارادت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

سی۔آئی۔اے کے انسپکٹر تفتیش کا رخ انسپکٹر خالد کی طرف پھیرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک سنجیدہ کار انسپکٹر نے کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ انسپکٹر خالد بھی اس واردات میں ملوث ہے۔ یہ واردات اسی نے کرائی ہے اور اب وہ روپوش ہو گیا ہے۔ اس انسپکٹر کا تو قف یہ تھا کہ اتنی وارداتوں اور اس نے فوراً بعد وارداتوں کا سلسلہ اور حوالات سے مزید کا بھاگ جانا پولیس کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

اس پر بحث مباحثہ ہوتا۔ اور تھانے کے عملے کے ہر فرد کو پوچھ گچھ اور تفتیش کے دیگر طریقوں کی چکی میں ڈالا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مخبروں کی ایک فوج مری کے اندر اور باہر پھیلی ہوئی تھی۔

کاروار اپنی حیثیت اور اثر و رسوخ کے زور پر پولیس کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔ وہ ہر روز تھانے جاتا جو پوچھتا کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے اور کوئی سراغ ملا ہے یا نہیں۔

"آپ کی بھتیجی نیلوفر کے ذہن پر اس صدمے کا بہت اثر معلوم ہوتا ہے۔" ایک روز ایک پولیس انسپکٹر نے کاروار سے کہا۔ "اس کی بعض باتوں سے شک ہوتا ہے جیسے اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔"

"آپ نے کیسے محسوس کیا؟"

"کبھی کہتی ہے آفتاب صاحب قتل نہیں ہوئے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کبھی کہتی ہے کہ وہ حوالات سے بھاگ گیا ہے۔ وہ بیگناہ معلوم ہوتا ہے۔ میں جب اس سے کچھ پوچھتا ہوں تو وہ بے معنی باتیں کرنے لگتی ہے۔ بعض اوقات پتہ چلتا ہے جیسے اسے بہت کچھ معلوم ہے لیکن یہ شک رفع ہو جاتا ہے جب وہ بے سر و پا باتیں کرنے لگتی ہے۔ کچھ پوچھو تو چپ۔ چاپ خلاؤں میں دیکھنے لگتی ہے۔"

"اس لڑکی کی سب سے بڑی پریشانی ندیم کاروار نے کہا۔ "وہ واقعی دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ صدمہ معمولی نہیں۔ یہ لڑکی میرے لیے باعث تلخ مسئلہ بن گئی ہے۔ مجھے پتہ نہیں چلتا، وہ جنگلوں میں کیسے جاتی ہے۔ ساری ساری پھرتی رہتی ہے۔ ہاں ایسی اوٹ پٹانگ کرتی ہے کہ جلا کے رکھ دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت آپ کے ساتھ میرے خلاف باتیں کرنے لگے۔"

"اس پر نظر رکھیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "جوان لڑکی ہے۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ اسے باہر نہ نکلنے دیا کریں۔"

نیلوفر ڈرائیور سے جاگی۔ رات کی تھکان اور خوف ابھی تک اعصاب پر سوار تھا۔ اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھ کے جاگی ہو۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے بدنصیبی کا قیدی زندگی کے آخری روز کے لمحات گن رہا ہو۔ جھانجھا بکھرا ہوا سے کالی کٹھڑی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ یقین نہیں تھا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔

نوکر چائے لے کے کمرے میں آیا تو نیلوفر بولی۔ "آنٹی کہاں ہے؟ چائے نہ کیوں لائے ہو؟"

"وہ تو جا رہی ہے۔" نوکر نے جواب دیا۔ "بوریا بستر باندھ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ نے جواب دے دیا ہے۔"

"عجیب خبطن ہے۔" نیلوفر نے کہا۔ "جاؤ، اسے میرے پاس بھیج دو۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ آئی تو نیلوفر نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور ناک لال سرخ ہو رہی تھی۔ وہ تمام راستے رو رہی تھی۔

"تمہیں جانے کو کس نے کہا ہے اماں؟"

ماں نے ہچکی لی اور لڑکھڑاتی زبان کو بڑی مشکل سے سنبھال کر بولی ——"میری بیٹی! اب چلے ہی جانے دو"—— اور وہ سسکیاں لے لے کے رونے لگی۔

"آخر کیوں؟" —— نیلوفر نے پوچھا۔

"بیٹا یادآرہا ہے.... رات اسے خواب میں دیکھتی رہی ہوں"—— اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

"جانے کہاں ہوگا کس حال میں ہوگا؟"

نیلوفر کو معلوم نہ تھا کہ اس کی ماں نے رات کوئی خواب نہیں دیکھا۔ وہ تو رات بھر بڑی ہی بھیانک حقیقت سے دوچار رہی ہے۔ اس نے شب بھر پلک بھی نہیں جھپکی اور وہ بے چینی سے اُٹھ اٹھ کر باہر نمک کنکی میں گھومتی رہی تھی۔ جب بیقراری بڑھتی چلی گئی تو اس نے رات کا آخری پہر برآمدے میں نیلوفر کے سونے کے کمرے کی بند کھڑکی سے لگے کر کھڑے گزار دیا تھا۔ وہ جس بیٹی کو سینے سے نہیں لگا سکتی تھی، رات برآمدے میں کھڑی اُس کی نیند میں سنگھتی رہی تھی۔ پھر وہیں بیٹھ گئی تھی اور سر گھٹنوں میں دے کر سوچتی رہی تھی کہ نیلوفر کو بتا دوں کہ تو نیلوفر نہیں ماہ جبیں ہے؟ تو محلوں کی رانی نہیں غلامہ دشموں کی بیٹی ہے؟ تو اس محل کی بہن ہے جو تیرا نام شن کے دیوانہ ہو گیا تھا اور پگلا جانے کون سے دیس بھٹک رہا ہوگا!

ماں نے بہت سوچا، بہت ہی سوچا۔ آخر دل کو مٹھی میں دبوچ کر اس ارادے سے اُٹھ بیٹھی تھی کہ یہاں سے چلی ہی جائے گی اور دل کو فریب دے لے گی کہ ماہ جبیں مر گئی ہے اور نیلوفر دھنی والوں کی بیٹی ہے

"جانے میرا دل تیرے ساتھ کیوں لگ گیا تھا اماں!" —— نیلوفر نے غم آلود لہجے میں کہا —— "تم نہ ہوتیں تو شاید میں رات خودکشی کر لیتی.... میرا تیرے کوئی ساتھ نہیں تھا اماں، بس آزاد ہو، میں قید ہوں۔ رک جاؤ... چند دن اور رک جاؤ۔ نوکر انیاں تو بہت مل جائیں گی.... لیکن...." —— نیلوفر کی آواز رقت میں دب گئی۔

ماں کی حسرت بھری نظریں بیٹی کو دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں —— "تم نہ جانو ماہ جبیں، تو جانتی ہوں کہ تیرا دل میرے ساتھ کیوں لگ گیا تھا۔ تم میرے سے ہی جگر کا ٹکڑا ہو، میرے ہی وجود کا حصہ ہو۔ تمہیں میرے ہی گھر سے لوٹ جانا تھا۔ دل نہ لگے تو کیوں نہ لگے!"

"کیوں سوچ میں پڑ گئی ہو اماں؟" —— نیلوفر آنچل کو اس کے قریب لے گئی اور طول سی مسکراہٹ سے گردن کو دبی کپکپی والا غم دے کے بولی —— "میری اچھی اماں! بس اب مان جاؤ"

ماں کے سینے سے بند ٹوٹ گئے۔ ماننا نہ ہے جو رو گی دبا رکھا تھا اس کے باہر آ گیا اور ماں نیلوفر سے لپٹ گئی اور پاگلوں کی طرح اس کے سر، رخساروں، گردن اور ہاتھوں کو چومنے لگی —— "میری بچی.... میری اچھی

وہ ہچکیوں اور دیوانہ وار بوسوں کی زبان میں کہہ رہی تھی —— "میں تجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں، کبھی نہ جاؤں گی...." اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

نیلوفر عورت تھی۔ عورت کی ہچکیوں سے اس کے بھی آنسو نکل آئے۔ بولی —— "تیرا بیٹا بچہ تھوڑے ہی ہے جو کہیں کھو گیا ہوگا۔ ایسا پاگل بن بھی کیا۔ چند روز اور نہ ملا تو اپنے دیس چلی جانا۔ اسے کبھی تو چھٹی ملے گی ہی تو گھر آئے گا۔"

نیلوفر کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ ماں اسے سمجھا نہ سکی۔

ماں نے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنی کل متاع، پرانی سی ایک دری، ہلکا پھلکا سا ایک لحاف، شلوار اور ایک قمیص باندھ لی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ نیلوفر کو دیکھے بغیر نکل جائے گی لیکن اسے دیکھا تو سناٹوں کی زنجیریں بج گئی۔ اس نے آدمی اور آہ کے بھید میں ہی زیر لب کہا —— "نہیں جاؤں گی.... جاہی کیسے سکتی ہوں"—— اور وہ کمرے سے نکل گئی۔

آفتاب زردہ تھا تو نیلوفر اُس کے ساتھ شکار کو نکل جایا کرتی تھی یا کرتے کے گھوڑوں پر دونوں مری کی جایا کرتے تھے۔ بارش ہوتی تو گھر میں بیٹھے کیرم کھیلا کرتے تھے مگر اب نیلوفر کی زندگی کے لمحات ایک پتھر کی طرح گھوم رہے تھے اور اس پر ہر آن ڈوبنے کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جس وقت سے اس کے متعلق بھیانک انکشاف کر کے اور اسے دھمکی دے گیا تھا، بھنور اور تیز ہو گیا تھا اور نیلوفر بھنور کھا کر ڈوب رہی تھی۔ زمین و آسمان اس کے گرد تیزی سے گھوم رہے تھے۔

سوسائٹی اب بھی اُسے کسی ڈرکسی پارٹی، کسی کی سالگرہ یا کسی اور تقریب کے دعوت نامے بھیجتی تھی لیکن نیلوفر نے اپنے آپ کو دنیا کی گہما گہمی اور تماشا ہی سے نوچ لیا تھا۔ وہ اب دادیوں کے گھنے جنگلوں میں بھولے کو بتایا رہنے لگی تھی۔ جب سے اس کا خاوند قتل ہوا تھا، دعوت ناموں کی رفتار تیز تر ہو گئی تھی لیکن وہ دن کا حلقہ وسیع ہو گیا تھا جو محفوظ کر اور امید وار زیادہ تھے جب وہ نیلوفر کے قریب آنے لگے تو وہ اتنی بھاگ جانا چاہتی تھی جہاں سے اسے ان کی مسکراہٹیں نظر نہ آسکیں، غلامبرداری کی باتیں اور اداکاری نہ دکھائی دے سکے۔

آج صبح وہ جمیل کی ماں کو رہنے پر راضی کر کے سوچنے لگی کہ رات تو اوگھٹنے، سوتے، جاگتے گزر جاتی ہے۔ دن کیسے کٹے؟ اچھی کوئی نہ کوئی ترکیب کا۔

وہ کمرے سے نکلی اور ماں کو بلا کے کہا —— "رات تو میں کچھ بھی کھا نہ سکی تھی۔ آج پھر سکی کی روٹی اور لسی میں ذرا گھوم پھر آؤں"

"نہیں بیٹی! جلدی لوٹ آنا" —— ماں نے کہا —— "آدمی دن کا کچھ بھروسہ نہیں" —— اور اس کا دل یوں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بننے لگا جیسے آندھی میں اس کی ٹہنی کو کوئی جھر جھٹا لے جائے گا۔

نیلوفر خراماں خراماں کوٹھی سے باہر نکلی اور سڑک پر آگئی۔ اس نے بغل میں چھوٹا سا بنڈل چھپا رکھا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر بنڈل کو دبچا اور چل پڑی۔ اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔ دل و دماغ میں ایسی چبھن محسوس ہو رہی تھی جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ کاروار نے جو انکشاف کیا تھا، وہ زہریلی غلیل بن گیا تھا۔ نیلوفر اپنے یقین تھا کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ اس کے ذہن و دل سے کبھی کے اتر گئے تھے۔ شادی سے پہلے کبھی یاد آتے تھے تو وہ ان یادوں کو اگل دیا کرتی تھی۔ شادی ہوئی تو آفتاب کی محبت میں وہ سب کچھ ہی بھلا دیا گیا تھا۔

اب کاروار نے اس کے ماں باپ کو اس کے سامنے نئے روپ میں کھڑا کر دیا تھا۔ نیلوفر کے تصور میں اُلجھی ہوئی راہوں پر بھٹکنے لگے۔ اسے ایسا نوکر کی دکھ نہ تھا کہ وہ خانہ بدوش تھے۔ اس نے سوچا، خانہ بدوش ہی سہی، ماں باپ تو تھے۔ جانے اب کہاں ہوں گے؟ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟ ان دو سالوں نے کا... کی لگاتی ہوئی آگ کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔

نیلوفر کے ذہن میں اچانک نہایت اہم سوال آیا اور وہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی۔ تو پولیس کو ساری بات سنا دوں؟ — اسے لمحہ بھر کے لیے مسرت سی ہوئی جیسے پولیس نے اسے پناہ میں لے لیا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سہم سی گئی۔ کاروار کے اخروٹ سونغ اور اس کی سوشل پوزیشن سے وہ پوری طرح آگاہ تھی۔ بچپن سے اس پر کاروار کی شخصیت کا جو اثر تھا اس کا بھی اس قدر جلدی اثر جانا ممکن نہ تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ وہ کاروار کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے گی۔ کون مانے گا کہ اسے کاروار نے اغوا کیا تھا۔ کراچی... مری تک کے لوگ جانتے تھے کہ نیلوفر کاروار کی بھتیجی ہے۔

سمجھ لیجیے ہی گئے اور اس بے بسی نے اسے تڑپا دیا کہ وہ کاروار کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اس... وہ اپنا کا توازن اگر ذرا سا قائم تھا تو وہ بھی بگڑ گیا۔

وہ تلخ خیالوں اور خوشنما تصوروں میں اُلجھتی ہوئی چلتی چلی گئی اور سڑک سے ہٹ کر پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ جھاڑیوں اور پودوں میں ڈھکے ہوئے اس تنگ سے راستے پر چلتے چلتے وہ گھنے جنگل میں آ نکلی۔ جھاڑیاں اور خار دار بیلیں قدم قدم پر اس کا دامن کھینچ رہی تھیں اور وہ تیز تیز چلی جا رہی تھی۔ گاہے گاہے اس کا دماغ تیزی سے سوچنے لگتا اور کبھی تھک کر اونگھنے لگتا تھا۔ ایسی کیفیت میں وہ لاشعوری طور پر کاروار کو اور مخدوم کو پیچھے دیکھنے لگتی جیسے اس کا دماغ پیچھے رہ گیا ہو اور وہ آگے نکل گئی ہو۔

وہ گھنے جنگل میں پھسلتی، سنبھلتی، گل بوٹوں اور کانٹوں سے اُلجھتی جانے کتنی بلندی چڑھ گئی تھی۔ نیچے اُتری اور پھر بلندی چڑھ گئی تھی۔ اگر سانس ہانپ نہ جاتی تو اسے چڑھائی کا احساس تک نہ ہوتا۔ وہ رک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ جنگل کے پیڑوں اور گھنی جھاڑیوں سے اسے دور نیچے مری کے مکانوں کی چھتیں اور

...ں کے کالے منڈلاتے نظر آتے۔ اسے بلندی کا انوکھا سا احساس لطف سا دینے لگا اور مسرت کی ...جیسی سی رو اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر کے اسے تازگی دینے لگی۔

وہ آناً فاناً بلندی سے لڑھک کر دور نیچے ایک اندھیری گھاٹی میں جا گری۔ اس کے جسم پر ایک چیتھڑا سا لپٹا تھا اور سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ اندھیرے سے ایک ہاتھ بڑھا اور اسے دبوچ کر اندھیرے سے گھسیٹ لیا۔

بچپن کے اس بھیانک تصور نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے دونوں ہاتھ گریبان کے نیچے لیے آج پھر ایک ہاتھ اس کی گردن دبوچ لینے کو بڑھ رہا ہو۔ اس زہر آلود تصور نے اس کا حلق خشک کر دیا اور اس کے اعصاب کو اس احساس نے دبوچ لیا کہ وہ اس بھری دنیا میں تنہا ہے۔ مخدوم ہے اور وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس نے بڑی شدت سے چاہا کہ اب واپس اپنی کوٹھی میں نہ جائے۔ کاروار کی دنیا سے ہی بھاگ جائے اور کسی خانہ بدوش قبیلے کے ساتھ باقی عمر اندھیری گپھاؤں میں گزار دے۔

اس نے بائیں طرف دیکھا تو اسے فضا میں بادلوں کے ٹکڑے تیرتے نظر آئے۔ اس کی نگاہیں ان ...ہوئے بادلوں کے تعاقب میں اُڑنے لگیں۔ بادل جیل کے پیڑوں میں بکھر گئے۔ نیلوفر کو بکھرے ہوئے بادلوں ...نے سائے تھے وہی میدان نظر آیا جہاں وہ کل ہی تتلی کے تعاقب میں بھاگتی جھیل کی محبوس دنیا میں جا ...تھی۔ اسے صفا اپنی بغل میں دبا ہوا بنڈل یاد آ گیا اور اس بنڈل کے ساتھ اسے جانے کیا کچھ یاد آ گیا ...بیدار ہو کر نیچے اترنے لگی۔

پہاڑ سے اترنا چڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ چڑھتے وقت تو انسان سنبھل سنبھل کے ...ماہے لیکن اُترتے وقت اپنا وزن سہارے رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ نیلوفر اترتے پھسل گئی۔ اگر موٹی سی ...بیل اس کا مارگ سا جسم روک نہ لیتی تو وہ پتھر کی طرح لڑھکتی نیچے آتی۔

وہ میدان تک گئی اور تیزی سے آگے نکل گئی۔ بارش اور تیز ہو گئی۔ بیلوں اور گھاس سے ...کے کپڑے بھیگ گئے۔ تتلیاں گج بھی اڑ رہی تھیں لیکن نیلوفر تتلیوں سے ذرہ بھر دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تیز ...س میدان سے نیچے اُتری اور اسے وہ آب جو نظر آنے لگی جو کل رات سیلابی دریا کی مانند پہاڑوں کے ...بھر رہی تھی۔ بارش کا گدلا پانی رات ہی رات بہ کر اول جھیل میں جا چکا تھا۔ اب یہ ندی اس آب جو سے ...میں جلترنگ بجا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد نیلوفر اس ندی کے کنارے کھڑی تھی۔ اس پر وجد طاری ہونے لگا لیکن یہ کیفیت زیادہ ...رہی۔ اس پر خوف سا طاری ہونے لگا جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بادلوں ...شمع میں ڈھکے پہاڑوں اور چھپاتے پرندوں کے سوا اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے سینڈل اتار کر ...ں نے لیے اور دوسرے ہاتھ سے شلوار اونچی کر کے ندی میں اتر گئی۔ وہ ندی جس نے رات جھیل کے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پاؤں اکھاڑ دیتے تھے، اب بڑے پیار سے نیلوفر کے پاؤں گدگدا رہی تھی۔

آگے پتھروں، جھاڑیوں اور بیلوں کی بھول بھلیاں تھیں۔ اور انہی میں ڈھکا چھپا وہ راستہ تھا جو پہاڑی سے اس بلند مٹا ٹیک جاتا تھا جہاں قدرت نے جبیل کے چھپنے کی جگہ بنا رکھی تھی۔ نیلوفر اس پتھریلی راہ پر پڑی مشکل سے چڑھائی چڑھنے لگی۔

اگر اس کا دماغ اپنے قابو میں ہوتا تو سوچتی کہ جبیل صفدر ملزم ہے۔ ضروری نہیں کہ آج بھی یہیں ہو گا وہ بل بھی گیا تو ہو سکتا ہے اس کا ریوالور کل والا نہ ہو لیکن نیلوفر اس یقین کے ساتھ جا رہی تھی کہ جبیل وہیں ہے اور اس کا ریوالور کل والا ہی ہو گا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ صفدر ملزم دھوکہ بھی دے سکتا ہے۔ یہ پاگل پن کی کیفیت تھی جو اس پر طاری تھی۔

جبیل تھوڑی ہی دیر پہلے ندی میں نہانے آیا تھا اور بیل بوٹوں کی گنجان میں لیٹ گیا تھا۔ اسے انتظار تھا۔ ساجی سے وہ اپنی ماں کی کوئی خبر سننا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ماں کے متعلق کچھ پتہ چلے تو وہاں سے نکل جائے۔ اسے قریب ہی آہٹ سنائی دی تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ جھاڑیوں کے عقب سے اسے قریب آتی محسوس ہوئی تو وہ رینگ کر گنجان سے باہر نکلا اور جھاڑیوں سے جھانک کر دیکھا۔

نیلوفر آ رہی تھی۔

جبیل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے اسے بھاگنے کے لیے جال بچھایا جا رہا ہے اور یہ دانے کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں پاؤں کے بل سرک کر ذرا بلندی پر ہو گیا۔ اس کے تنے کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا۔ وہ نیلوفر کو کم اور چاروں طرف زیادہ دیکھ رہا تھا۔

نیلوفر اس کی پناہ گاہ تک پہنچ گئی اور منہ پھاڑ کر اندر جھانکا۔ گنجان خالی تھی۔ وہ الٹ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جبیل جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا ایسی جگہ جا رکا جہاں سے اسے نیچے وادی نظر آ سکتی تھی اور وہ نیلوفر کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا دماغ بھی آنکھوں کی طرح چرکتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ لڑکی اسے پکڑوانا چاہتی تھی۔ تب جب وہ اس کی کوٹھی میں گیا تھا وہ اسے اندر بٹھا کر پولیس کو بلا سکتی تھی۔ مگر لڑکی نے اتنی احتیاط کی تھی کہ کوٹھی کے قریب جانے سے بھی روکتی رہی تھی۔ پھر اس نے جبیل کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔ اسے نیلوفر کے ساتھ اپنا سلوک یاد آیا تو ایک خیال یہ آیا کہ اتنے اچھے اور غیر متوقع سلوک کے جواب میں لڑکی اسے نہیں دے گی۔ مگر اسے یہ خیال بھی آیا کہ اس لڑکی کا خاوند قتل ہو گیا ہے۔ وہ اپنے سہاگ کے لیے کبھی بلکتی بھٹکتی گی جبیل وہاں سے بھاگنے کی نہیں نیلوفر کی حرکتیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے سوچا کہ اس کا خاوند قتل ہو گیا ہے اور اسے پورا حق حاصل ہے کہ خاوند کے قتل سے انتقام لے

جبیل کچھ اور سمجھ رہا تھا لیکن نیلوفر کا چہرہ مایوسی سے بجھ گیا تھا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھتی واپس چل پڑی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے جیسے بچہ پہلی بار بغیر سہارے کے چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ گیلے پتھروں اور بھیگی گھاس پر قدم جمائے بغیر آسان نہ تھا۔ جبیل خود تو چھپا ہوا تھا لیکن اسے سامنے والی پہاڑی کے دامن سے چوتھی جانب والی محدود وسعت میں کھڑا ایک ایک انچ نشست زمین اور جھاڑیوں کا پتا پتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ اسے کہیں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ سوچنے لگا کہ نیلوفر چلے جانے دے یا سامنے آ جائے۔ ہو سکتا ہے وہ صرف ملنے ہی آئی ہو لیکن وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا اور نیلوفر کو جاتے دیکھتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس حسین جال میں نہیں الجھے گا۔ اس فیصلے نے اسے ایسا سکون دیا جیسے ایک مہیب خطرہ ٹل گیا ہو لیکن نیلوفر کا پاؤں پھسل گیا۔ جبیل چھپ کے دیکھ رہا تھا۔ نیلوفر نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی اور ہاتھ زمین پر رکھ کر اٹھنے لگی مگر ہاتھ بھی پھسل گئے اور پاؤں بھی۔ وہ پہلو کے بل گری اور ڈھلان پر لڑھکنے لگی۔

جبیل کے منہ سے گھبرائی ہوئی سی "اوہ" نکل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ جس ڈھلان سے وہ لڑھک رہی ہے، وہ ذرا ہی آگے جا کر عمودی ہو جاتی ہے اور نیچے کھائی ہے جسے جبیل کے پیڑوں، شاہ بلوط کے درختوں اور گھنی جھاڑیوں اور بیلوں نے چھپا رکھا ہے۔

نیلوفر نے ایک جگہ ایک بیل کو تھام لیا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن اتنی ہوئی بیل بوجھ اور زور سے لمبی ہونے لگی۔ نیلوفر اوسوت کے درمیان تین چار قدموں اور دو محلوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جبیل نے جھاڑی کی اوٹ سے جست لگائی پھر ایک دو بلیے لیے ڈگ بھر کر جبیل کے تنے کا سہارا لے لیا۔ وہاں جمنا بھی ممکن نہ تھا لیکن جبیل نے چند قدموں کا فاصلہ دو چھلانگوں میں طے کر کے ایک پتھر پر قدم جما لیا اور نیلوفر کی کمر کو مضبوطی سے تھام کر کھینچ لیا۔ لڑکی کا وزن ہی کیا تھا۔ جبیل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے بیل کی ٹوٹی ہوئی ڈالی کو تھام رکھا ہو۔ نیلوفر نے جبیل کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ بیٹھی۔ جبیل نے اسے دونوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اسے نیلوفر پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

پھسل بہت سخت" نیلوفر نے کثیف سی مسکراہٹ سے کہا۔ "بڑی زور سے گری تھی۔"

"تم صرف پھسل تھیں" جبیل نے کہا۔ "گنجا ابھی باقی تھا۔" وہ اسے ذرا آگے لے گیا اور اس کی پیٹھ کو گرد باز پولیس کر بولا۔ "ذرا آگے جھک کر اس جھاڑی سے جھانک۔"

نیلوفر جبیل کا ہاتھ تھام کر آگے جھکی تو جبیل نے دوسرے ہاتھ سے جھاڑی کو پیچھے ہٹایا۔ نیلوفر کی دبی دبی چیخ نکل گئی اور وہ پیچھے ہٹ کر خوف کے مارے جبیل کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس کے سپید مائل رخساروں پر زردی چھا گئی اور خوف سے آنکھیں باہر آنے لگیں۔ اسے موت کا کھلا ہوا منہ نظر آیا تھا۔ نیلوفر ندی اور چرواہے تھی۔ جبیل نے اسے پیچھے کر لیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"یہ جگہ پہنچنا آسان نہیں لڑکی!" — جمیل نے کہا — "وہ پاگل ہیں جنہوں نے تمہیں مجھے پکڑوانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ انہیں معلوم تھا مجھے پکڑوانے خود آئیں۔ مردوں میں یہ کام عورتوں کا نہیں!"

"کون پاگل ہیں؟" — نیلوفر نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔ "کون خود آئیں؟"

"جنہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے!" — جمیل بولا۔ "کیا وہ دانہ پھینک کر مجھے پکڑنا چاہتے ہیں؟ تم حسین ہو مگر شہریوں کے لیے ہیں ان پہاڑوں کا پتھروں کی لکڑی کا نہیں پھنسا کرتے — وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ دیکھا نیلوفر کے آنسو رہ رہے ہیں اور اس کے ہونٹ تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

"تم کیوں آئی ہو یہاں؟" — جمیل نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میں پاگل ہوں!" — نیلوفر نے زخمائی ہوئی آواز میں کہا — "پاگل ہوں جس چلی آئی ہوں اور تم سمجھتے ہو کہ تمہیں پکڑوانے آئی ہوں.... تمہارے وسوسے بجا ہیں مگر صحیح نہیں!"

نیلوفر نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کی بغل میں جو بنڈل تھا وہ کہیں گر پڑا تھا۔ دیکھا قریب ہی جھاڑی میں پڑا تھا۔ نیلوفر نے جا کے بنڈل اٹھایا اور جمیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے پاجامہ اور قمیض لائی ہوں۔ یہ کپڑے اتار دو، پھٹ گئے ہیں!"

جمیل نے غیر ارادی طور پر بنڈل اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ بنڈل کو دیکھتا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ قبول کرے یا نہ کرے۔

"یہ پاگل پن تھا جو مجھے کل رات اس جنگل میں لے آیا تھا۔" نیلوفر نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔ "میں موت کے جبڑوں میں آ بیٹھی تھی لیکن تم پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال کر مجھے گھر چھوڑنے .... اور...." وہ چپ ہو گئی۔ اس کی نظریں جمیل کی مشرقی آنکھوں سے ٹکرا گئی تھیں۔ ان آنکھوں کی چمک نے اس پر مقدس سا رعب طاری کر دیا اور ایک تاثر برقی رَو کی طرح اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا۔

اس نے جمیل کو رات بھی دیکھا تھا لیکن زیادہ تر اندھیرے میں یا دیئے کی ٹمٹماتی لو میں، یا چاند کی رات میں مگر اب دن کی روشنی میں دیکھا تو ایک سحر سا اس کی زبان گنگ کر گیا۔

جمیل کو سادگی سے پیار تھا، وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ نیلوفر سادگی سے کہیں زیادہ دل کش تھی لیکن نیلوفر اُس دنیا کی امیر لڑکی تھی جو جمیل کی جان کے درپے تھی اور اسے پہاڑوں کی آزاد فضا قید بھر کی تھا۔ اس لیے وہ اسے ذرہ بھر اچھی نہیں لگتی تھی۔ کل رات وہ اس کے پاس بے بس اور خوفزدہ لڑکی کے روپ میں آئی تھی تو جمیل اسے گھر چھوڑ آیا تھا۔ آج بھی جب اس نے نیلوفر کو پہلی بار دیکھا تو اس کے اس قدر حسین سراپا نے جمیل پر ذرہ بھر اثر نہ کیا سوائے اس کے کہ وہ اکثر دھوکے سے لیکر، اس سے وہ باتیں ہوئیں تو جمیل نے محسوس کیا کہ نیلوفر اب بھی کل ہی کی طرح بے

وجود ہے اور خاوند کے قتل کے صدمے سے اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔

"تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔" — جمیل نے کہا۔ "اپنی عقل ٹھکانے رکھو۔ اس طرح جنگلوں میں ماری ماری پھرو۔ مجھے تمہاری عمر کی ایک لڑکی یاد آتی ہے۔ وہ تمہاری ہی طرح، میرے ہی طرح گنوار تھی۔ اس کی شادی ہوئی تو تیسرے مہینے اس کا خاوند دو تین گھڑی سے گرا اور سر پتھر پر لگنے سے مر گیا۔ یہ لڑکی پاگل ہو گئی۔ تمہاری طرح گھر والوں کو بتائے بغیر ایسے اونچے پہاڑوں پر چڑھ گئی جن پر کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہ اپنے خاوند کو پکارتی رہتی تھی۔ کبھی دور دیرانوں میں نکل جاتی اور کوئی اسے تلاش سے پوچھتی تو نہ کہتی کہ ایک آدمی ادھر نہیں دیکھا ہوگا، اور وہ اپنے خاوند کا حلیہ بتاتی تھی۔ ایک دن وہ ندی کے سہارے طرف چلی، لڑھکتی نیچے آئی اور مر گئی.... تم ایسے نہ کرو!"

"اگر اس لڑکی کی جگہ یا میری جگہ تم ہوتے تو سمجھ سکتے کہ نہ وہ جان بوجھ کر پاگل ہوئی تھی نہ میں سوچ سمجھ کر جنگلوں میں نکل آئی ہوں!"

قانون اور پولیس کی دسترس سے دور، دنیا کی نظروں سے اوجھل سبز پوش پہاڑیوں، درختوں اور گھنی برساتی میں ڈھکی، گھنی گھاٹی کے منہ پر کھڑے دونوں اس طرح ایک دوسرے کو دیکھنے جیسے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں یا جیسے ایک دوسرے کو پہلے بھی دیکھا ہو۔

جمیل کے ہونٹوں پر جلتی سی مسکراہٹ آ گئی جسے دیکھ کر نیلوفر بھی مسکرا اٹھی۔ دوسرے ہی لمحے دونوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی لیکن اداسی چھا گئی لیکن اداس اور اس سی مسکراہٹوں نے دونوں کے درمیان سے اجنبیت کا احساس ختم کر دیا۔ دونوں جھاڑی گُفا میں چلے گئے۔

"تمہارے خاوند کی کوئی خبر ملی؟"

نیلوفر نے نفی میں سر ہلایا، دفعتاً وہ آ ملی اور جمیل کو کنکھیوں دیکھ کر سر جھکا لیا۔

"یہ کپڑے لانے کی بات تو نہیں تھی؟" — جمیل نے ایسے لہجے میں کہا جس میں تکلف کم اور بے تکلفی زیادہ تھی۔ "تمہارا ساں کا بھی اچھا نہیں، نہ تمہارے لیے نہ میرے لیے!"

"میرے لیے تو اب کچھ بھی اچھا نہیں رہا۔" — وہ تلخ نما گھونٹ نگل کر چپ ہو گئی۔

گُفا میں سکوت طاری ہو گیا۔ نیلوفر کے جی میں آئی کہ مکالمہ کی باتیں جمیل کو سنا دے لیکن باتیں بچھڑ گئیں اور زبان تالو سے جا لگی لیکن ہونٹ سل گئے۔ نیلوفر نے سوچا کیا فائدہ؟ کہنے کو کچھ بھی کیا سے ناگوار ہو۔ اس نے اس کی خاموش دستگیری کرنے کا۔ نیلوفر نے آہستہ آہستہ اس کو دیکھا۔ جمیل پہلے سے گہری تیز جس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جمیل کو خشک سا ہونے لگا جیسے لڑکی کو بچپن سے جانتا ہے۔ شاید اکٹھے کھیلے بھی ہیں۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن یادوں کی کڑیاں جانے کہاں سے ٹوٹ گئی تھیں کہ ذہن ملبے کے پردے اٹھا نہ سکا۔

"یوں لگتا ہے جیسے پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے!" — نیلوفر نے طول سی مسکراہٹ سے کہا۔

"دیکھا تو تھا!" — جمیل نے کہا۔

"کب؟"

"جب تم نے اس پیچھے کو گولی ماری تھی۔"

"ہیں؟" — نیلوفر نے کھل کر کہا — "اس سے بھی پہلے..." اور وہ ہنس کر بولی — "دیکھا کہاں؟"

کیا بعض انسان دل کو اتنے اچھے لگتے ہیں کہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے بچپن کا ساتھ ہو؟

جمیل نے بھی سوچا کہ دو مختلف راہوں کے راہی مل ہی کہاں سکتے ہیں۔ اس کے باوجود محسوس کر رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان اجنبیت کا شائبہ تک نہیں اور نیلوفر کا روگ اس کے اپنے دل میں بھی اتر آیا ہے۔

جمیل اور نیلوفر کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ انہیں ایک ہی ماں کی کوکھ نے جنم دیا ہے، دونوں کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون ہے، دونوں نے ایک ہی ماں کی چھاتیوں کا دودھ پیا ہے اور وہ جنم جنم کے ساتھی ہیں، وہ ایک ہی منزل سے چلے تھے لیکن راستے الجھ گئے ہیں۔

نیلوفر کے دل سے ایک بار پھر باتوں کا ہجوم امڈ آیا لیکن زبان پر آ کے ٹوٹ گیا۔ اظہاریت کی راہیں رُکی رُکی سی تھیں۔ وہ جمیل کو دیکھے ہی جا رہی تھی۔

"میں باہر جاتی ہوں" — نیلوفر نے پیار سے سے لہجے میں کہا — "تم یہ کپڑے پہن لو۔"

نیلوفر باہر نکل گئی۔

جمیل نے نیلوفر کے لب و لہجے کی اپنائیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ جمیل اندر ہی اندر تڑپ اٹھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے ساجی سے کہا تھا — "تم جیسی جس لڑکی کو دیکھتا ہوں تو دل کہتا ہے یہی تیری ہے۔" — آج نیلوفر کے رویے سے متاثر ہو کر اس کا دل پکار اٹھا "یہی تیری بہن ہے!" اس کے دل و دماغ پر بہن سوار رہتی تھی۔

جمیل نیلوفر کے لائے ہوئے کپڑے پہننے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ باہر جا چکی تھی۔ جمیل نے کپڑوں کو ایک نظر دیکھا اور سوچا کہ آخر اس نے کپڑے نہ پہننے کا فیصلہ کر لیا لیکن باہر سے نیلوفر کی آواز آئی — "یہ لیے بھائی؟"

جمیل نے پھٹی ہوئی شلوار قمیص تار پر پھینکی اور نیلوفر کے لائے ہوئے کپڑے پہن لیے۔

"آ جاؤ" — جمیل نے کہا۔

نیلوفر اندر آئی تو اسے دھچکا سا لگا۔ یہ آفتاب کے کپڑے تھے جو اب جمیل کے جسم پر خوب سج رہے تھے۔ اسے آفتاب یاد آ گیا اور اس کے آنسو نکل آنے جمیل نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ نیلوفر غریبانہ سے لے قابو ہو کر اس سے لپٹ گئی اور گال اس کے سینے سے رگڑ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ جمیل اس کے بال سہلانے لگا۔

"کاش! مجھے اتنا پتہ چل جاتے کہ تمہارے سہاگ کا لٹیرا کون ہے!" — جمیل نے عتاب آلود آواز میں کہا اور نیلوفر کو تھوں سے تھام کر جھٹکے سے پرے کرتے ہوئے بولا — "مجھے تم شہروں سے نفرت ہے۔ نہ جانے کیوں تم جھی لگتی ہو۔ جانتا ہوں کہ مجھے اس صحبت میں تم ہی نے پھنسایا ہے" — سالی آواز جذبات میں دب گئی اور وہ گھونٹ سا نگل کے بولا — "شاید اس لیے کہ ہر لڑکی کے روپ میں مجھے اپنی بہن نظر آتی ہے۔"

"مجھے بھی اپنی بہن بنا دو نا!" — نیلوفر نے پیاسی پیاسی آواز میں کہا اور زار کر کر بولی — "سنو بھائی! میں تمہاری نہیں۔ میرا جسم کوٹھی میں قید ہے لیکن میری روح ان پہاڑوں میں بھٹکتی رہتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری روح کو چوٹ لگی تو میں پہاڑوں کی طرف اٹھ بھاگی ہوں اور تم سمجھتے ہو کہ تمہیں پکڑوانے پر تلی ہوئی ہوں۔"

اس کے دل میں ایک بار پھر آئی کہ جمیل کو اپنی اصلیت بتا دے جو اسے کار والے نے سنائی تھی لیکن اس خیال سے چپ رہی کہ جمیل اسے دھتکار بیٹھے تو اکارہ لڑکی کہ تہ سمجھ بیٹھے۔

جمیل کے جذبات و احساسات میں موجوں کا زیروبم پیدا ہونے لگا۔ نیلوفر ایک ہی جست میں اس کے دل میں اتر گئی۔ اسے ایک ثانیہ کے لیے ساجی یاد آ گئی اور اس نے جھنجھلا سی محسوس کی جیسے وہ ساجی کو دھوکہ دے رہا ہو۔ نیلوفر اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ جانتے لگا کہ یہ لڑکی ایک بار پھر اس کے سینے سے کان لگا کر جیسے اس کے لے رو سے اور وہ اس کے بال سہلاتے۔ نیلوفر کے بال سہلانے سے جمیل کو خود قرار سا آنے لگا تھا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ اپنی کھوئی ہوئی بہن کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔

انوکھا سا ایک جذبہ اسے تبدیل کرنے لگا۔ اسے خیال آ گیا کہ یہ تو کسی اور ولیس کی لڑکی ہے۔ وہ جیسے کی جمیل کا ہاتھ آپ ہی آپ بڑھا اور نیلوفر کے ہاتھ کو سہلانے لگا۔

"ایک بات بتاؤ" — نیلوفر اس سے یوں مخاطب ہوئی جیسے وہ دو دوستوں کی طرح کسی خفیہ سے نہیں بلکہ کوٹھی کے جیسے سجاتے، آرام دہ کمرے میں بیٹھے ہوں — "تم قرآن مجید پڑھ سکتے ہو؟"

"تمہاری طرح تو نہیں پڑھ سکتا۔ تم نے بہت ساری جماعتیں پاس کی ہوں گی۔ مجھے صرف ناظرہ آتا ہے۔"

"قرآن شریف پڑھا تھا؟" — جمیل نے کہا — "تم کیوں پوچھتی ہو؟"

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نیلوفر کو صدمہ سا ہوا۔ یہ پہاڑوں کا دیہاتی سمجھتا تھا کہ چونکہ وہ بہت سی باتیں پڑھی ہے اس لیے قرآن مجید اس سے اچھا پڑھتی ہوگی نیلوفر کو تو قرآن پڑھنا آتا ہی نہیں تھا۔

"میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ میں نے ایک ٹوٹا رکھی ہے۔" نیلوفر نے کہا۔ "وہ مجھے کہتی رہتی ہے کہ اللہ کے اس کلام میں اتنی طاقت ہے کہ اس سے ملا جلا کب کہا جاتا ہے۔"

"اور اگر انسان گناہگار نہ ہو تو اللہ کا یہ کلام صیقلیوں کے پہاڑ اڑ پس تو اٹھا کر پرے پھینک دیتا ہے۔" جمیل نے کہا۔ "میں نے تھانے کے بجائے سے پہلے اللہ کو پکارا تھا۔ میں گناہگار نہیں تھا اس لیے اللہ نے میری مدد کی۔ اب ہر روز اللہ کو یاد کرتا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔"

نیلوفر خاموش ہو گئی۔ ایک سی بار کئی سوال اس کے ذہن میں آ گئے اور ایسے گتھم گتھا ہوئے کہ وہ بے چین ہو گئی۔ جمیل عالم فاضل نہیں تھا کہ اس کی گتھیاں سلجھاتا۔ اس کا علم یہیں تک تھا جہاں تک وہ نیلوفر کو بتا چکا تھا۔

لمحے گزرتے جا رہے تھے۔ وادی میں بادلوں کے ٹکڑے تیرتے آ رہے تھے۔ بہن بھائی ایک دوسرے کو جانے پہچانے کے بغیر ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ دونوں پر بے خودی سی طاری تھی اور اس بے خودی میں دونوں کو وہ روحیں خیال آتا تھا کہ وہ مختلف راہوں سے صدا دیتی دور اسے پر آ ملے ہیں کہ اب جدا ہوتے ہوئے بھی جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ دونوں دور اسے پر ہی بیٹھے تھے اور انہیں ذرہ بھر علم نہ تھا کہ برسوں پورے دونوں اسی طرح گلف میں ڈرے سہمے بیٹھے تھے کہ عیب کے ہوتے نے لپک کر دونوں کو جدا کر دیا تھا۔ اگر وہ پھر ایک ہی گلف میں بیٹھے تھے اور اسی طرح ڈرے ہوئے تھے۔

باہر کی فضا میں ساون کی نمک ہوائیں چلیں کے پتوں سے "سائیں سائیں" کرتی گزرتی جا رہی تھیں جمیل چونک اٹھا۔ اسے باہر سے نمک نمک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی دور نیچے کی وادی میں پتھر پر پتھر مار رہا ہو۔ جمیل خود آ گیا کہ ساجی خواہ اس نے یہ جگہ تاکہ صاحبہ کہ ندی کے کنارے سے کوئی پتھر پھینکا ہیں آ جاوں گا۔

"اب تم چلی جاؤ۔" جمیل نے جیسے گہری نیند سے چونک کر کہا ہو۔ "تمہارا اتنی دیر یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

نیلوفر نے اس کا ہاتھ تھام لیا جیسے کہہ رہی ہو۔ "جانے کو کہی نہیں چاہتا۔ مجھے بھی یہیں چھپا لو۔ میں پہاڑ کی چوٹی میں اکیلے ڈر آتا ہے۔"

ساجی نے جمیل سے ملنے کے لیے تین بار گوشش کی تھی لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ پڑی

ہمیں نے اسے بظاہر معصوم قرار دے دیا تھا لیکن گاؤں کے نہ راہ باہر سی آئی ہوئی نے جو آدمی تھے تھے وہ ساجی پر نظر رکھتے تھے۔ تینوں بار ساجی ڈھونڈتا گھر سے نکلے نکلی تھی اور انہیں چھپنے بھٹنے کے لیے چھپ کر گھر کی پناہ گاہ کی طرف چل پڑی تھی لیکن ہر بار کسی رکسی آدمی نے اسے جاتے دیکھ لیا تھا اور وہ راستے سے ہی لوٹ آئی تھی۔ آج وہ بہت ہی چوکنا ہوئے چلی اور ہر قدم پر ادھر اُدھر دیکھتی جھاڑیوں، بیلوں اور اونچی گھاس کی اوٹ میں چڑھائیاں چڑھتی، اترتی، پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی منزل تک پہنچ گئی اور دو پتھر اُٹھا کر بجانے لگی۔

جمیل نیلوفر کو سلا چکے بیماری کے اوپر اوپر جا رہا تھا۔ راہ دشوار تھی اور پھسلن زیادہ۔ قدم قدم پر کسی نے کتنے پتھر کا سہارا لینا پڑا اور کتنی قدم تو موٹی موٹی بیلوں کو تھام کر چلنا پڑا تھا جمیل نیلوفر سے منع تھا کہ اس جگہ تک یا کوئی مجھ جیسا پھانسی کے تختے سے بھاگا ہوا یا بھٹکا ہوا ہی پہنچ سکتا ہے۔ جانے تم یہاں تک کیوں چلی آئی ہو؟

کل رات تو بارش اور طوفان نے یہاں تک پہنچا دیا تھا اور آج خود چلی آئی ہو کیونکہ راہ معلوم ہو گئی تھی۔

نیلوفر کا پاؤں پھسل گیا۔ جمیل نے اسے بازوؤں میں لے کر تھام لیا لیکن اس کا اپنا پاؤں پھسل گیا دونوں گر پڑے۔ نیلوفر کی ہنسی نکل گئی۔

جمیل مردہ تھا، اچانک کراہ اٹھا لیکن نیلوفر ابھی ہاتھوں کے بل اٹھ رہی تھی۔ جمیل نے اسے اپنے سے تھام کر اٹھا لیا لیکن دونوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر آ گئے ہیں اور نیچے ندی کے کنارے ساجی کھڑی انہیں دیکھ رہی ہے۔

ساجی نے دونوں کو اس حالت میں دیکھا کہ نیلوفر جمیل کی باہوں میں ہے۔ جمیل ہنس رہا ہے۔ نیلوفر اس کی باہوں سے نکلے بغیر دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال پیچھے کر رہی ہے ساجی نے جمیل کو جاتے اور قیس میں دیکھا اور نیلوفر کو باہوں میں لیے دیکھا تو اس کا دل اچھل کر لیلیٰ کو دینے لگا اور اس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ وہ انہیں گرتے تو دیکھ سکی تھی کیونکہ اس وقت نمک کی جھاڑی کی اوٹ میں تھے۔ وہ اسی قدر سمجھ سکی کہ دونوں جانے کب سے چھپے ہوئے ہیں اور اب اٹھے ہیں۔ نیلوفر کو وہ اتنی دور سے نہ پہچان سکی۔ صرف اتنا دیکھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔

ساجی کے گرد جیل کے پہاڑ اور وادی کی گھنی سرمائی ایک چکر کی صورت گھومی اور اس کا سر اپنا کے بگولا بن گیا۔ اس کے ذہن میں جانے کتنے ہی خیال کتنی ہی باتیں، کتنے ہی سپنے یوں آ پڑے جیسے کسی نے تنور میں ایندھن پھینک دیا ہو۔ اس کے وجود میں ایک اور شعلہ بھڑکا اور سب کچھ راکھ ہو گیا۔ وہ کھڑے کھڑے بگولے کی طرح گھومی، اس کا سر ڈول گیا اور وہ چل نہ سکی لیکن قدم ڈگمگائے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس نے ہار کر اخروٹ کے پیڑ کے تنے پر ماتھا رکھ دیا۔ سینہ زور سے تھرکا اور اس کی سسکی سسکیوں اور ہچکیوں کی آندھی چلنے لگی۔ وہ اسی آندھی میں لڑکھڑاتی گاؤں کی طرف چل دی۔

جمیل نیلوفر کو راہ پر ڈال کر ساجی کے پاس پہنچنے کو بیتاب تھا۔ اس نے ایک نظر ساجی کو دیکھ اور اب اس کوشش میں تھا کہ نیلوفر اُسے نہ دیکھ سکے لیکن اب کے اس نے اُدھر دیکھا تو اسے نظر نہ آئی۔ اس نے سوچا کہیں چھپ گئی ہوگی۔

"تم اکیلی چلی جاؤ گی؟" — جمیل نے نیلوفر سے پوچھا۔ "یہاں سے آگے متیں راستہ صاف ہے نا؟"

"اکیلے جانے کو جی نہیں چاہتا۔" نیلوفر نے رنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا۔ "لیکن دن وقت تمہارا آگے جانا ٹھیک نہیں۔"

وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے ذرا آسان راستہ شروع ہوتا تھا۔ گویہ راستہ باقاعدہ نہیں۔ نیلوفر ہونٹوں پر فتنہ سی مسکراہٹ لیے چل پڑی اور جمیل وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوتی تو جمیل پہاڑی ہرن کی طرح ندی کنارے پہنچ کر ساجی کو ڈھونڈنے لگا۔ اس نے آہستہ سے آوازیں دیں، ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ پتھر اٹھا کر بجائے لیکن ساجی سامنے نہ آئی۔

دو ششدر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ دو پہاڑی کی ڈھلوان پر اسے ساجی جاتی دکھائی دی جمیل بلند آواز سے پکارنے لگے "ڈیزر کر رہا تھا اور سرگوشی وہاں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ دوسرے لمحے۔ پہاڑی کے شانے میں گم ہو گئی۔ جمیل تمام خطرے بھول کر اچھلتا کودتا ندی پار کر گیا اور تیز دوڑتا، پھسلتا سنبھلتا وہاں تک پہنچا جہاں ساجی گم ہو گئی تھی۔

اس نے اونچی آواز دی لیکن جمیل کے گھنے پتروں کی "ساں ساں" کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ اسے سامنے ایک اور پہاڑی اور گھنا جنگل دکھائی دے رہا تھا۔ جمیل کو گمان تک نہ تھا کہ سا بدگماں ہو کے جا رہی ہے۔

تھوڑی دور اسے اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں ساجی کا سر نظر آیا جس کی جنبش سے پتہ چلتا کہ وہ بہت تیز چلی جا رہی ہے۔ جمیل اس کے پیچھے دوڑا۔ اس کا پاؤں گھاس میں پھسے پتھروں پھسلا اور وہ پہلو کے بل گرا لیکن گیند کی طرح اچھل کر اٹھا اور اندھا دھند دوڑا۔

جب وہ اس پہاڑی تک پہنچا تو دور پیچھے ساجی کا گاؤں نظر آ رہا تھا اور دائیں طرف درختوں کی اوٹ سے مری کا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ جمیل کو وہ جگہ بھی دکھائی دے رہی تھی جہاں کھڑے ہو کر نیلوفر گولی چلاتی تھی اور اسے وہ چراگاہ بھی دکھائی دے رہی تھی جہاں وہ ساجی کے ساتھ ڈھونڈتا پھرا تھا۔

نہ تھا۔ دانت سے چھوڑی ہوئی منزل تو نظر آ رہی تھی لیکن ساجی کا کہیں نشان نہ تھا۔

آنکھوں تلے وہ دو دن تک پھیلے ہوئے سبزہ زار اور گھنے پیڑوں کو اس نے نظروں سے ناپا۔ پھر نیچے اسے وہ آدمی گھومتے پھرتے اور مویشی چرتے چلتے نظر آئے۔ وہ بلندی پر چھپا کھڑا تھا جہاں سے پیچھے اترنا پُرخطر تھا۔ اس نے وہیں سے لوٹ آنا چاہا۔ سوچا شاید ساجی بلندی میں ہو گی۔ آخر کتنا سفر طے کرتی لیکن دل کی بیقراری نے اسے دیوانہ بنا ڈالا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی ماں کی کوئی خبر پوچھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا شاید ماں آ گئی ہو یا ہو سکتا ہے اس نے کچھ سوچ میں آوں گی۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے پہاڑی کے دامن میں ساجی کی جھلک نظر آئی۔ وہ بہت دور بل گئی تھی جمیل کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا تو اس کی نظریں اُس جنبش میں جا رکیں جہاں وہ اور ساجی دنیا کی نظروں سے چھپ کر بیٹھا کرتے تھے کس قدر گھنا جنگل تھا وہ۔ شاید طوطے کے دو تین پیڑ ان کے ساتھ ایک میٹری۔ اوپر نیچے گھنی بیلوں اور جھاڑیوں نے چھپ چھپ کے ملنے والوں کے لیے کس قدر محفوظ جگہ بنا دی تھی۔

جمیل کو ساجی کا سر ایک بار پھر دکھائی دیا اور وہ اس جنبش کے نشان جنگل میں غائب ہو گئی جمیل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ذرا بار پھر جنگل کا سینہ چیرنے لگا۔ وہ ذرا جا دھند بلندی سے اترا تھا جیسے ساجی کی تو پر بھاگا دوڑا جا رہا ہو۔ اس کی سانسیں ہانپ کر تیز ہو گئیں شل ہو گئیں۔ وہ دو اس جنبش میں جا گھسا۔ ساجی گھنٹوں میں سر دیا سے ہمکیاں۔ لے لے کے۔ رو رہی تھی کھیل۔ نے چپک کے اس کا سر اٹھایا۔ وہاں اس کے شانوں سے لگا دیتے لیکن ساجی جھی بلی کی طرح قریب کر الگ جا بیٹھی۔

"تو رو رہی ہو ساجی۔" جمیل نے دھیمے لہجے سے کہا۔ "مجھ پر ناراض ہو قاتل۔ بدحواس۔"

ساجی نے۔ جمیل نے بھرائے لہجے میں کہا۔ "تم ڈاکو کو بھی ہو؟"

"تو وہ جا چکا تم؟" ساجی نے بھرکر کہا۔ "لوٹ لوٹ کر بھاگ گیا کاٹھ بھر۔ تم ہو اور دو تین جنبشوں میں ملنے جاتی ہیں؟"

"زندگیاں بچ ہیں؟" جمیل نے بات سمجھتے ہوئے بارعب آواز میں پوچھا۔ "کس کی بات کر رہی ہو تم؟"

"وہ جو تمہیں نئے کپڑے پہنا گئی ہے۔ وہ۔ ماں۔" ساجی نے روتے ہوئے غصے آلود لہجے میں کہا۔ "چلے جاؤ یہاں سے۔"

جمیل کو غصہ تو بہت آیا لیکن ساجی کی غلط فہمی بلاوجہ نہ تھی۔ اس نے۔ ساجی بازو پکڑا تو وہ بازو چھڑا کر اٹھ بیٹھی اور جنبش سے باہر نکلنے لگی۔

ساجی میں خط سے میں کھڑا ہوں۔" جمیل نے بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "تمہی نے دیکھ لیا تو یہ حال

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بھانسی کے پھندے پر جا پہنچوں گا میری بات سن لو۔"

"جاؤ۔" ساجی نے غصے سے کہا۔ "پھانسی چڑھ جاؤ۔ میری بلا سے۔" وہ شاید بلوط سے نے سے لگ کر رونے لگی اور جمیل کی طرف پیٹھ پھیر لی۔

جمیل کو پچھتاوا ہوا کہ اسے معافیاں مانگ کر ساجی کے ساتھ وہی دن تو گزارنے تھے۔ کوئی ایسا موقع نہ تھا کہ ایک دوسرے کے دکھ درد شریک ہوتے۔ اس نے سوچا کہ ساجی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ پھانسی چڑھ جاؤ۔ جمیل کو اپنی ماں یاد آ گئی۔ سوچا گئے۔ اس کے بعد تو وہ رہنا چاہتے۔ وہ رو رہا تھا جب سے سر کو جل پڑا۔

"خدا کے لئے ہمت دو۔ پھانسی نہیں پڑھوں گا ساجی!" جمیل نے کچھ دیر بعد عزم سنجیدگی سے کہا۔ "میرا قصور ہی کوئی نہیں تھا۔ البتہ ارادہ بد معاش بھی نہیں تھا اور تب سے لے کر ساجی ساتھ ہے وقت جیسے معصوم لڑکی ہے۔ وہ وہی ہے جس نے ناخدا کے قتل میں میرا پورا ساتھ دیا ہے۔ وہ بھی مان گئی تھی کہ میں ڈاکو اور لٹیرا نہیں..... خدا انصاف کرے گا ساجی!"

ساجی پہلے کے تنکے سے سر لگائے رو رہی تھی۔ جمیل کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے کے عذاب پر اس کی بگڑی بن سکیں۔ ختم نہیں ہوا آنسوؤں کی روانی رکنے لگی۔ جمیل چپ ہو گیا تو ساجی کو داخلی دنیا میں آنے سے پہلے کا سکوت طاری ہو گیا۔ جمیل چل پڑا۔ اس کے قدموں کی آواز سن کر ساجی گھبرا گئی۔ جمیل کا پلہ جو اس کے ہاتھ میں تھا اس کے قدموں کی آواز سن کر ساجی کو دھچکا دیا

گھنے جھاڑ میں چھپ کے بیٹھا تھا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ گھوڑی جو جمیل کی آواز پر اس کی طرف چلی تھی اب اس کی ٹھٹک پر اونچی اونچی گھاس اور جھیل ہوئی بیلوں کو روندتی بے تابی سے چلی جا رہی تھی۔

وہاں تین چار ہی تو آدمی تھے لیکن اُنہوں نے "ڈاکو، پکڑلیا.... روک لو.... جمیلا ڈاکو" کا بے ہنگم شور مچا کر رکھا تھا۔ اُنہوں نے ایک آدمی کو گاؤں میں خبر کرنے کو بھگا دیا۔ ایک کے ہاتھ میں چھوٹی سی بندوق اور باقی دو کے پاس شاہ بلوط کے ڈنڈے تھے۔ مری کی وادی کی گھنی ہریالی میں چھپے ہوئے انسان، تلاش کرنا اُلجھے ہوئے بالوں میں جوں تلاش کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ وہ آدمی چلاتے بھی تھے، ڈرتے بھی رہے تھے اور جھاڑیوں میں ڈنڈے بھی مار رہے تھے۔

پولیس نے گاؤں والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آئے دن پولیس کا کوئی نہ کوئی اہلکار گاؤں میں کھڑا ان سے خاطر تواضع بھی کراتا اور دھمکی دے کر چلا جاتا تھا کہ کسی نے جمیلے ڈاکو کو پناہ دی یا اس کی اطلاع تھانے نہ پہنچائی تو دس سال قید ملے گی۔ گاؤں کے لوگ تنگ آ چکے تھے۔ اب جمیلا ڈاکو کی پکار پر سارا جنگل بیدار ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد دو سے بے شمار آدمیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں "آ گئے بھائی او.... روکنا او.... او.... او آ گئے.... پہنچے بھائی او تے.... جانے نہ دینا"

گاؤں کے لوگ لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور ڈنڈے اٹھائے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ساجی کو جمیل کے ساتھ باتیں کرتے کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ لوگ جمیل کی تلاش میں بھاگنے دوڑنے لگے اور ساجی اپنے مویشیوں کو ہانکنے لگی۔

جمیل کی گھوڑی غائب تھی۔ وہ جمیل کی ٹھٹک پر اس کے تعاقب میں چلی جا رہی تھی۔

*

ساجی حیران و پریشان الگ کھڑی کبھی ان آدمیوں کو دیکھتی جو شور و غل مچا کر تے اور ایک دوسرے کو افکار تے جمیل کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور ڈنڈے دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوئی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ جمیل ان کے ہاتھ نہ آتے۔ کبھی وہ اُس جگہ کو دیکھتی جہاں جمیل غائب ہوگیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ یہیں ہے یا کہیں نکل گیا ہے۔ ایک بار اس کے دل میں آئی کہ ان آدمیوں سے کہے کہ جمیل یہاں نہیں آیا تھا اور جیسے اُنہوں نے دیکھا ہے ویسا ہی اور بے گمرہ معصوم لڑکی تھی، جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کر سکی۔

اُسے ان لوگوں پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس کے دل پر خوف کی بھی گرفت تھی اور غم بھی تھا۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ بیٹھ گئی اور اس کے آنسو بہنے لگے پھر وہ سسکنے لگی وہ تو اپنے آپ کو اس سبزہ زار اور گلستان کی ملکہ سمجھا کرتی تھی۔ اس نے مری شہر کے سوا دنیا کی کوئی اور جگہ نہیں دیکھی تھی لیکن وہ اپنی ہری بھری، مہکتی زمین کو دنیا کا سب سے زیادہ حسین خطہ سمجھا کرتی تھی۔ مگر اب اُسے اپنے قدموں اور پیڑ پودوں سے یوں خوف آنے لگا تھا جیسے ان پر آسیب کا قبضہ ہوگیا ہو اور جن بھوتوں کی بوٹیاں نوچ لیں گے۔ اسے چند ایک آدمیوں کی للکار جنوں بھوتوں کی آوازوں کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

اُس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ اس دنیا سے اور ان آوازوں سے تعلق توڑ لینے کی کوشش کر رہی تھی مگر یہ کوشش ناکام تھی۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھے ادھر اُدھر دیکھا۔ اُسے کچھ دُور جمیل کی گھوڑی ایک جگہ کھڑی بے چینی سے کھر مارتی نظر آ رہی تھی۔ وہ دھیمے سے ہنسنا بھی رہی تھی گھوڑیاں اپنے بچے کو دیکھ کر جس طرح ہنہنایا کرتی ہیں، یہ پیار کی آواز ہوتی ہے۔

"جمیل وہیں ہوگا" — اسے خیال آیا اور اسے یاد آیا کہ جمیل کو دیکھ کر گھوڑی اُس کے قریب رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سے پہلے بھی گھوڑی جمیل کی ٹھٹک پر چل پڑی تھی۔

ساجی غصے، خوف اور غم کی گرفت سے نکل آئی۔ اس نے کانوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ لوگ جمیل کی تلاش اور تعاقب میں بکھر گئے تھے۔ ساجی کا دماغ بیدار ہوگیا۔ اگر مجرمانہ ذہنیت کی لڑکی ہوتی تو اس کی فکر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کسی بھیس بدل سکتی تھی۔ وہ ان آدمیوں کے ساتھ تلاش میں شامل ہو کر انہیں گمراہ کر سکتی تھی۔ انہیں اپنے حسن و جوانی کی چمک اور اداکاری سے تلاش اور تعاقب سے ہٹا سکتی تھی مگر اس کی فطرت کا ایک ہی رُخ تھا جو کسی بہروپ کو قبول نہیں کرتا تھا۔ سچائی اس کی قوت تھی۔ وہ اسی قوت کے بل بوتے پر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"جمیل کو غرق نہیں ہونے دوں گی"۔۔۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور گھڑی کی طرف چل پڑی۔

جمیل اسی گھنی جھاڑیوں رینگتا جا رہا تھا جہاں گھڑی گھس جانے کو بیتاب ہوئی جا رہی تھی۔ آگے سنتھے کی گھنی جھاڑیاں تھیں جو بونے درختوں کی مانند تھیں جمیل ان میں چلا گیا۔ گھڑی اس کی دوسری طرف تھی اور جمیل کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ تلاش کرنے والے تھوڑی ہی دُور پر سے تھے۔ ان کی المکار سے جمیل کو پتہ چلتا جا رہا تھا کہ وہ کدھر ہیں۔ اگر یہ لوگ خاموش رہتے تو جمیل کو پکڑ سکتے تھے۔

ساجی چھپتی چھپاتی گھڑی تک پہنچ گئی اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی رسی کھول

"خدا کے لیے گھڑی کو لے جاؤ ساجی!"۔۔۔ ساجی کو سنتھے میں سے جمیل کی دبی دبی آواز سنائی دی

"یہ مجھے پکڑوا دے گی۔ بھاگنا نہیں۔ آرام آرام سے چلو ورنہ سب تک میں پڑ جائیں گے۔ خوفی! پیچھے تو کہیں نہیں دیکھا"

ساجی وہیں رک گئی اور جھک کر سنتھے میں جھانکنے لگی۔ اسے جمیل نظر نہیں آ رہا تھا۔

"چلی جاؤ ساجی!"۔۔۔ اسے جمیل کی غصیلی آواز سنائی دی۔ "خرابیاں۔۔۔ خدا ہمارے ساتھ ہے جیسے گناہ میں۔ مری کی وٹھیوں والوں کا قانون مجھے نہیں پکڑ سکا۔۔۔ جاؤ۔۔۔ آہستہ آہستہ جاؤ"

"میں خدا سے دعا کروں گی"۔۔۔ ساجی نے کہا اور چل پڑی۔

تلاش کرنے والوں کی آوازیں وہ دُور ہو گئی تھیں۔ ساجی نے بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور زندگی میں پہلی بار خوشی کی سرخوشی کی۔ "سنا ہے تو رحیم اور کریم ہے۔ تیرے سوا ہمارا کوئی نہیں"۔۔۔ اور اس کی سسکیاں نکل گئیں۔

ساجی کے گاؤں میں مخبروں کے ساتھ سی۔ آئی۔ ڈی کے دو تین آدمی بھی کسی نہ کسی بہروپ میں موجود رہتے اور ارد گرد کے علاقے میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ان سب کے پاس ایک ایک ریوالور تھا جو وہ شلواروں کی نیفوں میں اُڑسے رکھتے تھے۔ وہ بھی لوگوں کی المکار پر آ گئے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ جمیل کوئی بڑا ہی خطرناک ڈاکو ہے جو معلوم نہیں کہاں سے مری میں آ گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا ایک ساتھی اور دو بیل روپے کچھ بیکار عوام بیٹھے آدمی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ریوالور نکال لیے تھے۔

زندہ پکڑنے کی کوشش کرنا تھا۔۔۔ ان کے ساتھ بہروپ میں ایک بیڈ کانسٹیبل تھا۔ اس نے اپنے کانسٹیبلوں سے اما۔۔۔ ۔ ۔

گھوڑی کی رسی تھامے چل پڑی۔

خانو تھا تو مرد لیکن وہ عورت ذات کی یہ چوٹ نہ سہہ سکا جنت مٹانے کے لیے اس نے

—— "اپنا وعدہ یاد رکھنا ساجی!" —— اور وہ دوسری طرف چلا گیا۔

مری کے جنگل نے اپنے تلے سہاڑیاں، چٹانیں، شکریاں، نشیب و فراز اور گہری کھائیاں چھپ تھیں۔ یہ ساون کا مہینہ تھا جب گلے سڑے پودے بھی ہرے بھرے ہو گئے تھے۔ گھاس تانی کہ کھڑا آدمی روپوش ہو جاتا تھا۔ وہاں جمیل کو ڈھونڈ نکالنا ناممکن تھا۔ اسے تلاش کرنے والے بھی سبزہ کے سمندر میں ڈوب گئے۔

ایک طرف سے کسی کی گھبراتی ہوئی آواز آئی —— "ادھر آؤ" —— سب اُدھر کو دوڑے پھر اور اشاروں میں وہ ایک دوسرے کو ہدایات دینے لگے۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" —— سب کو پکارنے والے نے کہا —— "گھبرو بہیر سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی بھی آ گئے۔ سب نے کوئی سو ڈیڑھ سو گز علاقے کو گھیرے میں لیا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمیوں نے ریوالور تان لیے۔ ان کی انگلیاں ٹریگروں پر تھیں۔ گھبرو اتنگ ہو۔ کوئی جھاڑیوں میں بیٹھا یا لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے صرف کپڑے کہیں کہیں سے دکھائی دے رہے تھے سب سرگوشیاں اور اشارے کرتے اس کی طرف بڑھے۔ وہ اب نکل کر بھاگ نہیں سکتا تھا اور وہ نکلنے کی کوشش کر بھی نہیں رہا تھا۔ سب اور قریب ہوئے تو کسی نے للکار کر کہا —— "جمیلے آجا، ورنہ مارا جائے گا۔"

وہ اٹھا۔ سب رک گئے۔

"تُو کیا کر رہا ہے یہاں؟" —— کسی نے اس سے پوچھا۔

"میری آنکھ لگ گئی تھی" —— اُس نے جواب دیا۔

وہ اُن کے گاؤں کا آدمی تھا جو تھک کر اور کچھ ڈر کر یہاں لیٹا اور اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

سب شرمسار سے ہو کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ تب کسی نے چلا کر کہا —— "وہ جا رہا ہے ....اُدھر"

سب نے دیکھا۔ دور اوپر بلندی پر جمیل جا رہا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمیوں کے ریوالور اُدھر گئے اور سب اکٹھے فائر ہوئے۔ وادی لرز اٹھی۔ ریوالور کی گولی اتنی دور سے نشانے پر نہیں لگ سکتی تھی جمیل پیچھے اور نیچے دیکھے بغیر اب ہو گیا۔ تعاقب بند کر دیا گیا۔

ساجی کاؤں کو جا ہی تھی جب ریوالور فائر ہوئے۔ وہ یوں رک کر مُڑی ہو گئی جیسے تمام گولیاں

کے جسم سے پار ہو گئی ہوں۔ اسے جمیل کی لاش دکھائی دی جو خون میں نہائی ہوئی تھی۔ اُس کی چیخ نکل گئی اور اس نے بازو گھوڑی کی گردن کے گرد لپیٹ کر نرمہ گھوڑی کے منہ سے لگا دیا۔ وہ ہچکیاں لینے لگی اس کے ذہن میں ایک ہی بار بے شمار خیال آ گئے۔ پھر وہ یکلخت دلیر ہو گئی۔ وہ گھوڑی سے الگ ہوئی وادا دو دیکھا جدھر ریوالور فائر ہوئے تھے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ اُدھر کو جانے اور سب کو بتا دے کہ جمیل اُسے بلنے آیا تھا اور یہ بتا کر اس کی لاش لے آئے۔

اپنی بے بسی کے احساس نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ اسے وہی جوان خانو اپنی طرف آتا نظر آیا جس نے اسے کہا تھا کہ جمیل سمجھے بلنے آیا تھا۔

"مار لگا ہے؟" —— ساجی نے اُس سے اس طرح پوچھا جیسے سسکی لی ہو۔

"نہیں" —— خانو نے جواب دیا —— "نکل گیا ہے"

"گولی کس نے چلائی تھی؟"

"اُدھر سے ہی آدمی ہیں" —— خانو نے جواب دیا —— "کہتے ہیں پولیس کے آدمی ہیں"

"جمیلا کہاں تھا؟"

"وہ دور اُدھر۔ نظر آیا اور غائب ہو گیا۔ نکل گیا ہے" —— خانو نے کہا اور ساجی کے قریب ہو کر پوچھا۔

—— "تیری آنکھیں بتا رہی ہیں تُو روتی رہی ہے۔ جمیلے کے لیے؟"

"اپنی قسمت پر روتی ہوں" —— ساجی نے کہا —— "نہ ہمارے گھر آتا نہ ہماری بے عزتی ہوتی"

"لیکن سمجھے تو، جمیلا تھا؟" —— خانو نے کہا۔

"جو دل میں آتے کہ تو" —— ساجی نے آوے کو کہا —— "میرا کوئی بھائی ہوتا، باپ ہوتا تو تم مجھے اس طرح نہ کہتے۔ تمہارے دل میں مردانگی اور غیرت ہوتی تو بوڑھے دادا کی بولی کی عزت کا خیال رکھتے۔ سارے لوگوں نے میرے خلاف ایکا کر لیا ہے۔ ایک بوڑھے ضعیف اور ایک لڑکی کے خلاف"

"اگر میں تیرے کہنے سے کہ جا ملا لوں تو؟"

"پولیس کے اور سارے گاؤں کے مقابلے میں کھڑے نہیں ہو سکو گے" —— ساجی نے کہا۔

"کھیڑا ہو کر دکھا دوں تو اپنا وعدہ پورا کرو گی؟"

"اپنی عزت کا سودا نہیں کروں گی"

"چلو یہاں سے" —— خانو نے کہا —— "تمہارا دادا آ رہا ہے"

دادا گھبراہٹ کے عالم میں بہت تیز تیز چلا آ رہا تھا۔ گاؤں میں خبر پہنچ گئی تھی جمیلا دادا کو گھیرے میں آ گیا ہے۔ اجڑ دادا کو معلوم نہ تھا کہ ساجی گھوڑی اور کپڑوں وغیرہ کو ادھر ہی لے گئی ہے۔ وہ اٹھ دوڑا۔ ساجی مجبور۔ اس کی جان میں جان آئی۔ ساجی نے خانو سے ——"نہ بتانا چاہے دادا کو شک ہو جائے گا خانو

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksociety

اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر چلا گیا کہ ساجی اس کے جال میں آ گئی ہے۔ دادا کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ کچھ بولنے کی بجائے اس نے ساجی کو بازو سے پکڑا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔

گاؤں کے لوگ اوپر سے بے تحاشا کھڑے اُدھر کو دیکھ رہے تھے جدھر گولیاں چلی تھیں۔ سارا گاؤں باہر نکل آیا تھا۔ جوّد دادا اور ساجی ان کی طرف دیکھے بغیر اپنے گھر چلے گئے۔

"وہ آیا تھا؟" — دادا نے پوچھا۔

"آیا تھا" — ساجی نے جواب دیا۔

"کسی نے اُسے تمہارے ساتھ دیکھا تھا؟"

"نہیں"

"کیا تمہیں میری عزت کا بھی کوئی خیال نہیں ساجی؟"

"اسے میں نے تو نہیں بلایا تھا" — ساجی نے جواب دیا — "میں وہاں تھی اور وہ آ گیا"

"تم چاہو تو اسے پکڑوا سکتی ہو" — دادا نے کہا — "اسے بلاؤ، ادھر پولیس کو خبر کر دو۔ وہ جب تک پکڑا نہیں جاتا ہم دونوں سُولی پر لٹکے رہیں گے"

"اگر مجھے کوئی یقین دلا دے کہ وہ فدا کو اور قاتل سے تو میں اسے آج رات تک پکڑوا دوں" — ساجی نے کہا — "ہم سچے ہیں دادا، جمیل بے گناہ ہے۔ تمہیں ساری بات سنا چکی ہوں۔ سمجھ چکی ہوں۔ سمجھو تو میں کیا کروں"

"ہمارا اور جمیل کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ہم غریب ہیں۔ ہمارا اور گنوار ہیں" — دادا نے کہا — "قانون اُن کا ہے جن کے پاس دھن دولت ہے۔ وہ اوپر بنگلوں میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے پولیس کو جدھر اشارہ کرتے ہیں پولیس جھگڑیاں اور ڈنڈے لے کر اُدھر چل پڑتی ہے۔ ہم قرآن مجید ہاتھ میں لے کر قسمیں کھاتے ہیں تو بھی کوئی یقین نہیں کرتا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم غریب ہو اس لیے جھوٹے ہو"

"مجھے خدا کے قانون پر اعتبار ہے" — ساجی نے کہا — "اُس کا قانون امیر غریب کے لیے ایک ہے۔ وہاں دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں ہو گا"

"پگلی لڑکی!" — دادا نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا — "وہ جو اُوپر رہتے ہیں وہ جارے خدا کو نہیں مانتے"

"اگر ہمارا خدا برحق ہے تو اپنا آپ خود منوا لے گا" — ساجی نے کہا — "دیکھو دادا! میں عورت ذات ہوں اور ڈرتی نہیں۔ نرم مزاج ہو، حوصلہ کرو۔ میں سچی اور بے قصور ہوں اس لیے گردن تان کر بات کرتی ہوں۔ اگر میں نے جمیل کو دھوکے میں پکڑوا دیا تو میں کہاں جا کر سو جاؤں گی، پھر میں اتنی دلیری سے بات نہیں کر سکوں گی"

"میرے بڑھاپے کو دیکھو ساجی!" — دادا نے کہا اور اس کے آنکھ سے آنسو نکل آئے۔

ساجی اسے دیکھتی رہی۔ دادا بچوں کی طرح پُتوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ ساجی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اسے بچپن یاد آیا۔ دادا کی آغوش کا سکون اور پیار یاد آیا۔ دادا نے زندگی میں جو دُکھ اُٹھائے تھے وہ یاد آئے۔

"دادا!" — ساجی نے دھیمی سی آواز میں کہا — "تم پولیس سے ڈرتے ہو نا! مت ڈرو میں پولیس کو راضی کر لوں گی"

دادا نے چونک کر ساجی کو دیکھا۔ اُس کے حسین چہرے اور پُرشباب قد کو نظروں سے ناپا۔ اُس کا خون رگوں میں گرم ہو گیا۔ ساجی نے کہا تھا میں پولیس کو راضی کر لوں گی۔ اس کا جہاندیدہ ذہن سمجھ گیا کہ وہ پولیس کو کس طرح راضی کرے گی۔

"تجھے اگر خاوند سے ہی بیاہ دیا ہوتا تو آج اس کا لک سے ہمارا منہ کالا نہ ہوتا" — دادا نے کہا — "تو بیزار رشتہ مانگ رہا تھا لیکن تو نے ٹال نہ کہنے دی"

"حوصلہ کرو دادا! حوصلہ کرو" — ساجی نے کہا۔

"میرے حوصلے تیری جوانی نے توڑ دیتے ہیں ساجی!" — دادا نے کہا — "تو پولیس کو راضی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اتنی زیادہ رشوت نہیں دے سکوں گا۔ غیرت والے رشوت میں اپنی عزت نہیں بیاچا کرتے"

"تم نے کیا سمجھا ہے دادا!" — ساجی نے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی — "میں اپنی عزت کی رشوت دے رہا ہے؟ میں ایسی ہوتی تو جمیل کے ساتھ چلی جاتی.... میں نے کچھ اور سوچا ہے دادا! وہموں اور وسوسوں میں مبتلا نہ ہوتے رہو"

دن کے پچھلے پہر تک آفتاب کے قتل کی بڑی سرگرم کہانی میں ایک اور سنسنی خیز باب کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہوٹلوں اور دکانوں میں، کوٹھیوں اور گاؤں میں، سڑکوں اور گلیوں میں ایک ہی خبر گونج رہی تھی — "جمیل ڈاکو پولیس کا گھیرا توڑ کر نکل گیا ہے۔ شہر شرار کی طرح نظر آیا اور یوں غائب ہو گیا جیسے زمین نے نگل لیا ہو"

ساون کی سیاہ گھٹاؤں کے ساتھ ڈراؤنی سی سنسنی نے ساری سرزمین کو لپیٹ میں لے لیا جنہوں نے پہری جانے کے لیے شام کی بسوں میں سیٹیں بک کرا رکھی تھیں، انہوں نے ارادے ملتوی کر دیئے۔ کتنے کمیں جمیل ڈاکو اس کو نہ لوٹ لے۔ ماؤں نے بچوں کو اور خاوندوں نے بیویوں کو باہر جانے سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

روک دیا کہیں جمیلہ ڈاکو اغوا کر نہ لے جاتے۔ مال روڈ کی رش اور گہما گہمی بڑھتے دیکھ گئی۔ کشمیر پوائنٹ، پنڈی پوائنٹ کی طرف سیر کو جانے والے لوٹ آتے اور شام سے پہلے پہلے سڑکیں سنسان ہو گئیں۔

لوگ افواہ ساز اور افواہ پسند ہوتے ہیں۔ بات نیچے سے اوپر تک آتی تو اتنی کا بیانہ اور کسی پر نہ کا ایک پرکوں کا غول بن چکا تھا جس نے سنی اس نے کچھ اپنے پاس سے اضافہ کر کے سنائی۔

"اس کے پاس دو پستول تھے۔ سامنے کھڑا رہا۔ پولیس اس کے قریب رنگی۔"

"گلاؤں کی وہ بڑی خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ لے گیا ہے۔"

"اس نے کہا ہے آج رات مری پر ڈاکا۔"

"اس نے للکار کر کہا ہے آج رات آفتاب کی بیوی (نیلوفر) کو اٹھا لے جاؤں گا۔"

"تندھ کا بہت بڑا ڈاکو ہے۔"

"اس کے ساتھ بیس آدمی ہیں۔"

"جن ہے جن۔ سامنے کھڑا رہا۔ پولیس گولی پر گولی چلاتی رہی۔ اسے ایک بھی نہیں لگی۔"

"اس کا پیر کامل ہے۔ گولیاں اس کے قریب جا کر راستہ بدل لیتی ہیں۔"

مری کی روانی اور رش پر جمیلہ ڈاکو آسیب بن کر طاری ہو گیا۔

مری سے تھانے میں سی۔ آئی۔ اے کے دونوں انسپکٹر اور سی۔ آئی۔ ڈی کا ہیڈ کانسٹیبل دھندلے دھندلے قرائن پر غور کر رہے تھے۔ باہر ساجی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ دادا تھا۔ ان سے پرے نیلوفر بیٹھی تھی اور کاروار شمل رہا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

ایک انسپکٹر نے باہر آ کر سب کو اندر بلا لیا۔

"دیکھ لڑکی!" ایک انسپکٹر نے ساجی سے کہا۔ "اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ تمہارا دادا بہت بولا ہو گیا ہے۔ جمیلہ ڈاکو تمہارے پاس آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس آنا چاہتا ہے۔ شاید تمہیں یہ بھی معلوم ہو کہ وہ ... تمہارا کہاں ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جیلے کے بگڑ زادہ کی تو لقد العلم والوں کا نہیں دھونہ دو گی تو بہت تکلیف ہو گی ... وہ کتنی دیر سے تمہارے پاس ٹھہرا تھا؟"

تفتیش غالباً زیادہ ... غلط طریقہ تھا۔ صحیح طریقہ یہ تھا کہ ساجی کو کمرے اندر بٹھایا جاتا اور دونوں انسپکٹر اس سے پوچھ گچھ کرتے۔ سیدھی سادی زبان میں تھپیٹنے سے بات باہر آ جاتی۔ اس کی بجائے انسپکٹروں نے ساجی کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ سب کی موجودگی میں تفتیش کرنا بہتر سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی گھبرا کر راز کی بات بتا دے گی۔ ... اس کی ... دادا جیسے پولیس کا بہت بڑا افسر ہو۔ وہ ساجی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ نیلوفر ساجی کو بڑی غور سے دیکھ رہی تھی۔ دادا کے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں اس سے ... کروں گی۔ وہ میرے ہی پاس آیا ہو گا۔" ساجی نے کہا۔ "اگر وہ آیا تھا"

"میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے آپ سے ... کہا تھا کہ وہ میرے گھر آئے تو میں آپ کو اطلاع دے دوں۔ آج تیاریوں تھا کہ میں ڈھونڈ بکھیرنے لگی اور اچانک وہ میرے سامنے آ گیا۔ میں ڈر گئی۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ ہو سکتا ہے وہ مجھے اٹھا لے جائے۔ آپ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اتنے میں کسی نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔ "جمیلہ ڈاکو ... اور وہ وہیں کہیں غائب ہو گیا۔ پھر بہت سارے آدمی آ گئے اور اسے ڈھونڈنے لگے۔ سب سے پوچھ لیں۔ کیا کسی نے اسے میرے پاس بیٹھے دیکھا تھا؟ ... اگر یہ لوگ عقل سے کام لیتے تو اسے میرے پاس آنے دیتے۔ میں اسے باتوں میں لگا لیتی۔ یہ بھی پتہ چل جاتا کہ وہ مجھے لوٹنے آیا ہے یا اس کی نیت کیا ہے۔ لوگ اسے بے خبری میں پکڑ لیتے۔ یہ ان آدمیوں کی غلطی ہے کہ وہ غل مچا ہے۔"

"حضور خان جی!" ... دادا نے کہا۔ "اس کی گھڑی ہمارے پاس رہے۔ میرا خیال ہے وہ اپنی گھڑی لینے آیا ہو گا۔ یہ معمولی گھڑی نہیں۔"

"اس کی مشک پر اس کے پیچھے جاتی ہے۔" ساجی نے کہا۔ "آج بھی اس کے پیچھے چل گئی تھی۔"

"گھڑی تو پہلے روز ہی ضبط ہو جانی چاہیے تھی۔" کاروار نے کہا۔

انسپکٹروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ ساجی نے گھور کر کاروار کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ ساجی نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ اس کے سینے سے طوفان اٹھ آیا تھا جو اس نے دل لیا۔

انسپکٹروں نے اجوادا سے بھی بہت کچھ پوچھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ ساجی کو پکڑ دادا سے اور گھڑی ساجی کے پاس رہے گی۔ ساجی اور دادا کو گاؤں چلے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ان دونوں کو جو ہدایت دی گئی تھی سے وہ کی گئی وہ یہ تھی کہ ساجی ہر روز ڈھونڈ بکھیرنے جایا کرے اور گھڑی کو ساتھ لے جایا کرے۔

"ان دونوں کو جانے کیوں دیا آپ نے؟" کاروار نے انسپکٹروں سے کہا۔ "کیا آپ پولیس کے سنے بجز کاروار انسپکٹر ہو کر ان دونوں کی سلامی اور آنسوؤں سے متاثر ہو گئے ہیں؟"

"ہم زیادہ بہتر سمجھتے ہیں سٹرکار!" ایک انسپکٹر نے کہا۔ "جرم مجرم کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے۔ اسے پڑھنے کے لیے پولیس کی نگاہ چاہیے۔ ہمیں کسی کے آنسو متاثر نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے چہرے ... انسپکٹر مسکرا کر چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔ "ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"میں کس طرح فکر نہ کروں شاہ صاحب تو ... کاروار نے جھنجلا کر کہا۔ "میری بھتیجی کا خاوند قتل ہو گیا ہے، اس کا گھر لٹ گیا ہے۔ آپ کا اب انسپکٹر اغوا ہو گیا ہے۔ ایک دوکاندار جو اس دوہری تہری واردات کا اہم گواہ تھا لاپتہ ہے۔ اس کا جوان خریدی بھتیجی پر پڑا ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کا دماغی توازن ایسا بگڑا ہے کہ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگی ہے۔ وہ روز بوٹیاں سونگتی جا رہی ہے۔"

"لیکن ہم اسے اس کا خاوند زندہ تو نہیں لا دیں گے۔" دوسرے انسپکٹر نے کہا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"اِسے یہ یقین تو ہو جائے گا کہ آفتاب واقعی قتل ہو گیا ہے" — کاردار نے کہا — "وہ تو کہتی ہے آفتاب زندہ ہے اور وہ ثبوت کے بغیر نہیں مانے گی"

"وہ گئی کہاں ہے" — انسپکٹر شاہ نے کہا — "آپ کے ساتھ اندر آئی تھی"

"دیکھیں" — کاردار نے کہا — "میرے ساتھ آئی تھی اور بتائے بغیر نکل گئی۔ اس کا دماغ قابو میں نہیں رہا"

"گھومنے پھرنے دیں اسے" — دوسرے انسپکٹر نے کہا — "ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ جانے دو جانے دیں۔ آپ اسے پابند کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تفتیش بڑی پیچیدہ ہے مسٹر کاردار۔ آپ ہم سے یہ توقع نہ رکھیں کہ ہم تفتیش کی ہر ایک کڑی اور ہر ایک بات آپ کو بتاتے رہیں گے"

"میں آپ سے ایسی توقع نہیں رکھتا" — کاردار نے کہا — "ایک دو باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ کہ نیلوفر کی کسی بات پر دھیان نہ دیں۔ اس کی دماغی حالت یہ ہو گئی ہے کہ بے معنی سی باتیں کرتی اور کبھی ایسی باتیں کرنے لگتی ہے جیسے اس کے خاوند کو میں نے غائب کر دیا ہے"

"ابھی تک اس نے ہمارے ساتھ آپ کے خلاف کوئی بات نہیں کی" — انسپکٹر شاہ نے کہا

"مگر آپ نے اسے لفٹ دی تو کرے گی" — کاردار نے کہا — "اور آپ کو گمراہ کرے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ اس بوڑھے اور اس کی پوتی کو اس طرح نظر انداز نہ کریں جس طرح آپ کر رہے ہیں۔ بوڑھے نے چہرے کی جھریوں اور سفید بالوں میں معلوم نہیں کی کچھ چھپا رکھا ہے..... اور یہ لڑکی آپ نے اس کی جوانی اور اس کی خوبصورتی دیکھی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ آنکھوں سے باتیں کرتی ہے۔ دونوں کو اکٹھے دیکھ کر سمجھ لیں گے سادہ اور نیک دل لوگوں کو ان پر رحم آ جاتا ہے کہ بوڑھے دادا کی مصاحب اور جوان پوتی ہے۔ لیکن آپ تو ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس قسم کے دادا اسی قسم کی پوتیوں کے ساتھ میں ذریعہ معاش بناتے ہیں۔ یہ ہماری کوٹھیوں میں آ کر نوکری اور بھیک مانگتے ہیں۔ ہماری جھوٹیاں بیان اور اپنی عزت ہمارے قدموں میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ لوگ عزت اور بے عزتی کے صرف نام سنتے ہیں۔ ہمیں اپنے خود کے پیٹ دکھاتے رہتے ہیں اور موقعہ ملے تو ہمارے پیٹ میں چھری اتار دیں۔ ہمارا کھاتے اور ہمارے ہی گھروں کے بھیدی بن کر دشمنی کی وارداتیں کراتے ہیں"

"سب ایک جیسے نہیں ہوتے مسٹر کاردار" — انسپکٹر شاہ نے کہا

"غریب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا شاہ صاحب" — کاردار نے کہا — "غریب کا کردار نہیں ہوتا، ایمان نہیں ہوتا۔ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ لڑکی جیسے دادا کو کی داشتہ ہے اور اس کا دادا لڑکی کی دولت پر عیش کر رہا ہے۔ لڑکی کہتی ہے کہ جیسے کی انگلی سے جو انگوٹھی برآمد ہوئی ہے وہ اس لڑکی نے تحفہ میں دی ہے۔ کیا ایک غریب اور بے آسرا لڑکی کسی کا اس قیمت والا کے سوا کوئی تحفہ نہیں۔ اتنی قیمتی

انگوٹھی ہے؟ یہ جیسے کی دی ہوئی دولت سے خریدی گئی تھی۔ وہ اسے بیٹے آتے سے کبھی کبھی رات بھی کے پاس گزارتا ہو گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مہر ہاؤ۔ رہزن اور مجرموں کا استاد اپنی پسند کی دوشیزہ رکھتا ہے۔ کئی جیلے کی مجبوری ہے۔ آپ ان لوگوں پر اعتبار نہ کریں"

انسپکٹر شاہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا جیسے وہ کاردار سے اکتا گیا ہو اور ان کی کسی طرح جان کھا رہا تھا جس طرح انسپکٹر خالد کی جان کو آ رہا تھا۔ دن میں ایک بار تو ضرور تھانے جاتا تھا۔ انسپکٹر شاہ نے اسے بڑے اچھے لب و لہجے میں ٹالنے کی کوشش کی مگر کاردار کو اپنی سوشل حیثیت پر اتنا زعم تھا کہ اس نے حکم کے لہجے میں کہا — "آپ لوگ تھانے کے بھی نکلا کریں ورنہ مجھے آپ کے ڈی ایس پی کو بلانا پڑے گا۔ آپ اس بوڑھے اور اس کی پوتی کو نظر انداز کر رہے ہیں"

"مسٹر کاردار!" — انسپکٹر شاہ نے غصے کو مسکراہٹ میں چھپا کر کہا — "میری سروس بائیس سال ہو رہی ہے۔ میں دہشت کے تھانوں میں بھی رہا ہوں۔ شہروں کے تھانوں میں بھی۔ شہروں میں اُن علاقوں کے تھانوں میں بھی رہا ہوں جہاں اکثریت غریبوں اور بھکیوں میں رہنے والوں کی ہے اور آپ کی کوٹھی جیسی کوٹھیوں اور بنگلوں کے علاقوں کے تھانوں میں بھی رہا ہوں۔ جو میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ میری نظر آپ سے مختلف ہے۔ کوئی پولیس انسپکٹر کسی کو صرف اس لیے ملزم نہیں سمجھ لیتا کہ وہ غریب ہے اور غریب بھی کرتے ہیں امیر بھی۔ فرق یہ ہے کہ امیر لوگ اپنے جرائم پر روپے پیسے، کوٹھی، کار اور اپنی پوزیشن پردہ ڈال لیتے ہیں۔ غریب آدمی کا ذرا سا جرم بھی چونکہ نہیں چھپ سکتا، اس لیے وہ سب کو مجرم نظر آتا ہے۔ میں کسی سوسائٹی میں جو گھومتا ہوں میں، انہیں پولیس پکڑ نہیں سکتی کیونکہ آپ کی سوسائٹی نے مجاہدوں کو غریب و قدان میں شامل کر لیا ہے۔ مری کے ہوٹلوں میں دیہاتی اور غریب لوگ تو نہیں آ کر عشرہ تے۔ کئی کی مال روڈ پر فیشن اور اپنے جسموں کی نمائش دیہات کی لڑکیاں نہیں آپ کی بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں نکلتی ہیں۔ سر ہمارے فرض کو کیش آپ کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کرتی ہیں"

"کیا آپ اس بوڑھے اور اس کی پوتی کو بے گناہ ثابت کر رہے ہیں؟" — کاردار نے پوچھا۔

"میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ مجھے اس منشوعے سے بالکل اتفاق نہیں کہ میں مجرموں کو غریب لوگوں میں تلاش کروں" — انسپکٹر شاہ نے کہا — "ہماری نظر ہر جگہ ہے۔ دور نیچے دیہات پہنچی اور وہ راؤ پر آپ کی دنیا پر بھی"

کاردار کچھ کہنے لگا تھا کہ دوسرے انسپکٹر نے کہا — "مسٹر کاردار! ہمیں کام کرنے دیں۔ اگر آپ کو ہمارے خلاف کوئی شکایت ہے تو ڈی۔ ایس۔ پی کو بلا لیں۔ اس کے آگے ایک ایس۔ پی ہوتا ہے۔ اس کے پاس چلے جائیں"

"اور مسٹر کاردار!" — انسپکٹر شاہ نے رازداری سے کہا — "تھانے میں آپ جو بات کرنا چاہیں یا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Faisalabad

ہیں کوئی مشورہ دینا چاہیں تو پہلے یہ سوچ لیا کریں کہ یہ بات اور یہ مشورہ آپ ہی کے خلاف شک کر سکتا ہے اور ہم آپ کو مشتبہ کی حیثیت سے شاملِ تفتیش کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہم یہ ثبوت نہیں لائیں گے کہ آپ بہت امیر آدمی ہیں، آپ کے پاس کار ہے اور آپ ہمارے بالائی افسران بنا سکتے ہیں.... اب آپ تشریف لے جائیں۔"

کاردار غصے سے اٹھا اور تھانے سے نکل گیا۔

"حمید بھائی! مجھے اس شخص پر شک ہونے لگا ہے"۔۔۔ انسپکٹر شاہ نے اپنے ساتھی انسپکٹر جبار خان سے کہا۔ "جب بھی مجھے ملتا ہے یہ ضرور کہتا ہے کہ نیلوفر میرے خلاف کوئی بات کرے تو یقین نہ کرنا۔ یہ کوئی ڈیڑھ سو مرتبہ مجھے کہہ چکا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ نیلوفر کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے"

"یہ اسے میں نے کہا تھا"۔ انسپکٹر حمید نے کہا۔

"تم نے کیسے محسوس کیا ہے؟"۔ انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔

"اس کی بعض باتیں بے معنی سی ہوتی ہیں"۔۔۔ انسپکٹر حمید نے جواب دیا۔ "تم نے بھی ایک بار کہہ کہ اس لڑکی کا دماغ چل گیا ہے"

"لیکن میں اسے پاگل تو نہیں کہتا"۔۔۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔

"یہ جب تک ہے کہ جس کے پیچھے تم پڑے ہوئے ہو ضروری نہیں کہ وہی آفتاب کا قاتل ہو تو یہ لڑکی ہوش کی بات کرتی ہے"۔۔۔ انسپکٹر حمید نے کہا۔ "اچھوری سی بات کر کے وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے یا کوئی اور بات شروع کر دیتی ہے"

"نیلوفر کا اس قسم کی اچھوری بات کرنا اور کاردار کا یہ کہنا کہ لڑکی کبھی اس کے خلاف کوئی بات کرے تو اس پر یقین نہ کرنا بے معنی نہیں ہو سکتا"۔۔۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "تم جانتے ہو حمید بھائی، یہ دولت طبقہ کیسے کیسے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک تو ان کے پاس روپیہ پیسہ ہے دوسرے اوپر ان کا اثر و رسوخ چلتا ہے۔ اس طرح ان کے جرائم پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ مجھے کاردار پر شک ہونے لگا ہے.... اس کے متعلق بعد میں سوچیں گے۔ پہلے ساجی اور گھوڑی کی بات کر لو"

دونوں بہت پریشان تھے۔ کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ واردات کا شکار اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے اس لیے واردات کھل نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک پولیس انسپکٹر کی خشمگینی نے واردات کو اور زیادہ اہم اور چیلنج بنا دیا تھا۔ اسے کھل کرنے کی سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اب جمیل نرغے میں آ کر نکل گیا تھا۔ نکر نا، اور جمیل کی توقعات عوام ہو سکتی تھیں، جمال کہیں ذرا سا شک ہوتا وہاں بجلی کی طرح وہ جا گرتے تھے مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کئی جگہوں پر انہوں نے اس شک پر چھاپے مارے تھے کہ جنگ

سی کانوں میں پڑی تھی کہ جمیل کو وہاں دیکھا گیا تھا۔ یہ مخبروں کی اشتباہی تھی۔ ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ دونوں تھانیدار انہیں مال سمن کی کالیاں دیتے رہتے تھے۔ انہوں نے تین چار مخبروں کی چھوٹی موٹی وارداتیں معاوضے کے طور پر کھول کر بھی تھیں۔ انہیں کچھ تو کارگزاری دکھانی تھی۔ چنانچہ وہ جھوٹ موٹ کی اطلاعیں دیتے رہتے تھے۔

دونوں انسپکٹروں نے اب ساجی کے ساتھ گھوڑی کو بھی ذہن میں رکھ لیا۔ انہوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جمیل ساجی کو چاہتا ہے اور اسے ملنے آتا ہے۔ اب ان پر یہ انکشاف ہوا کہ گھوڑی جمیل کی ٹرک پر جاتی ہے اور جمیل کے لیے یہ گھوڑی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی ساجی۔ دوسرا انکشاف یہ ہوا کہ جمیل اچھی نہیں ہے۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ کس سمت غائب ہوا تھا۔ دونوں نے مخبروں اور بغیر وردی کانسٹیبلوں کو اس علاقے میں پھیلانے کا فیصلہ کر لیا۔

سی آئی ڈی کا ہیڈ کانسٹیبل جو کسی بھیس میں ساجی کے گاؤں پر نظر رکھتا تھا، تھانے میں تھا جمیل کے نمونے میں آنے اور نکل جانے کی تفصیلی رپورٹ وہی تھانے میں لایا تھا۔ اخوا اور ساجی کو بھی وہی تھانے میں لایا تھا۔

"دو تین آدمی ساجی کے پیچھے لگا دو"۔۔۔ انسپکٹر شاہ نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔ "یہ کام تو تم پہلے ہی کر رہے ہو لیکن اب طریقہ مختلف ہوگا۔ ساجی ہر روز گھوڑی ساتھ لے کر باہر جایا کرے گی۔ گھوڑی کھلی رہے گی۔ تمہارے آدمی چھپے رہیں گے اور ساجی اور گھوڑی پر نظر رکھیں گے۔ جمیل ان دونوں کے لیے ضرور آئے گا۔ اسے دیکھ کے دو شوشہ چھاپے۔ جمیل کو پکڑنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کی ٹانگوں پر ریوالور فائر کرے۔ جمیل کو زندہ پکڑنا ہے۔ ساجی کو پتہ نہ چلے کہ اس کے ارد گرد آدمی چھپے ہوئے ہیں"

ایسی کتنی اور ہدایات دے کر ہیڈ کانسٹیبل کو ساجی کے گاؤں بھیج دیا گیا۔

نیلوفر کسی کو بتائے بغیر تھانے سے نکل گئی تھی۔ وہ آئی کاردار کے ساتھ تھی لیکن اس کے دل میں اب کاردار کا کوئی احترام نہیں رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے آپ کو اس خیال سے مطمئن کر لیتی کہ کاردار نے اسے ڈرانے کے لیے کہا تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کی بیٹی ہے اور اس نے اسے کافرانہ کی ایک گفٹ سے اٹھایا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ کاردار اسے اس لیے ڈرانا تھا کہ وہ ارشد کے ساتھ شادی کرے مگر نیلوفر کا دل زیادہ دیر مطمئن نہیں رہتا تھا۔ کاردار نے کوئی شک نہیں رہنے دیا تھا۔ اس کی تصدیق نیلوفر نے اپنے دل نے کر دی تھی جو جنگلوں اور دادیوں میں اور پہاڑوں کی اترائیوں چڑھائیوں پر بھاگنے دوڑنے کو مچلتا رہتا تھا۔ شاید اسی لیے جمیل اسے بھایا تھا کہ وہ اسے آپ کو جمیل کی دنیا کی نزدیک سمجھتی تھی۔ اسے کوٹھیوں اور جھونپڑی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شان و شوکت سے نفرت ہو گئی تھی۔

وہ تھانے میں بیٹھی کھڑکی سے باہر اور اس کے دادا کو بڑی غور سے دیکھتی رہی تھی۔ انہیں اندر بلایا گیا۔ پھر انسپکٹروں نے ساجی اور اخجو کو گاؤں جانے کی اجازت دے دی۔ وہ وہاں سے نکلے ہی تھے کہ کاروار انسپکٹروں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ نیلوفر اٹھی اور باہر نکل گئی۔

بازار۔ انسانوں سے اٹا ہوا تھا۔ تھانہ ذرا بلندی پر تھا۔ نیلوفر نے انسانوں کے اس دریا میں ساجی اور اخجو دادا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اسے دونوں کے سر نظر آئے۔ وہ بازار سے اگلے موڑ تک پہنچ گئے تھے۔ نیلوفر تھانے سے اتری اور بازار کے ہجوم کو چیرنے لگی۔ اسے جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ مری کی سیر کو آتے ہوئے نوجوان اسے کنیاں مار کے گزر رہے ہیں۔ بعض جان بوجھ کر اس کے آگے آتے اور وہ ان کے کندھوں سے کندھے ٹکراتی۔ رگڑتی گزرتی جا رہی تھی۔ یہ نوجوان اُسی کی سوسائٹی کے سپوت تھے جو لڑکیوں سے چھیڑ خانی اور فقرہ بازی کے لیے مری آتے تھے۔

وہ ان سے بے پروا اور بے نیاز جس قدر تیز چل سکتی تھی چلی جا رہی تھی۔ ایسی حسین اور دلکش لڑکی کو لوگ رک کر دیکھتے تھے۔ وہ کسی کو دیکھے بغیر چلی جا رہی تھی۔ وہ مال روڈ کے چوک میں پہنچ گئی۔ وہاں بھی بازار جیسا ہجوم تھا بے شمار نگاہیں نیلوفر پر جم گئیں۔ کئی نوجوان اس کے قریب سے گزرنے کے لیے اس کی طرف بڑھے مگر وہ دائیں طرف جانے والی سڑک پر ہو لی۔ اسے ساجی اور اس کا دادا اس سڑک کا اگلا موڑ مڑتے نظر آ گئے تھے۔

وہ تھک گئی تھی اور اس کی سانسیں پھول گئی تھیں مگر وہ دوڑی جا رہی تھی۔ اس سڑک کے موڑ سے بہت آگے جا کر وہ اخجو دادا اور ساجی تک پہنچی۔ تھانے میں اسے پتہ چلا تھا کہ اس لڑکی کا نام ساجی ہے اس نے ساجی کو پکارا تو دادا پوتی نے رک کر پیچھے دیکھا۔ نیلوفر کی آنکھیں شل ہو چکی تھیں اور اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"کیوں بی بی جی! آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں ساجی!" نیلوفر نے سانسوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش دیتے ہوئے ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ ذرا دم لے لوں اور وہ ہانپنے لگی۔

ساجی اور اس کا دادا اُسے حیرت سے دیکھتے رہے اور وہ دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بے بے سانس لیتی رہی۔

"ہم بڑے دکھی ہیں بی بی!" — دادا نے زندہ حیاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم اب کیا کہنے آئی ہو جانتا ہوں تمہارا خاوند قتل ہو گیا ہے اور ہم اس لیے دو دیسے کہنے میں کہ جمیلا ایک دو دن میرے گھر تھا میں اسے روزی کی تلاش میں مارا مارا پھرنے والا ہے۔"

"تمہیں پولیس نے دھر لیا۔ سمگلا دادا؟" — نیلوفر نے کہا۔ "میں نے تم پر اور تمہاری پوتی پر کوئی شک نہیں کیا۔"

"پھر تمہیں کیوں روک لیا ہے؟"

"میرے گھر چلو گے؟"

"نہیں" — اخجو نے کہا۔

"پھر مجھے ساجی سے دو چار باتیں کر لینے دو" — نیلوفر نے کہا۔ "میں بھی دکھی ہوں دادا! مجھے بھی ماں پوتی سمجھ لو۔"

نہ دادا اس کی بات سننے پر آمادہ تھا نہ پوتی۔ ساجی نے اپنے دادا کا بازو پکڑ کر کہا۔ "چلو دادا! یہ سب لوگ ہے۔ یہ ہم سے جمیل کا پتہ لینا چاہتی ہے۔"

"میں جمیل کا پتہ دے چکی ہوں!" — نیلوفر نے کہا۔ "میں اُسے بے گناہ ثابت کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اتنی ہی مجبور ہوں جتنی تم ہو ساجی! میں تمہارے ساتھ کوئی اور بات کرنا چاہتی ہوں۔ میرے خاوند کا قاتل جمیل نہیں ہے۔"

"تو اپنی پولیس کو جا کر بتاؤ!" — ساجی نے کہا۔ "ہمیں بتانے کا کیا فائدہ؟"

"اس لیے کہ مجھے تمہاری مدد اور تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔" نیلوفر نے کہا اور آگے ہو کر ساجی کے کان میں کہا۔ "میں جمیل سے مل چکی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔" — ساجی نے کہا اور اسے جمیل کے الفاظ یاد آ گئے۔ "نہ جانے میں نے ساجی کی آنکھوں میں کیا دیکھا ہے کہ اس کی آبروایسی بے آبرو معلوم ہوتی ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو دل یوں بیٹھ جاتا ہے جیسے میری بہن جہاں کہیں بھی ہے بیوہ ہو گئی ہے۔"

"تم اگر کوٹھی میں رہتی ہو تو میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" — ساجی نے کہا۔

"تو آؤ ذرا آگے چل کر بیٹھ جائیں گے۔"

"جمیل نے مجھے بتایا تھا کہ میرا پیچھا جب تم نے میرے ساتھ تھانے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ ہی دیہاتی لڑکی کو دو ملازم باہر کہیں لے گیا تھا اور جمیل اتفاق سے وہاں پہنچ گیا تھا۔" — نیلوفر نے ساجی سے — "وہ لڑکی تم ہی تو نہیں؟"

"میں ہی ہوں۔" — ساجی نے کہا۔

وہ بہت آگے جا کر واٹر ورکس کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ نیلوفر کی منت سماجت پر اخجو دادا اُن سے بیٹھ گیا تھا۔ نیلوفر ساجی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی تھی۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"وہ تمہارا چچا ہے جسے جمیل نے مارا پیٹا تھا؟"

"ہاں" — نیلوفر نے جواب دیا۔

"پھر تم اپنے چچا کے خلاف کوئی بری بات نہیں مانو گی"

نیلوفر کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں دکھ اور غم صاف نظر آرہے تھے۔ اس کی مسکراہٹ اور اس تھی یا اس کی ادا سیاں مسکرا رہی تھیں۔

"میں تمہیں لڑکی ہوں" — نیلوفر نے کہا۔ "میں وہ نہیں ہوں جو تم مجھے سمجھ رہی ہو تم مجھ سے خوش قسمت ہو تم آزاد ہو۔ میں سونے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ یہ کوٹھیاں اور یہ بنگلے میرے جیل خانے سے کم نہیں" — نیلوفر کے آنسو چھوٹ آئے۔ ساجی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں کو جذبات میں لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تم سے کوئی بھید لینا نہیں چاہتی۔ شاید کوئی بھید تمہیں دوں" — وہ چپ ہو گئی پھر اپنے آپ سے بات کرنے کے لہجے میں بولی — "میں تو خود ایک بھید ہوں جسے میں خود بھی نہیں جانتی"

ساجی اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہ میں یہ شہری لڑکی سہمت چالاک تھی یا اس کا ذہن ٹھیک نہیں تھا۔ نیلوفر اپنی عمر کی لڑکی کے پاس بیٹھ کر یہ بھول ہی گئی تھی کہ ساجی کوٹھیوں میں دودھ، انڈے اور مرغیاں بیچنے والی اور گھروں اور ہوٹلوں میں نوکری کرنے والی کلاس کی لڑکی ہے اور وہ محو حیرت اور کوئی شہزادی ہے۔ اس کے مجروح جذبات اسے عرش سے فرش پر لے آتے تھے۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے اُسے دور نیچے بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں اور جھیل کے پیڑوں میں سے ساجی کا گاؤں جھانکتا آرہا تھا۔ اس نے باتیں طرف دیکھا تو نیچے اسے وہ جگہ بھی دکھائی دی جہاں سے اُس نے بندوق تھی اور اس کے چھرّے ایک گڈریے لڑکے کو زخمی کر گئے تھے۔ یہ بھیانک ڈراسہ وہیں سے شروع ہوا تھا۔

"میں نے تمہیں اُس روز دیکھا تھا اس روز ایک بچہ میری گولی سے زخمی ہوا تھا" — نیلوفر نے دکھ کے لہجے میں کہا اور رومال سے آنسو پونچھ ڈالے۔ "اُس وقت تم بہت غصے میں تھیں"

"قرآن پاک کی قسم جمیل نے اس بچے کا انتقام نہیں لیا تھا" — ساجی نے کہا۔ "بچہ بھلا کچھ لگتا تھا۔ اُس رات جمیل ہمارے گھر تھا"

"مجھے جمیل پر کوئی شک نہیں" — نیلوفر نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ میرے چچا نے تمہارے ساتھ کیا چھیڑ چھاڑ کی تھی؟"

"پھر تم تھانے میں تباہ گی جمیل کا قصور صرف یہ ہے کہ اس نے میری بے عزتی کا انتقام لیا تھا اس نے کسی کا قتل نہیں کیا" — ساجی نے کہا۔ "میں ڈرتی کسی سے بات نہیں کرتی۔ غریبوں کی کون سنتا ہے"

"میں تم سے یہی بات سننا چاہتی ہوں" — نیلوفر نے کہا۔ "میں تم سے بالکل نہیں پوچھوں گی

جمیل تمہارے پاس آتا ہے یا نہیں اور وہ کہاں ہے"

"وہ تو تمہیں معلوم ہے بی بی!" — ساجی نے کہا۔ "تم اس کے پاس گئی تھی نا!... میں شہر میں دودھ بیچنے آیا کرتی تھی..." ساجی نے نیلوفر کو سنایا کہ کاروبار نے کس طرح اسے ہر روز دودھ دینے کو کہا تھا اور وہ اُس کے ساتھ کس قسم کی باتیں کرتا تھا اور کس طرح ایک روز اسے کار میں بٹھا کر مری سے دُور ایک دھکی چھپی جگہ لے گیا، دست درازی کی اور اتفاق سے جمیل گھومتی کی ٹہلائی کے لیے ادھر آنکلا۔ پھر جمیل اور کاروبار کی لڑائی کی تفصیل سنائی۔ یہ بھی بتایا کہ جمیل نے اُسے انگوٹھی پہنائی تھی جس کے جواب میں اس نے لوہر بازار کے ایک دکاندار سے بڑی مہنگی انگوٹھی خرید کر جمیل کو پہنائی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ انگوٹھی چوری کی تھی۔

"ہم اللہ پر بھروسہ کرنے والے لوگ ہیں بی بی!" — ساجی نے کہا۔ "ہم دوسروں کے لیے مرجایا کرتے ہیں کسی کو ذلیل نہیں کرتے مگر بات عزت کی ہو تو پھر ہمارے مرد باؤلے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں خدا نے شاید اس لیے غریب اور جاہل رکھا ہے کہ تم لوگوں کی خدمت کریں اور جب تم لوگ ہمیں اُجرت یا تنخواہ دو تو ہم تمہارے آگے جھک کر تمہارے بچوں کو دعائیں دیں جیسے تم نے ہمیں خیرات دی ہو۔ ہم محنت مزدوری کر کے بھی بھکاری کہلاتے ہیں اور جب شہر میں چوری چکاری ہو جاتی ہے تو تم اور تمہارے تھانیدار مری کی بلندی پر کھڑے ہو کر نیچے دیہات کو دیکھتے ہیں کہ چور اسی میں رہتے ہیں۔ ہمارا قصور یہی ہے نا کہ ہم غریب اور ان پڑھ ہیں، پھر ہماری نصیبی یہ ہے کہ خدا نے ہماری روزی تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے اور تمہارے مردوں کے دل میں یہ ڈال دیا ہے کہ غریب کی بیٹی کی کوئی عزت نہیں ہوتی"

ساجی کا لب و لہجہ وہی تھا جو جمیل کا اُس وقت تھا جب وہ نیلوفر کو اُس کی کوٹھی تک پہنچانے آیا اور راستے میں اس نے نیلوفر سے باتیں کی تھیں۔ ساجی کا ایک ایک لفظ نیلوفر کے دل میں اُترتا جا رہا تھا۔ کبھی تو اُسے یوں لگتا جیسے وہ سامنے ساجی کے گاؤں کی رہنے والی ہے اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کو چلی جائے گی۔ اس کی خاک اسی مٹی کا خمیر تھا۔ اسے کاروبار نے تباہی دیا تھا کہ وہ پہاڑی خانہ بدوشوں کی بیٹی تھی اور اسے کاغان کی ایک گف سے بچپن میں اٹھایا گیا تھا مگر اُسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کی ماں نے اُسے پہچان لیا تھا مگر اسے نہیں پہچانا تھا۔

نیلوفر کے ذہن سے بچپن کی یادیں دھل گئی تھیں لیکن ذہن لاشعور میں جو یادیں دفن تھیں وہ اس کی فطرت بن گئی تھیں۔ اپنے خاوند کے قتل کے بعد جب وہ اپنی مع حقیقت سے گھبرا کر کہیں بھاگ جانے کی سوچتی تھی تو ذہن لاشعور اسے چوری چھپے فرار میں مدد دیتا تھا۔ یہ لاشعور ہی تھا جو اُسے مری سے دُور دُور اس جنگل میں لے گیا تھا جہاں جمیل چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کے پاس چلی گئی تھی۔

اب وہ ساجی کے ساتھ چلے جانے کو بیتاب ہونے لگی۔

www.paksociety.com
Scanned by Azeem Pakistanipoint

"تم تھانیدار کو بتاؤ گی کہ تمہارے چچا نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا؟" — ساجی نے پوچھا۔ "تم جمیل کو چھوڑ لو گی؟" — اُس نے نیلوفر کی ٹھوڑی تھام لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے زندہ یاتی ہوئی التجا کی۔ "تھانیدار تمہارے ہیں۔ انہیں کہو کہ جمیل نے کسی کو قتل نہیں کیا، اس نے کسی کے گھر میں ڈاکہ نہیں ڈالا۔ اُس نے تمہارے چچا کو مارا پیٹا ضرور تھا لیکن یہ لڑائی سخت جمیل بھی زخمی ہو گیا تھا۔ تمہارے چچا نے اسے بہت مارا تھا۔ اگر تمہاری عزت پر کوئی اس طرح ہاتھ ڈالے تو تمہارا چچا کیا کرے گا؟ یہ تماشہ تو نہیں دیکھتا رہے گا۔ مر جائے گا یا مار دے گا۔ اپنے تھانیداروں سے کہو کہ ایک غریب لڑکی کی عصمت اتنی ہی پاک ہوتی ہے جتنی امیر لڑکی کی۔ تم نے جمیل کو دیکھا ہے۔ اُس نے مجھے ساری بات سنائی تھی۔ یہ تو بتاؤ۔ اُس نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا؟ وہ کیا نہیں کہہ سکتا تھا؟ وہ نہیں تمہاری کھوپڑی تک چھوڑ گیا جب اس کے لیے پھانسی کا پھندہ تیار تھا۔" — اس کے دانت بجنے لگے۔ اس نے دانت پیس کر قہر بھری آواز میں کہا۔ "یاد رکھ بی بی! غریب کی بیٹی کی آہ عرش کے برج ہلا دیا کرتی ہے۔ معلوم نہیں کس کی آہ پڑی اور تیرا خاوند قتل ہو گیا۔ میری آہ سے بچ بی بی! تیرا یہ حسن اور تیرے یہ جل کر راکھ ہو جائیں گے جن کا کوئی نہیں ہوتا، ان کا خدا ہوتا ہے۔ اور وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رو سکنے لگی۔

"خدا... خدا..." نیلوفر نے زیرِ لب کہا۔ "میرا خدا کہاں گیا؟" — اس نے چھپٹ کر ساجی کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا اپنے ہاتھوں سے اوپر کیا اور بولی۔ "اس خدا تک میری آہ پہنچا دو ساجی جس کے عرش کے برج غریب کی بیٹی کی آہ سے ہل جایا کرتے ہیں۔"

ساجی نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اب نیلوفر کے آنسو بہہ رہے تھے۔

دونوں لڑکیاں جب اس جذباتی کیفیت سے حقیقت میں آئیں تو ساجی نے نیلوفر سے کہا۔ "تم تمہارے دل میں خدا کا خوف ہے تو جمیل کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ مجھ سے ملنے نہ آتے۔ پکڑا جائے گا۔ میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ میرے پیچھے آدمی لگے ہوئے ہیں... بی بی! اپنے بزرگوں سے خدا کو راضی کرنا چاہتی ہو تو جمیل کو بیگانہ سمجھو اور اسے بچانے کی کوشش کرو۔"

"میں خدا کو راضی کروں گی۔" — نیلوفر نے کہا۔

نیلوفر کچھ اور کہنے لگی تھی مگر چپ ہو گئی۔ اس نے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ گردن گھمائی۔ دیکھا، ساجی کا دادا اس کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ نیلوفر کو پتہ نہ چل سکا کہ دادا کب آیا۔ وقت اُس کے پیچھے آن کھڑا ہوا اور دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اجو دادا کی آنکھیں نیلی تھیں مگر بڑھاپے نے ان کی نیلاہٹ کم کر دی تھی۔

"خدا کو نہیں دیکھا تو میری آنکھوں میں دیکھو۔" — اجو دادا نے ٹھہری ہوئی اور دھیمی سی آواز میں کہا۔ "جن آنکھوں نے جوانی میں تم جیسی کسی لڑکی کو میلی نظر سے نہ دیکھا ہو، جن آنکھوں نے گناہگاروں کو گناہ کرتے دیکھا ہو، جن آنکھوں نے نیکیاں کرتے دیکھی ہو، جن آنکھوں نے اللہ کی سزا بھی دیکھی ہو، جزا بھی دیکھی ہو اور جن آنکھوں نے سینے دل سکھا ہو کہ خدا کی بستی کو مان، اسے جو کم نے دیکھا ہے اور دل مان گیا ہو تو خدا ان آنکھوں میں اپنا عکس ڈال دیتا ہے اور جب کسی ظالم کے ظلم سے ان آنکھوں سے آنسو نکلتے اور زمین پر گرتے ہیں تو دھرتی کانپ جاتی ہے۔ خدا چونک اٹھتا ہے... بیٹی! وہ دو دیتے دیکھ، تجھے جھگیوں کی طرح کے چھوٹے چھوٹے مکان نظر آتے ہوں گے اور اس بلندی پر اپنی پکی کوٹھیوں کو دیکھ۔ یاد رکھ۔ زلزلے نیچے سے آتے ہیں۔ زمین کی تہ سے جو بھونچال آتے ہیں اور یہ محل اینٹ اینٹ اور پتھر پتھر ہو کر زمین پر آ رہتے ہیں۔ جھگیاں اور جھونپڑے کھڑے رہتے ہیں۔ ان پر خدا کا ہاتھ ہے۔ اپنا سر خدا کے ہاتھ کے نیچے جھکا لے۔ خدا بے نیاز ہے۔ تیرے ساتھ خدا کی کوئی دشمنی نہیں۔ تو خدا سے دشمنی نہ رکھ۔ یہ حسن فانی ہے۔ یہ دولت آنی جانی ہے۔ جوانی چند دنوں کی بہار ہے، پھر تیرے ہاتھ میرے ہاتھوں کی طرح ہو جائیں گے۔ تیرا چہرہ چمڑا اور خشک ٹہنیاں بن جائیں گے۔ تب تُو ان ہاتھوں کی جھریوں میں خدا کو ڈھونڈتی پھرے گی مگر تجھے خدا نظر نہیں آئے گا... آج اسے ڈھونڈ پھر اس کے کرشمے دیکھ۔"

اجو اور ساجی چلے گئے تو نیلوفر وہیں کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ اپنے سر پر اجو دادا کے ہاتھ کا لمس محسوس کر رہی تھی جیسے خدا نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

*

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جمیل کو صفورہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ ان پڑھ تھا اور پہاڑی علاقے کے پسماندہ دیہات کا رہنے والا تھا۔ وہ عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ سوچتا تھا۔ وہ قانون سے واقف نہیں تھا۔ نہ وہ اس قانون کو تسلیم کرتا تھا جو اسے قتل اور ڈکیتی کا ملزم قرار دیتے ہوئے تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ قانون میں اتنی لچک ہے کہ قانون کو بے گناہ اور بے گناہوں کو قاتل قرار دے سکتا ہے اور وہ جو کہتے ہیں کہ قانون اندھے کی لاٹھی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ بلکہ ہوتا یوں ہے کہ پیسے اور اثر و رسوخ سے یہ لاٹھی جس کے ہاتھ آجاتے وہ اندھے کو اپنی مرضی کے راستے پر لے جاسکتا ہے۔

جمیل کو یہ تو معلوم تھا کہ حوالات سے فرار جرم ہے لیکن اسے وہ اپنا حق سمجھتا تھا اور اسے وہ صحیح بھی سمجھتا تھا جو اس نے پولیس کو دیا تھا۔ یہ آدھ بہت سے تو بے گناہ کو پکڑتے۔ اس نے یہ صحیح اس سوسائٹی کو بھی دیا تھا جس نے وہ لوٹ، اونچی حیثیت اور لال رنگ کی فارچونر کی ایک لڑکی کی عزت کو بھی دیا تھا جس نے اس کی کلاس کی ایک لڑکی کی عزت کو چھینا کیا تھا۔ اس نے پانی کا راز کہا نہیں کی تھی بلکہ اس نے کوٹھیوں کی پوری سوسائٹی کو مار پیٹ کھاتی ہوئی پھینک دیا تھا۔ اس سوسائٹی نے کھانے میں سے اٹھ کر اسے گرفتار کرایا تھا۔ جمیل نے جوابی وار کیا تھا۔ طاقت والوں کی زنجیروں اور ملازموں سے نکل گیا۔

وہ اکھڑ طبیعت کا دیہاتی جوان تھا۔ شکست نہیں کھانا چاہتا تھا۔ وہ نہ مری سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ نہ مری میں رہنے کی مستقل بڑی وجہ یعنی نداسے پولیس کے ہاتھوں میں ساجی کی عزت خطرے میں نظر آرہی تھی۔ اسے احساس پشیمان نہ تھا کہ ساجی کا کوئی بھائی نہیں، باپ نہیں، ایک دادا ہے جو بڑھاپے کی وجہ سے نہ سوچ سکتے ہیں بلکہ مری میں لڑکے کی عزت کی حفاظت کی بڑکیں سوچنا چاہتا تھا۔

مری میں لڑکے رہنے کی دوسری وجہ یعنی نداس نے ماں کو خط لکھوایا تھا کہ وہ مری آجائے۔ اس نے ساجی کے ماں کا پتہ اور راستہ لکھا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ماں آگئی تو پریشانی ہوگی۔ اس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ ساجی کے ماں کو لے کر گاؤں چلا جائے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی ماں بچی ہے اور وہ اسی کو تھی ملازم ہوگئی ہے جس نے مری اور راولپنڈی کی پولیس اس کے پیچھے لگا دی ہے، اور وہ ایسا خواب دیکھ سکتا تھا کہ اسکول ماں آکر اس کی کہانی اپنی ماں کی زبانی سن کر وہ ہوش خود کھو بیٹھے۔

سے آہستہ آوارہ کی طرح نکل کھڑا ہوا تھا۔

آج تو وہ صرف ساجی کے لیے پریشان تھا۔ وہ گاؤں اور سی، آئی، ڈی کے آدمیوں کے گھیرے سے نکل تو گیا تھا لیکن نکل آنے سے اسے خوشی یا اطمینان نہیں ہوا تھا۔ اسے یہ خدشہ پریشان کر رہا تھا کہ اسے ساجی کے قتل میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا گیا ہوگا اور پولیس ساجی کو تھانے لے گئی ہوگی اور گاؤں میں ساجی اور اس کے والد رسوائی بہت ہوئی ہوگی۔ یہ خدشہ اسے اس قدر بے چین کیے ہوئے تھا کہ اس نے یہاں تک سوچ لیا وہ تھانے میں چلا جائے اور کہے کہ مجھے پھانسی دے دو۔ ساجی سے کچھ نہ کہو۔ وہ معصوم ہے، بیگناہ ہے۔

اس نے بہت کچھ سوچا۔ دن کا باقی حصہ ادھر ادھر چھپتے اور جھاڑیوں میں سے جھانکتے گزار دیا۔ وہ اپنی جائے پناہ میں رہ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ پولیس اس کے تعاقب میں آئے گی۔ اسے کوئی انسان نظر نہ آیا۔ دسویں غروب ہوگیا، جنگل تاریک ہوتا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی پناہ گاہ میں چلا گیا۔ اس نے موم بتی جلائی۔ اس کی لو اس کی نقاہت کی نشاندہی کر سکتی تھی۔

سالوں کی گھٹائیں گرجتی دھاڑتی آگئیں اور بڑا ہی شدید طوفان بھی آگیا۔ بارش ایسی موسلا دھار جیسے کوئی بے ہوش۔ آندھی اتنی تیز جیسے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ رہی ہو۔ اس کی چیخوں سے دل دہلتے تھے۔ جمیل کی لاٹھی گھنی بیلیں اور جھاڑیاں بڑی زور زور سے جھول رہی تھیں جیسے طوفان انہیں اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جائے گی کوشش کر رہا ہو۔ جمیل جو بیٹھے ہی بے چین تھا۔ بے کل اور بے قرار ہوگیا۔ آندھی کی چیخوں میں اسے بلکہ چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ حوالات آگئی جس سے وہ بھاگا تھا۔ اسے ساجی حالات میں مجبور اور تھانیدار اس حالات میں۔ اجل ہوتا نظر آنے لگا۔

"وہ تیرے نام پر بے آبرو ہو جی ہے"۔ اسے وہ طوفان کے زناٹوں اور بارش کے شور میں اپنی آواز سنائی دی وہ ایک نامعلوم میں بیلوں اور جھاڑیوں کو اس گفت سے باہر آگیا۔ اس پر بھی کیفیت طاری ہو چکی تھی جیسے بات ایک لمحے کا پاگل پن کہلاتا ہے۔ اس ایک لمحے میں انسان قتل بھی کر گزرتا ہے خودکشی بھی۔ یہ وہ پاگل ہے جو دیوانوں کے دلوں سے خانہ بدوش نکلتے نہیں ہوتا اور قتل اور انتقامی قتل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ جذباتیت کا ایسا غلبہ کہ جمیل کا ... بھاگا طوفان بھی نہ رک سکا۔ اس کے پاؤں اکھڑ رہے تھے جنہیں وہ ... طور پر جمانے کی کوشش کر ... وہ دن کے وقت جب بارش نہیں ہوتی تھی، اوپر سے سنبھل سنبھل ... کے تنوں کو تھام تھام کر اترا کرتا تھا مگر ایسی طوفانی رات ... اس کے پاؤں جھل گیا۔ وہ گرا اور لڑھکتا چلا گیا۔ وہ نیچے پانی میں جا گرا۔ اس کا جسم جل پڑا۔ تیز بہت تیز ... آگے وہ ندی آگئی جس میں سے وہ نیلوں کو بازو ... پار اتھا کر ... طوفانی بارش کے سیلابی دریا ... جمیل ندی میں یوں اترا جیسے یہ بھی اس کی دشمن ہو اور اسے ساجی کا باپ یا ساجی کے دشمن ... پہنچنے ...

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"ہاں، اسی طوفان میں" — انسپکٹر شاہ نے کہا — "وہ طوفان کی وجہ سے گھر میں ہی ہوگی اور اس کے گھر میں کوئی آئے گا بھی نہیں۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ کار دار کو پتہ نہ چلے کہ میں اس کی بھتیجی سے ملا ہوں۔ میں اگر اس سے کوئی اور بھید لینا چاہتا ہوں۔ مجھے کار دار خاصا مشکوک آدمی نظر آتا ہے۔ یہ مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ مقتول اس لیے قتل نہیں ہوا کہ وہ ڈاکوؤں کے مقابلے پر اتر آیا تھا۔ اسے ارادۃً قتل کیا گیا ہے۔ کرائے کے جو ہوٹل استعمال کیے گئے ہیں۔ انٹوئنس، جائیداد اور سٹور وغیرہ کے کاغذات کی چوری بتائی ہے کہ مقتول کو قتل کرایا گیا ہے اور انہیں اُجرت یہ دی گئی ہے کہ وہ کوٹھی سے جو کچھ اُٹھا کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں اور انہیں گرفتار نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انسپکٹر خالد کو اس لیے غائب کیا گیا کہ اُس نے مجرموں کا سراغ لگانا ہوگا۔ اُس نے انہیں گرفتار کرنے کی قیمت اتنی زیادہ مانگی ہوگی جو قتل دینا نہیں چاہتے ہوں گے۔"

"اور وہ حسین دکھانا دار کیوں لاپتہ ہوا؟"

"وہ بظاہر ایک انگوٹھی پر پکڑا گیا تھا۔" انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "لیکن اس کی گمشدگی بتاتی ہے کہ چوری کے تمام زیورات اُسی نے خریدے تھے۔ اسے غائب کیا گیا ہے یا وہ زیورات کے ساتھ خود ہی غائب ہو گیا۔ کسی وقت سامنے آجائے گا اور مجرموں کی تیار کی ہوئی کوئی کہانی سنا دے گا۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔" — انسپکٹر حمید اللہ خان نے کہا۔ "کہ مجرم یہیں ہوں اور دیکھ رہے ہوں کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ انہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ انسپکٹر خالد نے چوری کی انگوٹھی برآمد کر لی ہے۔ اسی لیے انہوں نے دکھانا دار کو اغوا کیا یا اسے غائب ہو جانے کو کہا۔"

"انسپکٹر خالد نے رشوت ضرور لی ہے۔" — انسپکٹر شاہ نے کہا — "اس نے انگوٹھی کی برآمدگی کا نہ مشیر کو بتایا نہ دکھانا دار کا شاخ تفتیش کو۔ کے تھانے میں پابند کیا۔ خالد کی بدمعاشی صاف نظر آتی ہے۔"

"اس کا بال تیچہ نہیں ہے۔" — انسپکٹر حمید نے کہا — "وہ جا کہاں سکتا ہے؟"

انسپکٹر شاہ نے اٹھ دو برساتی پہنی اور اس کا ہیٹ سر پر چڑھا کر بولا۔ "میں نیلو فر کے گھر جا رہا ہوں۔ وہاں کانسٹیبل ڈیوٹی پر ہیں۔ ان سے پوچھوں گا۔ کار دار اندر ہوا تو باہر سے ہی واپس آجاؤں گا۔ اگر کار دار نے مجھے وہاں دیکھ لیا تو کہوں گا کہ کانسٹیبلوں کو دیکھنے آیا ہوں۔"

"اس وقت وہ کسی بڑے ہوٹل یا کلب میں یا اپنے گھر شراب میں بدمست پڑا ہوگا۔" — انسپکٹر حمید نے کہا — "وہ بدمست جمیل اٹھ آجاتا تو جمیل کی مشکل آسان ہو جاتی۔"

"اس کے متعلق یہ تو یقین ہو گیا ہے کہ مرنی میں ہی بہتر ہے۔" — انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "یہ سراغ لگانا مشکل ہوگا کہ وہ ہے کہاں اور کس کی پناہ میں ہے۔"

اُس وقت جمیل اتنی اونچی اور اتنی دشوار ڈھلان اتر گیا تھا۔ طوفان ابھی تھما نہیں تھا۔ بارش ذرا کم ہوئی مگر گھٹیہ

کی طرف سے پہلے سے زیادہ جھل جھلاہٹیں آگئیں۔ اتنا تیز جھکڑ، بڑی دور دور سے گھٹاؤں کو لا رہا تھا۔ آگے ایک اور برساتی ندی تھی جو اس قسم کی بارش میں سیلابی دریا بن جایا کرتی تھی۔ جمیل جب اس کے قریب پہنچا تو اُسے جسم میں اکڑن اور ہڈیوں میں دکھن محسوس ہونے لگی۔ اس نے ندی میں پاؤں رکھا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ندی کا شور اور طوفان کی جنبیں اسے ڈرانے لگیں۔ اس کی جسمانی توانائی ختم ہو چکی تھی۔

اچانک اُسے سامی کا خیال آگیا۔ سامی کی بے عزتی کے خیال اور اپنی جسمانی کمزوری نے اسے بھڑکا دیا۔ وہ ندی میں اتر گیا۔ یہ ندی گہری نہیں تھی۔ بہاؤ سیلابی اور بہت تیز تھا جو پاؤں اکھاڑ تا تھا۔ جمیل اور اس جیسے بہادری جوان ایسی ندیوں کو روند کر پار ہو جایا کرتے تھے مگر جمیل نے جو مسافت طے کی اور جس رفتار سے کی وہ تو گھوڑے کو بھی گرا دیتی ہے۔ وہ نڈھال اور آگے گیا تو پانی اس کی کمر سے زیادہ اوپر تک آگیا۔ وہ ابھی تک پاؤں جما کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہاتھوں سے چپوؤں کا کام لے رہا تھا۔

وسط میں پانی نے اُس کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور سیلابی موجیں اس کی گردن تک پہنچنے لگیں۔ جمیل نے پاؤں اٹھا دیئے اور کنارے کی طرف تیرنے لگا مگر یہ کوشش ناکام تھی۔ سیلاب اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ جمیل کے بازو اکڑ گئے۔

اُس وقت انسپکٹر شاہ، نیلو فر کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا ہمنوا کمزور اس کی اور اس کے ساتھی انسپکٹر حمید اللہ خان کی جان کو آیا ہوا تھا۔ بہت دن گزر گئے تھے اور تفتیش ابھی ذرا سی بھی آگے نہیں بڑھی تھی کیس چونکہ امیروں کبیروں کی سوسائٹی کا تھا اور حکومت اسی سوسائٹی کی تھی، اس لیے تفتیش میں کوتاہی بہت بڑا جرم تھا۔ یہ سی آئی۔ اے کے ان دونوں انسپکٹروں کی عزت اور آئندہ ترقی کا سوال تھا۔ ان کی کمزوری یہ تھی کہ وہ اس سوسائٹی کی ایک لڑکی سے کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن اسے تھانے بلانے سے ڈرتے تھے۔ انسپکٹر شاہ اطمینان میں نیلو فر کے گھر کو جا رہا تھا کہ ڈر رہا تھا کہ اس کا پیچھا کار دار وہاں نہ ہو۔

جس مفرور ملزم نے پولیس کو پریشان کر رکھا تھا وہ انسپکٹر شاہ سے تھوڑا ہی دور نیچے ندی پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ندی اُسے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ پولیس کا یہ مفرور ندی کا قیدی تھا۔ وہ ایک معصوم لڑکی کی عزت کی خاطر موت کے پیٹ میں اتر گیا تھا۔ پار چڑھ جانے کی امید بھی ٹھٹھر کر اکڑ گئی تھی۔

اور جس نے اس معصوم لڑکی کی عزت پر حملہ کیا اور جس سے اس لڑکی کو جمیل نے چھڑایا تھا وہ اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ دو دوست اور دو جوان سال عورتیں تھیں۔ وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ ان عورتوں کے خاوند کسی اور کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ کار دار شراب اور عورت کے نشے میں بدمست ہوا جا رہا تھا۔ اس کوٹھی میں بارش اور آندھی کا صرف شور سنائی دے رہا تھا اور ساون بھادوں میں بارش کی سوندھی گمانی کی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

"موسم کتنا رومانی ہے۔" — کار دار نے اپنے پاس صوفے پر بیٹھی ہوئی عورت کے عریاں بازو پر ہاتھ پھیرتے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہونے کہا۔ "تمہارا شوہر تمہیں ڈھونڈ تو نہیں رہا ہوگا؟"

"اونہہ" عورت نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا۔ "تم اُسے پلپلا مرد سمجھتے ہو؟"

"اوہ خدا!" جمیل نے ندی کو چیرنے کی کوشش کرتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ "اپنے اس قہر سے مجھے کس گناہ کی سزا دے رہا ہے؟"

اُوپر دو سکی اور عورت سے جسم لڑکھڑ ہو رہے تھے۔

نیچے سرخ اور سیلابی ندی تیر، ایک جسم اکڑا جا رہا تھا۔

اور خدا دیکھ رہا تھا۔

کاروار جیسی کوٹھی میں نیلوفر تنہا بیٹھی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی اور چھت پر تیز رفتار ریل گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ باہر طوفان چنگھاڑ رہا تھا۔ نیلوفر کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ سونے والے کمرے میں جانے سے ڈر رہی تھی۔ اپنے خلوت کے خالی پلنگ کو دیکھ کر اُس پر ہول طاری ہوتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کاروار کے دل میں اس کی ہمدردی ہوتی تو وہ اس کے پاس آ جاتا۔ اس طوفانی رات کو اسے اکیلا نہ چھوڑتا۔

وہ گھبرا کر اُٹھی اور اس کمرے کی طرف چل پڑی جو اس نے جمیل کی ماں کو دے رکھا تھا۔ یہ چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جو نوکروں کے لیے نہیں تھا لیکن جمیل کی ماں کو وہ نوکرانی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ کمروں کے اندر اندر سے اُس کمرے کے دروازے تک گئی۔ آہستہ سے کواڑ کھولا جمیل کی ماں مصلے پر بیٹھی تھی اور اس کے دو ہاتھ اُٹھا کر گئے تھے۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

"یا خدا! تجھے اپنے رسولؐ کا واسطہ تو۔۔۔" اس کے بلتے ہونٹوں سے بلند آواز نکلی۔ "میرا بیٹا جہاں ہے اسے سکھی رکھنا۔ اس کی مصیبت مجھ پر ڈال دینا۔ اس کی موت مجھے دے دینا۔۔۔" اور اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

جمیل تو اکڑا ہی گیا تھا۔ اُس کے بازوؤں میں اپنے جسم کو پانی سے نکالنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس نے پانی میں کھڑا ہونے کی کوشش کی تو پاؤں جم نہ سکے۔ اس کی ماں کی دعا جب سسکیوں میں بدل گئی تو جمیل نے اس اشیہ پر اکڑے ہوئے جسم کی بچی کھچی طاقت سے جھٹکا دیا کہ نکل گیا اور نہ اپنے آپ کو سیلاب کے سپرد کر دے گا۔ اس جھٹکے سے اس کا جسم پانی سے اٹھا اور اس کے بازو جو جواب دے گئے تھے، چپوؤں کی طرح چلنے لگے۔ اس کے پاؤں خدا ہی آگے جا کر ندی کی تہ پر لگنے لگے۔ وہ کھڑا ہوا تو پانی کمر سے نیچے ہو گیا تھا۔ وہ ندی کے تند بہاؤ اور گہرے پانی سے نکل گیا تھا۔

پھر وہ ندی سے نکل گیا۔

اُسے ابھی بہت دور جانا تھا اور اسے واپس بھی آنا تھا۔ اس کے قدم اس کے قابو میں نہیں رہے

تھے۔ کبھی اسے یوں جھٹکا لگتا جیسے اس کی ٹانگیں جسم سے الگ ہو رہی ہوں۔

دور اور پُراس کی ماں مصلے پر بیٹھی اس کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔

اچھا دادا سو گیا تھا۔ ساجی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ذہن بھٹک رہا تھا۔ ساجی دلیر لڑکی تھی چونکہ اس کا ضمیر صاف تھا۔ اس پر جرم کا بلکا سا بھی بوجھ نہ تھا۔ اس لیے بیباک تھی جسے دیہاتی زبان میں مُنہ پھٹ کہا جاتا ہے مگر نو عمر تھی اور پلپاندہ ماحول کی پروردہ تھی، بڑے حالات پیدا کرنے والوں کے سامنے کچھ بات کہہ سکتی تھی، انہیں کوس سکتی تھی، ان کے منہ نوچ سکتی تھی لیکن حالات کو سنوارنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کی بجائے پریشان ہوتی تھی، روتی تھی اور آہیں بھرتی یا اس کا غصہ اس کا اپنا ہی خون جلاتا رہتا۔

آج اُس نے جمیل کو دیکھا تھا۔ اس کی باتیں سنی تھیں، اس کے ساتھ باتیں کی تھیں جمیل اس کے خشک ذہن کو گیا تھا۔ ساجی سوچ رہی تھی کہ جمیل بدمعاش ہوتا تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس کے پاس کیوں آتا۔ اگر وہ ڈاکو ہوتا تو اسے لڑکیوں کی کمی نہ ہوتی۔ ساجی اگر جمیل کو ڈاکو سمجھتی بھی تھی تو صرف اس حد تک کہ جمیل نے اس کے دل پر ڈاکہ ڈالا ہے اور اس کا دل اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔

اُسی روز کچھ دیر پہلے اس کی ملاقات نیلوفر کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کے تصوروں میں نیلوفر اگنگی سیلبی نے نیلوفر کو پہلی بار اُس وقت دیکھا جب اس کی بندوق سے نکلے ہوئے چھرّوں نے اس کے کاؤں کے ایک لڑکے کا بازو زخمی کر جلایا، پھر اُسے جمیل کے ساتھ آج ہی دیکھا جب وہ جنگل کی پناہ گاہ کے علاقے میں گئی تھی۔ وہ اس لڑکی کو ڈاکو اور بڑی خوبصورت چڑیل سمجھتی تھی۔ مگر آج جب وہ اپنے دادا کے ساتھ تھانے سے واپس آ رہی تھی تو یہی لڑکی نہ صرف ایک انسان کے روپ میں اسے نظر آتی تھی بلکہ ایک دکھی انسان کے روپ میں۔

ساجی کو نیلوفر کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اُس کے آنسو یاد آنے لگے۔ نیلوفر کا خاوند قتل ہو گیا تھا اور اُس کا گھر لٹ گیا تھا۔ اسے اسی طرح غمزدہ اور دکھی ہی ہونا چاہیے تھا مگر اس نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں جن کی ساجی کو توقع نہیں تھی کہ یہ لڑکی کہہ سکے گی۔ وہ جمیل کو بے گناہ کہہ رہی تھی۔ اس لیے وہ اسے اچھی لگی تھی۔

طوفان کے چنگھاڑتے ہوئے تھپیڑوں سے ساجی کے مکان کے بند اور ڈھیلے کواڑ اور بوسیدہ چھت بڑی زور زور سے لرزتی اور ان سب کی آوازیں ڈراؤنی سی لگتی تھیں۔ ساجی کے بھٹکتے ہوئے ذہن میں یہ رات آ گئی جس رات جمیل نے ایک اجنبی کے روپ میں اُس کے دروازے پر پہلی دستک دی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ جھگڑے سے کاؤں تباہ کر رہے ہیں۔ وہ رات اس طرح طوفانی تھی۔ اسے یاد تھا کہ دادا نے کہا تھا کہ ایسی راتوں میں بھیڑیے ساتھی مل جاتے ہیں۔

اُس رات کا اُسے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ کوئی ماضی کا قصہ نہیں تھا چند دن پہلے کی بات تھی جب جمیل اپنی کالی کھوڑی کے ساتھ اُس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ پہلی طوفان میں آیا تھا۔ وہ طوفان

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

قوات کے پچھلے پہر ختم ہو گیا تھا مگر جو طوفان جمیل اپنے ساتھ لایا تھا، اس کی تیزی اور تُندی بڑھتی جا رہی تھی۔

ساجی جمیل کی اس پہلی ملاقات میں کھو گئی۔ حالات سے گھبرا کر اُس نے جمیل کے تصور میں جا پناہ لی۔ اس فرار سے اسے لطف محسوس ہونے لگا۔ اس کے تصور میں جب جمیل کی گھوڑی آتی تو ساجی اٹھ کھڑی ہوتی۔ وہ مویشیوں کے کمرے میں جانے کو اٹھی تھی۔ دروازے تک گئی تو اس کے دادا کی آنکھ کھل گئی۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹی؟"۔۔۔ اچھو دادا نے دکھ زدہ اور نیند سے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"مویشیوں کی چھت نہ ٹپک رہی ہو"۔۔۔ ساجی نے کہا۔ "ذرا دیکھ آؤں"۔

"دیکھا تو، دیکھ آؤ"۔۔۔ دادا نے کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

مویشیوں کے کمرے میں جا کر ساجی نے دیوار کے سوراخ میں رکھی ہوئی چابیاں اُٹھائی۔ اسی سوراخ میں دیا رکھا تھا۔ اس نے دیا جلایا۔ وہ چھت کو نہیں جمیل کی گھوڑی کو دیکھنے آئی تھی۔ اس نے گھوڑی کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ جذبات کی شدت سے اس نے اپنا گال گھوڑی کی گردن پر رکھ دیا۔

مویشیوں کے کمرے کے باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔

ساجی اسے تصوروں کی آواز سمجھی جیسے جمیل اس کے ذہن کے بند کواڑ آہستہ آہستہ کھٹکھٹا رہا ہو۔ ساجی اپنے تصوروں میں گم ہو گئی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

اب ساجی چونکی۔ مویشیوں کے کمرے کا بیرونی دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔ اس دروازے پر کسی نے کبھی دستک نہیں دی تھی۔ دروازے پر ایک بار پھر کسی نے ہاتھ مارا تو ساجی حقیقی دنیا میں آ گئی۔ اس کا دل بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس وقت کون آ سکتا ہے؟۔۔۔ ساجی کو یہ سوال پریشان کرنے لگا۔ خانہ جنگ ہو پولیس ہو گی۔ اس نے دادا کو جگانے کا ارادہ کیا مگر اسے خیال آیا کہ دادا بیچارہ اُٹھ کر کیا کرے گا۔

وہ آہستہ آہستہ دروازے تک گئی اور دروازے کے ساتھ مُنہ لگا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"دروازہ جلدی کھول دو ساجی۔ مجھے واپس جانا ہے"۔

اُس نے جمیل کی آواز پہچان لی اور کانپتے ہاتھوں سے زنجیر کھول دی۔ طوفان کے زناٹے کے ساتھ جمیل اندر آ گیا اور اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

"دروازے کی دراڑوں سے دیئے کی روشنی دیکھی تو میں نے اسی دروازے پر ہاتھ مارا"۔۔۔ جمیل نے بڑی بے مشکل سے یہ الفاظ کہے۔ اس کے دانت بج رہے تھے اور جبڑے اکڑے ہوئے تھے۔

"میں آگ جلاتی ہوں"۔

"نہیں ساجی!"۔۔۔ جمیل نے کہا۔ "میں رکنے کے لیے نہیں آیا۔۔۔ مال آ گئی ہے؟"

"نہیں آئی"۔

"پولیس نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟۔۔۔ بہت جلدی بولو میں زیادہ دیر رک نہیں سکوں گا"۔

ساجی نے اُسے بتا دیا کہ اسے اور دادا کو تھانے لے گئے تھے۔ وہاں جو باتیں ہوئیں وہ بھی بتا دیں اور بھی بتا دیا کہ سنبلو فرسے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتیں بھی سنا دیں۔

"تم تھانے میں حاضر کیوں نہیں ہو جاتے ہو"۔۔۔ ساجی نے پوچھا۔

"نہیں ہوں گا"۔۔۔ جمیل نے کہا۔

ساجی نے آگے بڑھ کر اُس کا چہرہ جس پر بھورے رنگ کی داڑھی اُگ آئی تھی، دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ جمیل اس کے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"میں تمہاری محبت کی خاطر ہاتھ میلے کی خاطر نہیں آیا"۔۔۔ جمیل نے کہا۔ "میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ تمہاری عزت خطرے میں تو نہیں۔ اگر آج رات تم گھر نہ ملتیں تو میں تھانے چلا جاتا"۔

"تم اپنے دل میں کیوں نہیں چلے جاتے"۔۔۔ ساجی نے رنجیدگی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے ماں کا انتظار تھا۔ وہ نہیں آئے گی۔ آنا ہوتا تو آ جاتی۔ اب میں تمہارے لیے رکا ہوا ہوں۔ تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اچھو دادا کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ اچھو دادا کے ساتھ بات کر لو"۔

"اندر چلو"۔ ساجی نے کہا۔ "اُس سے بات کر لو۔ وہ نہیں مانے گا"۔

"میں جا رہا ہوں، پکڑا جاؤں گا"۔

"اور سنو جمیل!"۔۔۔ ساجی نے کہا۔ "آئندہ یہاں نہ آنا۔ نہ میرے لیے نہ اپنی گھوڑی کے لیے۔ میں تمہیں جانچتی ہوں کہ تمہارا نیاز مجھے اور گھوڑی کو تمہاری گھوڑی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ مجھ سے اور اپنی گھوڑی سے دور رہنا۔ میں اب تمہاری بکریاں آؤں گی۔ میرے نہ پیچھے آدمی لگے ہوئے ہیں"۔

بارش کا زور ختم ہو گیا۔ جھکڑ کا جنجیلیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ جمیل اور ساجی ادھوری ادھوری باتیں کر رہے تھے۔ وہ اتنی جلدی جدا نہیں ہونا چاہتے تھے لیکن جمیل وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور بولا۔ "پولیس نے تم پر ہاتھ رکھا تو میں تھانے حاضر ہو جاؤں گا"۔۔۔ اس نے دروازہ پھر بند کر دیا اور کہنے لگا۔ "ہماری دولت ہماری عزت ہے۔۔۔ ساجی! اگر اپنی عزت کی خاطر تم اپنی جان دینے سے ڈرجاؤ تو مجھے ٹٹولی پر کھڑا کر دینا۔ تھانیداروں کو ساتھ لے کر وہاں آ جانا جہاں میں چھپا ہوا ہوتا ہوں۔ میں تمہاری خاطر تھانے سے بھاگا تھا۔ میں پولیس کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ انگوٹھی تم نے مجھے دی تھی، ورنہ پولیس تمہیں بھی حوالات میں بند کر دیتی۔ اب ضرورت پڑی تو تمہاری خاطر تھانے میں حاضر ہو جاؤں گا"۔

جمیل نے دروازہ کھولا اور نکل گیا۔

ساجی نے زنجیر چڑھا دی۔ جمیل کو دیکھ کر اُس کے سینے سے باتوں کا طوفان اُٹھ آیا تھا مگر اُسے یہ طوفان

www.paksociety.com

Scanned & Designed by Azeem Paksociety.com

سینے میں ہی روکنا پڑا تھا۔ اس کا دل بھر آیا اور وہ رونے لگی، پھر اس کی ہچکی بندھ گئی۔

نیلوفر اپنی کوٹھی میں جمیل کی ماں کے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولے کھڑی جمیل کی ماں کو دیکھ رہی تھی کا خالی کی یہ ویران دھاسے خالم ہوتی تو وہ ہنستے ہنستے ہٹی نہیں۔ اس کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو گزاری تھیں، اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اس پر انہماک اور وجد کی کیفیت طاری تھی۔ اسے نیلوفر کی موجودگی کا علم نہیں تھا کیونکہ اُدھر اس کی پیٹھ تھی۔

نیلوفر کی آہ نکل گئی۔ اسے اس عورت پر رشک آنے لگا جو بہت غریب تھی، پردیسی تھی، وہ وقت کی کوٹی در سر چھپانے کے لیے اس کی نوکرانی بن گئی تھی لیکن اسے وہ سکون اور اطمینان حاصل تھا جو نیلوفر کو دولت میں بڑھتے ڈالیوں جیسی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکا۔

"یہ عورت خدا کے کتنی قریب ہے" اُس کے ذہن میں خیال آیا۔ "اور جو سے خدا ناراض ہے" — ں کے اندر سے آواز آئی۔ "دنیا کی زیب و زینت میں خدا نہیں ملتا" — اسے سابق کے الفاظ یاد آنے لگے "تیرا ریشن اور تیرے پیکل جل بکر راکھ ہو جائیں گے جن کا کوئی نہیں ہوتا اُن کا خدا ہوتا ہے" — پھر اسے سابق کے دادا کی آواز سنائی دی۔ "یہ محل اینٹ اینٹ اور پتھر پتھر ہو کر زمین پر آ رہتے ہیں جھگیاں اور جھونپڑے کھڑے رہتے ہیں۔ ان پر خدا کا ہاتھ ہے۔ اپنا سر خدا کے ہاتھ کے نیچے جھکا لے خدا بے نیاز ہے۔ یہ حسن فانی ہے۔ یہ دولت فانی جانی ہے"

اُس نے دل پر گھٹن اور گھبراہٹ محسوس کی۔ دروازہ آہستہ آہستہ بند کیا اور سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں اُسے اپنا سراپا نظر آیا۔ وہ آئینے کے سامنے رُک گئی اور سر سے پاؤں تک اپنے تپ کو دیکھا۔ اُس کے بالوں میں حسن کی چمک تھی، آنکھوں میں دل کشی تھی، چہرہ حسین تھا۔ قدرت میں جاذبیت تھی۔ اُس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ قیمتی تھے مگر اسے اپنے آپ سے اور اپنے لباس سے گھن آنے لگی۔

طوفانِ بادو باراں کے ہنگامے میں اُسے دروازے کی گھنٹی (کال بیل) کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک گئی اس طوفان میں کون آیا ہے؟ — کار وار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کبھی گھنٹی نہیں بجائی تھی۔ بغیر اطلاع آیا کرتا تھا۔ یہ پہرے والا کوئی کانسٹیبل ہو سکتا تھا۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو گا۔

وہ بڑے دروازے تک گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے کھولا۔ اُس کے سامنے انسپکٹر شاہ کھڑا تھا۔ اس نے برساتی نما برکر کانسٹیبل کو دے دی تھی۔

"آپ کے اس وقت آنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آپ کوئی اہم خبر لائے ہیں" — نیلوفر نے فو میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ سے کہا۔ "آجائیے"

"خبر لیئے آیا ہوں، کوئی خبر لایا نہیں" — انسپکٹر شاہ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "میں جوتے اتار لوں۔ ں کے اندر بھی پانی پڑ گیا ہے۔ آپ کا فالین خراب ہو جائے گا"

"اگر بوٹ آپ کا پریشان نہ کرتے ہوں تو فالین کی پروا نہ کریں" — نیلوفر نے کہا۔ "ان چیزوں کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی..... بیٹھیے اور بتائیے کہ اتنی تیز بارش اور جھکڑ میں آپ کیسے آئے؟"

"کچھ پوچھنے آیا ہوں" — انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "اس کے لیے یہی وقت اور یہی موسم موزوں تھا۔ میں آپ وصاف الفاظ میں بتا دوں کہ ہماری اس ملاقات کا علم آپ کے انکل کار وار کو نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے یہ نہ کرلیا تھا کہ مسٹر کار وار آپ کی کوٹھی میں نہیں۔ ایسے موسم میں کوئی کسی کے ہاں جا بھی نہیں سکتا۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے بھول سکتی ہیں کہ مسٹر کار وار آپ سے چھپا رہا ہے؟"

"جتنی دیر کے لیے چاہیں بھول سکتی ہوں"

"آپ کے دل میں ان کے خلاف کیا شکایت ہے؟" — انسپکٹر شاہ نے پوچھا — "اور وہ آپ سے پیچھے پیچھے کیوں رہتے ہیں؟"

"اگر میں ان سوالوں کا جواب نہ دینا چاہوں تو کیا ہو گا؟"

"ہم آپ کے خاوند کے قاتل اور ڈاکے کے مجرموں کو پکڑ نہیں سکیں گے" — انسپکٹر شاہ نے کہا — "میں یہ سمجھوں گا کہ آپ مجرموں کی گرفتاری کو اور زیادہ مشکل بنا رہی ہیں"

"لیکن انکل کار وار کا مجرموں کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان کا مجرموں کے ساتھ کوئی تعلق ہے" — انسپکٹر شاہ نے جواب دیا — "میں جاس لوفانی بارش میں آپ کے پاس آیا ہوں، کچھ سوچ کر آیا ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں کچھ ہے جو آپ کہنے سے ڈرتی ہیں"

نیلوفر چپ ہو گئی اور اس نے سر جھکا لیا۔

"نیلوفر!" — انسپکٹر شاہ نے قریب ہو کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ کی دو تین انگلیاں ایسے انداز سے رکھیں جس میں شفقت تھی — "اس وقت مجھے خانیدار نہ سمجھیں۔ میں اتنی لمبی سڑکیں میں ہزاروں مردوں، عورتوں اور آپ جیسی نوجوان اور مظلوم لڑکیوں سے تفتیش کر چکا ہوں۔ میں نے طلسمے کی نفسیات کی کوئی کتابیں نہیں پڑھی لیکن جو میں جانتا ہوں وہ فلسفے اور نفسیات کے عالم بھی کم ہی جانتے ہوں گے۔ میں نے چہرے پڑھے ہیں، انسانوں کے دل پڑھے ہیں۔ آپ کے چہرے پر صرف یہ نہیں لکھا کہ آپ کا خاوند قتل ہو گیا ہے، مگر میں نے وہ کتاب پڑھا ہے اور آپ لوفانی میں بیوہ ہو گئی ہیں۔ اس پر کچھ اور بھی لکھا ہے۔ میں یہ پڑھنا چاہتا ہوں"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں؟"

"نہیں!" — انسپکٹر شاہ نے جواب دیا — "مسٹر آفتاب کے خون آلود کپڑے برآمد ہوئے ہیں۔ میں لاش دیکھ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بغیر یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ قتل ہو چکے ہیں۔"

"کیا اتنے دنوں بعد لاش ملنے کی امید ہے؟"

"یہ واردات ایک آدمی کی نہیں"۔۔۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔۔۔"تین چار آدمیوں کی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ہاتھ آگیا تو بہت کچھ ہو جائے گا۔۔۔ کیا آپ کو یقین نہیں آیا کہ مسٹر آفتاب قتل ہو چکے ہیں؟"

"مجھے اس وقت تک یقین نہیں آسکتا جب تک لاش نہ دیکھ لوں"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔۔۔"آج میرے پاس ایک صاحب اپنی بیگم کے ساتھ افسوس کے اظہار کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جو خون آلود کپڑے برآمد ہوئے ہیں انہیں یہ معلوم کرنے کے لیے لاہور بھیجا گیا تھا کہ یہ انسانی خون ہے یا کسی حیوان کا؟ اور کیا یہ آفتاب کا ہی خون ہے؟"

انسپکٹر شاہ جو کچھ جیسے کسی نے اُسے سوئی چبھوی ہو۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے ٹیلیفون پڑا نظر آیا۔ اٹھ کر فون تک گیا اور ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

"کون ہو؟۔۔۔ انسپکٹر حمید کو بلاؤ۔۔۔ اوئے گیا کہاں ہوگا۔ میں اُسے تھانے میں چھوڑ آیا تھا۔۔۔ جلدی جاؤ۔ اُسی کمرے میں ہوگا۔"

نیلوفر اُسے حیران سی ہو کے دیکھ رہی تھی۔

"لو سے حمید"۔۔۔ انسپکٹر شاہ نے فون پر کہا۔۔۔"تم نے خون آلود کپڑوں کی رپورٹ دیکھی تھی؟۔۔۔ نہ یار! میں نے بھی نہیں دیکھی۔۔۔ میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔ کاغذات میں سرہاڈ جسٹ کی رپورٹ ہے ہی نہیں۔ میں ہولڈ کرتا ہوں۔ فائل دیکھ کر مجھے بتاؤ اور اسے۔ ایس۔ آئی سے بھی پوچھو۔"

انسپکٹر شاہ نے ریسیور کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر نیلوفر سے کہا۔"آپ نے بڑے کام کی بات پوچھی ہے۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ مسٹر آفتاب کے سلیپنگ سوٹ پر جو خون ہے وہ انسان کا ہے یا کسی جانور کا۔ میرا خیال ہے انسپکٹر خالد نے یہ کپڑے لاہور سرہاڈ جسٹ کے پاس معائنے اور رائے کے لیے بھیجے ہیں نہیں؟"

"ہاں۔۔۔ ہیلو۔۔۔ نہیں؟"۔۔۔ انسپکٹر شاہ نے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔۔۔"اس کا مطلب یہ ہے کہ انسپکٹر خالد خاصا گھپلا کر گیا ہے۔ اس نے اندھا دھند یقین کر لیا ہوگا کہ یہ انسان کا یعنی آفتاب کا ہی خون ہے۔ خالد کا اے۔ ایس۔ آئی بھی یہی بتاتا ہے کہ خون آلود کپڑے لاہور نہیں بھیجے گئے تھے۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایسا ہی ہے خالد نے اچھا تیر مارا ہے۔ وہ غائب کیا نہیں گیا، خوفناک مُردا ہے۔ ذرا سوچو حمید! کلفٹنوں سے اور اسے۔ ایس۔ آئی سے کہیں پتہ چلا تھا کہ مقتول کا پاجامہ ایک جگہ پڑا ملا کچھ اور رومال پڑا ملا۔ ایک جگہ جیکٹ بک پڑی تھی۔ کیا مقتول کا پاجامہ اتار کر اُسے قتل کیا گیا ہے؟ رومال اتنی دوریوں پر ملا تھا؟ کیا پاجامہ پھٹا ہوا ہے؟ جیکٹ بک وہاں کیوں پڑی تھی؟ کیا آفتاب نے رومال اور جیکٹ بک سلیپنگ سوٹ میں رکھی ہوئی تھی؟۔۔۔ بول کر دیکھو! میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔ ان اشیاء کو ایک بار پھر دیکھ کر ابھی پارسل بنا دیں گے اور ملی ایسوسی ایٹ اے ایس آئی کو لاہور بھیج دیں گے۔ ابھی کسی

بھی نہ بتانا کہ میں کہاں ہوں۔"

اُس نے ریسیور رکھ کر آہ بھری۔ نیلوفر کے چہرے پر رونق آگئی تھی جیسے اُسے آفتاب زندہ مل گیا ہو۔

"کپڑوں پر خون آفتاب کا نہیں ہو سکتا"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔۔۔"نہیں ہو سکتا شاہ صاحب! وہ زندہ ہیں۔۔۔ زندہ ہیں۔۔۔ زندہ ہیں۔۔۔

بلا بہت پر عمل نہ کیا تو مسٹر آفتاب مگر زندہ ہوتے تو شاید زندہ نہ نکل سکیں؟"

"میں اُن کے ساتھ اس ملاقات کی کوئی بات نہیں کروں گی۔"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کو اپنے خاوند کے قتل کا غم نہیں ہے۔" انسپکٹر شاہ نے بہلیں تیر چلایا۔ وہ اس لڑکی کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ مری سے چلی جائیں گی اور ہمدردی شادی کر لیں گی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" نیلوفر نے تڑپ کر کہا۔ "میں جانتی ہوں یہ افواہ کس نے پھیلائی ہے۔"

"شاید وہی ہو۔" انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "آپ اس کا نام بتائیں۔"

"ارشد کے سوا کون ہو سکتا ہے۔" نیلوفر نے کہا۔ "ابھی کل میرا خاوند لاپتہ ہوا ہے اور وہ مجھے پکنک کی دعوت دینے آگیا تھا۔ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے دھتکار دیا تو مجھے بدنام کرتا پھر رہا ہے۔"

انسپکٹر شاہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ارشد کون ہے۔ اُس کا تیر ٹھکانے پر لگا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں نیلوفر! تو میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "ارشد کو آپ خاوند کی موجودگی میں اپنے ساتھ اس قدر بے تکلف کر رکھا ہو گا کہ آپ کے خاوند کے مرنے یا لاپتہ ہونے ہی اس نے آپ کو شادی کی پیش کش کر دی۔ کسی بیوہ کو کوئی یوں پکنک کی دعوت نہیں دیا کرتا... کیا ارشد آپ کا دوست تھا یا مسٹر آفتاب کا؟"

"میں نے اس پر کبھی لعنت بھی نہیں بھیجی تھی۔" نیلوفر نے جواب دیا۔ "کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ آفتاب کے ساتھ بھی اس کا میل جول نہیں تھا۔"

"عجیب بات ہے۔" انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "میں کیسے یقین کروں کہ اس کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی تھی اور وہ شادی کی پیش کش لے کر آگیا؟"

"اسے انکل کا رہا یا تھا۔" نیلوفر نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "انکل چاہتا ہے کہ میں ارشد کے ساتھ شادی کر لوں۔ انکل مجھ سے آزاد ہو کر اپنے کاموں کی طرف توجہ دینا چاہتا ہے۔ اس نے ارشد کو میرے پیچھے ڈال دیا۔ میں نے اسے صاف جواب دے دیا ہے۔"

انسپکٹر شاہ کو اس سے شک ہو گیا کہ نیلوفر کے دل میں کاروار کی عزت نہیں کہ وہ اس کا نام احترام سے نہیں لے رہی تھی۔ انسپکٹر شاہ نے تفتیشی افسروں کی طرح لیکن مُلائمیت اور ہمدردی سے نیلوفر کو یقین دلایا کہ وہ کاروار کی مدد کر رہا تھا۔ نیلوفر شفقت اور ہمدردی کی محتاج تھی۔ انسپکٹر شاہ نے اس کی یہ ضرورت پوری کر کے اس سے وہ باتیں کہلوا لیں جو وہ کاروار کے ڈر سے نہیں کہتی تھی۔

"اگر آپ نے انکل کاروار کو بتا دیا کہ میں نے آپ کو یہ باتیں بتائی ہیں تو میں نہ بتا سکتی کہ وہ مجھے کیا سزا دیں گے۔" نیلوفر نے کہا۔ "اب آپ سے یہی درخواست کر سکتی ہوں کہ ان سے ذکر نہ کیجیے گا۔"

"میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ کے اور ان کے درمیان دشمنی پیدا ہو۔" انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "میرا مقصد

صرف یہ ہے کہ مجرموں کو پکڑوں اور اگر مسٹر آفتاب زندہ ہیں تو انہیں زندہ برآمد کروں۔ اس لحاظ سے میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے مسٹر کاروار کے ساتھ نہیں۔ میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ دوسری شادی نہ کریں۔"

انسپکٹر شاہ نے یہ تیر نیلوفر کو احمقانہ لگنے کے لیے دیا تھا۔ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ نیلوفر شادی کرتی ہے یا نہیں۔ نیلوفر اسے اپنا ہمدرد سمجھ بیٹھی۔

"اگر انکل کاروار زبردستی کریں تو آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟" نیلوفر نے پوچھا۔

"کیا انہوں نے زبردستی کی دھمکی دی ہے؟" انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔

"وہ مجھے ڈرا رہے ہیں۔"

"وہ آپ کے چچا ہیں۔" انسپکٹر نے کہا اور پوچھا۔ "کیا آپ کے والدین بھی مدد نہیں کر سکتے؟"

"میرے والدین ہوتے تو میں اس شخص کے رحم و کرم پر کیوں پڑی رہتی؟" نیلوفر نے کہا۔ "اور میں آپ کو یہ بات اور بتانا چاہتی ہوں... انکل کاروار شاید میرے چچا نہیں۔ مجھے کہتے ہیں کہ میں کشمیر کے اُن خانہ بدوشوں کی بیٹی ہوں جو برف باری کے موسم میں میدانوں میں اُتر آتے اور گرمیوں میں پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے پانچ چھ سال کی عمر میں اغوا کیا گیا تھا اور مجھے انکل کاروار نے شہزادیوں کی طرح پالا تھا۔"

انسپکٹر شاہ ششدر ہو کے رہ گیا اور بھٹی پھٹی نظروں سے نیلوفر کو دیکھنے لگا۔

"مسٹر کاروار کی اپنی کوئی اولاد نہیں؟" انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "انہوں نے آپ کو متبنیٰ بنایا ہو گا۔ آپ انہیں ملی ہوں گی۔"

"انہوں نے تو شادی ہی نہیں کی۔" نیلوفر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے انہوں نے مجھے گود لیا ہو لیکن مجھے بتانے کی ضرورت تھی؟ اور مجھے یہ کیوں بتا رہے ہیں کہ میں ان کی یتیمی ہوں اور میرے ماں باپ نہیں مر گئے تھے؟"

انسپکٹر شاہ کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس سوچ میں کھو گیا تھا کہ نیلوفر نے جو نئے انکشاف کیے ہیں ان کا آفتاب کے قتل اور ڈلنے کے ساتھ کوئی تعلق ہے؟ اس نے نیلوفر کو یقین دلایا کہ وہ کاروار کے کوئی بات نہیں کرے گا اور اسے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ کوئی بات نہ کرے۔

"ارشد کہاں رہتا ہے؟" انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔

نیلوفر نے بتایا کہ وہ اپنی کوٹھی میں رہتا ہے۔ اس نے کوٹھی کا نمبر بتا دیا اور کہا۔ "سنا ہے بہت امیر کبیر

بارش تھم گئی تھی۔ طوفان کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ہوا بہت تیز تھی۔ انسپکٹر شاہ آہستہ آہستہ تھانے کو جا رہا تھا۔ وہ نیلوفر کی باتوں کا تجزیہ کر رہا تھا۔ ایک نقطہ تھا جو الجھتا ہی جا رہا تھا۔ نیلوفر کی ساری باتیں اس ایک سوال

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ "کیا ان باتوں کا واردات کے ساتھ کوئی تعلق ہے؟"

"اُسے ارشاد اور کاردار پر شک ہو رہا تھا۔ نیلوفر کے خاوند کے قتل کے فوراً بعد ارشد کا شادی کی پیشکش کرنا اور کاردار کا نیلوفر کو ڈرانا دھمکانا شک کو پختہ کر رہا تھا۔ اگر ارشاد اور کاردار اصولوں سے آدمی ہوتے تو اگر ایک وقت ان کے گھر جا سکتا یا انہیں تھانے بلا کر پوچھ سکتا کہ یہ کیا چکر ہے۔ وہ نہ بتاتے تو انہیں مار پیٹ کر یہ گر یہ دونوں آدمی حاکموں کی سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مُنہ سے اپنے مطلب کی بات نکلوانا کے بس کی بات نہیں تھی۔

اُس نے تھانے جا کر سہیلا ہام یہ کہا کہ راولپنڈی ڈی۔ ایس۔ پی کو اُس کے گھر کے نمبر پر ٹیلیفون کیا اور اسے جو باتیں سنائی تھیں وہ اُس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو سنا دیں۔ اس نے اپنی بے بسی بھی بتائی۔ ڈی۔ ایس اسے بتایا کہ وہ کل صبح مری پہنچ جائے گا اور خود تفتیش کرے گا۔

انسپکٹر شاہ اور انسپکٹر حمید نے آفتاب کا خون آلود پاجامہ اور رومال دیکھا۔ خون کے دھبے بڑی غور سے دیکھے۔ پاجامے پر پیٹن چار جگہ خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاتھوں پر زخم آئے دونوں انسپکٹروں نے دھبوں والی جگہیں غور سے دیکھیں۔ وہاں چاقو یا گولی لگنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اگر زخم بالائی حصے پر ہوتے تو ان سے بہتا ہوا خون پاجامے پر ناف سے نیچے تک گیا ہوتا، مگر دھبے رانوں پر۔

رومال پر خون کا دھبہ شک پیدا کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں زخم ہوا ہو اور اس پر رومال رکھا گیا۔

انہوں نے ان کپڑوں کا پارسل بنایا اور سرٹیفکیٹ کے نام خشخشی لکھ کر اسے۔ ایس۔ آئی کو اس ساتھ دے دی کہ وہ مری سے پہلی بس سے نکل جاتے اور لاہور پہنچے اور خون کی رپورٹ لے کر آئے کہ یہ ہے یا کسی حیوان کا۔

صبح اے۔ ایس۔ آئی روانہ ہو گیا۔

● کچھ دیر بعد ڈی۔ ایس۔ پی آ گیا۔ انسپکٹر شاہ نے اُسے نیلوفر کی سنائی ہوئی باتیں ایک بار پھر سنائیں۔ انسپکٹروں اور ڈی۔ ایس۔ پی نے ان کا تجزیہ کیا اور فیصلہ جمع کر دی۔ ایس۔ پی ارشد کے ساتھ بات کرے گا وقت ارشد کی کوٹھی چلا گیا۔ دس بج رہے تھے لیکن ارشد ابھی سویا ہوا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس کے نوکر کہا کہ اسے فوراً جگاؤ۔

ارشد کاردار کی کلاس کا امیر زادہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں آیا تو اُس کی آنکھوں میں نیند کا خمار اور چہرے کے آثار تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس کے آرام میں مخل ہونے کی معذرت کی۔

"ہم لوگ اُس روز سے جاگ رہے ہیں جس روز سے مسٹر آفتاب کے قتل اور ان کی کوٹھی میں ڈاکہ زنی ہوئی ہے۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ کو اگر ذرا سا بے آرام ہونا پڑا ہے تو میرا خیال ہے آپ برداشت کریں گے۔"

"قتل اور ڈاکے کے ساتھ میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

"کیا آپ کا منحوس نہیں کہ آپ کی سوسائٹی کا ایک جوان آدمی مارا گیا ہے؟"

"منحوس تو ہے۔" ارشد نے کہا۔ "لیکن آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے کسی تمہید کے بغیر پوچھ لیں۔"

"مسٹر ارشد! آپ۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "واردات کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا اور آپ مقتول کی بیوہ کے ہاں شادی کے لیے پہنچ گئے؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" ارشد نے کہا۔ "اس کا واردات کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"مسٹر ارشد! آپ۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ یہ معلوم نہیں کس خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر آپ میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گے تو میں آپ کو اسی حالت میں، اسی پلیٹنگ سوٹ میں تھانے لے جاؤں گا اور پولیس کے طریقے کے مطابق تفتیش کروں گا۔ میں آپ کی عزت افزائی کی خاطر یہاں آیا ہوں۔ میں جو پوچھتا ہوں وہ بالکل سچ بتا دیں۔ آپ سے متعلق باتیں مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئیں تو آپ کی حیثیت مشتبہ کی سی رہ جائے گی۔ پھر میں گارنٹی نہیں دے سکوں گا کہ پولیس آپ سے کہاں، کس وقت اور کس طرح پوچھ گچھ کرے گی۔"

"فرمائیے نا!" ارشد نے ذرا نرم ہوتے ہوئے پوچھا۔ "آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟"

"کیا آفتاب کی زندگی میں اُس کی بیوی کے ساتھ آپ کے مراسم تھے؟"

"بالکل نہیں۔" ارشد نے جواب دیا۔ "اس لڑکی کو دیکھا ضرور تھا۔"

"اور وہ آپ کو اچھی بھی لگتی تھی۔"

"اس کی خوبصورتی سے تو میں انکار نہیں کرتا۔" ارشد نے کہا۔ "لیکن میری تو اس کے ساتھ کبھی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔"

"پھر آپ شادی کے لیے کیسے پہنچ گئے؟"

"اس کے چچا کاردار کے ساتھ میرا دوستانہ ہے۔" ارشد نے جواب دیا۔ "اُس نے مجھے کہا تھا کہ اس کا کاروبار تباہ ہو رہا ہے۔ وہ بھتیجی کی شادی کر کے فارغ ہو چکا تھا مگر اس کے خاوند کے قتل نے اسے پھر مشکلوں میں جکڑ لیا ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں اس کی بھتیجی کے ساتھ شادی کر لوں تاکہ وہ فارغ ہو جائے۔ سچی بات ہے یہ لڑکی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں راضی ہو گیا۔"

"پھر شادی کب ہو رہی ہے؟"

"عقیدہ نہ ہو۔" ارشد نے کہا۔ "لڑکی کا یہ وہم ہے کہ اس کا خاوند زندہ ہے۔"

"کیا آپ اس سے دست بردار ہو گئے ہیں؟"

"جی ہاں!"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"کیا یہ صحیح ہے کہ آپ اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے رہے ہیں؟" ڈی ایس۔ پی نے پوچھا۔ "اور اسے پکنک کی دعوتیں بھی دیتے رہے ہیں؟"

"جی ہاں!" ارشد نے کہا۔ "دراصل کاروار کے مجھے کہا تھا کہ نیلوفر کے ساتھ بے تکلفی پیدا کرو۔ وہ تمہارے ساتھ کھل جائے گی۔"

"کیا کاروار فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اپنی بھتیجی کی شادی آپ ہی کے ساتھ کریں گے؟"

"معلوم تو ایسے ہی ہوتا تھا۔"

"اس میں کوئی لین دین کا معاملہ بھی تھا؟" ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

ارشد کھل گیا۔

"آپ بے تکلفی سے بتا دیں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ نے میرا شک رفع کر دیا ہے۔"

"جی ہاں!" ارشد نے کہا۔ "لین دین کی بات ہوئی تھی۔ کاروار نے کہا تھا کہ اسے اسی ہزار روپے کی ضرورت ہے جو وہ کوڈ سے گا۔ تب مجھے شک ہوا کہ وہ اپنی بھتیجی کی قیمت لینا چاہتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ پچاس ہزار روپے دے دوں گا مگر لڑکی کے شادی سے انکار کر دیا۔ میں لڑکی کو زبردستی تو نہیں لا سکتا۔ میں نے اس کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔"

"آپ ہماری اس ملاقات کا ذکر کسی اور سے نہ کریں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "ورنہ آپ کو نقصان ہو گا اور آپ کچھ دن مری میں ہی رہیں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی چلا گیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی تھانے گیا تو اس نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ نیلوفر کی کوٹھی چلا جائے اور وہیں رہے اور کاروار کو اس کوٹھی کے اندر نہ جانے دے۔ اگر وہ ضد کرے تو اسے کہے کہ وہ تھانے سے اجازت لے۔ نیلوفر سے مل سکتا ہے۔

"کاروار کو خون کو کہ تھانے میں آ جائے۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے انسپکٹر حمید سے کہا۔ "کہنا میں نے بلایا ہے.... وہ دوڑا آئے گا۔"

اُدھر سے جواب ملا کہ تھوڑی دیر ہوئی کاروار اولڈ پنڈی چلا گیا ہے۔ کل واپس آئے گا۔

دوسرے دن کاروار نہ آیا۔ شام گہری ہوئی تو لاہور سے اے۔ ایس۔ آئی واپس آ گیا۔ وہ سر پا وجسٹ سے خون کی رپورٹ لے آیا تھا۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ پایا جائے اور رومال پر جو خون ہے یہ انسان کا خون نہیں، کسی جانور کا ہے۔

*

"یہ خون انسان کا نہیں، کسی جانور کا ہے۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے انسپکٹر شاہ اور انسپکٹر حمید اللہ خان سے کہا۔ "لاش نہیں ملی۔ انسپکٹر خالد کی ڈائری بتاتی ہے کہ آخر کوٹھی میں سے خریدی گئی تھی۔ نیلوفر لاپتہ ہے۔ انسپکٹر خالد لاپتہ ہے۔ کاروار کی پٹائی کرنے والا حوالات سے فرار ہو گیا ہے۔ قتل اور ڈاکہ زنی کا شک اسی پر کیا جا رہا ہے۔ اب انکشاف ہوتا ہے کہ مقتول نہیں ہے۔ اس کے کپڑوں پر خون انسانی نہیں۔ تو اس سے کیا ظاہر ہوا؟.... کہ آفتاب کو اغوا کیا گیا ہے۔ جائیداد، انشورنس وغیرہ کے کاغذات ڈبوں میں نہیں، میز کی دراز میں تھے۔ ڈاکہ زنی مال و دولت کے لیے کی جاتی ہے۔ ڈاکو انشورنس اور جائیداد کے کاغذات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کی دل چسپی ان اچھے کپڑوں کے ساتھ تھی جن کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ مال اسباب انہی میں ہے اور یہ کپڑے کمرے میں پڑے ہیں۔ اس واردات میں گھر بھیدی شریک ہے اور لڑکی کی چٹھی اسی نے نکلی رکھی تھی۔"

"اب نیلوفر نے جو انکشاف کیا ہے، اس سے کوئی اور ہی ڈرامہ سامنے آتا ہے۔" انسپکٹر شاہ نے کہا۔

"شاہ جی!" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ نے اس انکشاف کی مجھے جو تفصیل سنائی ہے میں اب اسی کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ یہ واردات اتفاقی معلوم نہیں ہوتی۔ آزاد کشمیر اور ضلعے کے کسی بھی تھانے میں کوئی جمیل نہیں جو جمیلا ڈاکو کے نام سے مشہور ہو یا پولیس کے ریکارڈ پر ہو۔ ہو سکتا ہے باہر سے آیا ہو۔"

"کاروار نے بتایا ہے کہ وہ کشمیری لب و لہجے میں اردو بولتا ہے۔" انسپکٹر حمید نے کہا۔

"کاروار کا یہ کہنا کہ نیلوفر کی بندوق سے نکلی ہوئی گولی ایک گڈریے کو لگے گی۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اور جمیل نے نیلوفر اور اس کے خاوند کو دھمکی دی کہ ان کی لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔ اگر وہ انتقام کی خاطر واردات کرتا تو آفتاب کو قتل کر جاتا اور نیلوفر جیسی جوان اور خوبصورت لڑکی کو ڈنڈے کے ایک وار سے بیہوش کر کے نہ پھینک جاتا۔ اس کی عصمت پر ضرور حملہ کرتا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایسی کومل لڑکی کو وہ خراب کیے بغیر چھوڑ دیں گئے؟.... خون کی رپورٹ بتاتی ہے کہ آفتاب کے کپڑوں پر کسی جانور کا خون لگایا گیا ہے۔ کپڑے راستے میں بکھیر دیے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس اور لواحقین کو یہ تاثر دیا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گیا ہے کہ آفاب قتل ہو گیا ہے۔ نہیں.... اسے اغوا کیا گیا ہے۔ کاغذات کی چوری کو اس خون کے ساتھ رکھ کر سوچیں جو کسی انسان کا نہیں جمیل اگر کوئی باہم پیشہ ہی ہے تو اسے ان کاغذات کے ساتھ کیا دل چسپی تھی.... وہ خاصا مال لے گیا۔ پھر اُسے مدد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟.... آپ دونوں بتجربہ کار پولیس آفیسر ہیں۔ عادی مجرموں کے طور طریقوں، عادتوں اور نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر جمیل نے کاروار کو رہزنی کے ارادے سے شہر سے دور ویرانے میں روکا تھا اور اگر کاروار کار میں بھاگ اُٹھا تھا تو جمیل نے گھڑی پر اس کا تعاقب کیوں کیا تھا؟ کیا وہ اتنا زیادہ دلیر ہے؟.... اگر وہ اتنا ہی دلیر ہے تو میں اسے دماغی مریض سمجھتا ہوں۔"

"وہ حوالات سے فرار ہوا ہے"۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "اس کی دلیری میں تو کوئی شک نہیں۔"

"شاہ جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "کیا آپ نے بزدل مزدوروں کو بھی فرار ہوتے نہیں دیکھا؟ ایسا موقع جس مزدور کو مل جاتے کہ حوالات کا دروازہ کھلا ہوا ہو، رات ہو، دمری جیسی جگہ ہو جہاں قدرت نے غائب ہونے کے انتظامات کر رکھے ہوں، وہ مزدور کیوں نہیں بھاگے گا؟.... میں کہہ رہا تھا کہ جمیل نے کاروار کی کار کا تعاقب گھڑی پر کیا اور اسے پکڑ کا ارادہ اور کھائی میں پھینک دیا۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ اُسے بے ہوش کر کے اس کی جیبیں کیوں نہ خالی کر لیں؟.... یہ بھی ممکن ہو کہ کاروار کے ساتھ اس کی گھونہ بازی ہوئی تھی۔ اگر جمیل پیشہ ور مجرم ہوتا تو اس کے پاس اگر ریوالور نہیں تو چاقو ضرور ہوتا۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے کاغذات کا ایک بلند میز سے گھسیٹ کر اپنے آگے کیا، ورق اُلٹے اور ایک کاغذ کا مطالعہ کر کے ایک فقرے پر انگلی رکھی۔

"آپ دونوں کے دماغ ٹھکانے نہیں یا آپ گہرائی میں جانے اور سوچنے سے پرہیز کر رہے ہیں"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اپنے ساتھ میری بھی بے عزتی کرا رہے ہو۔ یہ بیان ان دو لڑکوں کا ہے جو کاروار اور جمیل کی لڑائی کے عینی شاہد ہیں۔ خالد نے دونوں کے بیان لکھے ہیں۔ دونوں نے کہا ہے کہ ملزم جب کاروار اسے کو کھا گئی میں گرا رہا تھا تو عدم سے ملزم آیا تھا اُدھر سے ایک دیہاتی لڑکی دوڑی آ رہی تھی.... دوسرے لڑکے نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ اپنے سکوٹر پر بھاگنے لگے تو وہ سکوٹر کے پیچھے بیٹھا تھا۔ سکوٹر جب قواس نے مڑ کر دیکھا تو وقت وہ پیچھے دیکھا، لڑکی ملزم کے پاس کھڑی تھی.... آپ دونوں نے سوچا کہ یہ لڑکی کون تھی؟.... دیہاتی تھی، شہری نہیں تھی، لہٰذا یہ نیلوفر نہیں تھی۔"

"یہ ساجی ہو سکتی ہے"۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "جیلا اسی سے ملنے آتا ہے۔ ٹھہر ابھی اسی کے گھر ہے۔"

"اس لڑکی کو بلاؤ"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اور یہ دونوں لڑکے کہاں ہیں؟"

دونوں انسپکٹروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے دونوں لڑکوں کے بیانات کے نیچے ان کے پتے دیکھے۔ ٹیلیفون ڈائریکٹری غصے سے انسپکٹروں کے آگے پھینک کر ایک ہوٹل کا نام لیا۔

"اگر اس میں فون نمبر ہے تو پوچھو کہ اس نام کے لڑکے ہوٹل میں رہتے ہیں؟"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اگر نہیں ہیں تو رجسٹر دیکھ کر بتاؤ کہ انہوں نے اپنا ایڈریس کیا لکھا تھا؟ معلوم ہوتا ہے تم دونوں یہاں حرام کاری کے لیے بیٹھے ہوئے ہو کیونکہ میں دو خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ تم نے یہاں ایش ٹرے بنا لی ہوئی ہے۔"

"نہیں حضور!"۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "میں رات طوفانی بارش میں آفتاب کی کوٹھی میں گیا تھا۔"

"وہاں جانے کا یہی وقت موزوں تھا"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اور اس کیس میں کار دار جیسا امیر آدمی بھی ہے جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ بڑا آدمی ہے اس لیے تم دونوں اس کے منہ سے اپنے مطلب کی کوئی بات نہیں نکلوا سکتے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے تم دونوں کا منہ بند کر رکھا ہے۔"

دونوں انسپکٹر بیک وقت بول اُٹھے۔

"پولیس کی بدنامی کا باعث تم جیسے پولیس افسر بنتے ہیں"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "تمہاری کی سوئی فائلیں گواہیں کہ چائے پانی کی برکت سے وارداتیں عدم پتہ قرار دے دی جاتی ہیں۔"

"لیکن حضور!"۔ انسپکٹر حمید نے کہا۔ "کاروار ملزم یا مشتبہ تو نہیں۔ وہ تو ہمارے لیے مصیبت بنا رہتا ہے۔ آپ تم پر اس طرح تو شک نہ کریں۔"

"انسپکٹر خالد لاپتہ ہے"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "میمن دو کا نذر لاپتہ ہے۔ آفتاب لاپتہ ہے۔ تمہارا جیلا ڈکو لاپتہ ہے جس نے انگوٹھی سے جمیل پر قتل اور ڈاکے کا شک کیا تھا، وہ انگوٹھی لاپتہ ہے۔ بہتر ہے کہ تم دونوں بھی لاپتہ ہو جاؤ.... تم کہتے ہو کاروار ملزم اور مشتبہ نہیں ہیں اسے مشتبہ کی حیثیت سے شامل تفتیش کر رہا ہوں۔"

ڈائریکٹری سے اس ہوٹل کا نمبر مل گیا۔ انسپکٹر شاہ نے نمبر ملا کر دونوں لڑکوں کے متعلق پوچھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اُسے جواب ملا کہ لڑکے جا چکے ہیں اور رجسٹر پر صرف ڈھنڈی روڈ والا پیسنڈی لکھا ہوا ہے۔ انہیں واپس گئے بہت دن ہو گئے تھے۔

"تمہیں یہاں آ کے بے تمام گواہوں کو پابند کر لینا چاہیے تھا"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اب ساجی اور بلاؤ۔ میرا خیال ہے وہ دیہاتی لڑکی یہی ہو گی جسے ان لڑکوں نے جمیل تک دوڑتے آتے دیکھا ہو گا۔ میں اسی کی بانی ملوالوں گا.... میں آپ دونوں کو یہ بتا رہا تھا کہ مجھے شک ہے کہ کاروار کسی نہ کسی حد تک اس وارادت میں ملوث ہے۔"

دونوں انسپکٹر چونک پڑے۔

"ارشد کے بیان نے مجھے شک میں ڈال دیا ہے"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔

"اور جمیلے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"۔ انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔

"میں تفتیش کو نئے راستے پر ڈالنا چاہتا ہوں"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "ساجی کو فوراً بلاؤ۔"

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گذشتہ رات جب انسپکٹر شاہ نیلوفر کی کوٹھی سے نکلا تھا تو نیلوفر کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اُس نے کار دار کا یہ حکم بڑی دلیری سے رد کر دیا تھا کہ وہ ارشد کے ساتھ شادی کر لے لیکن اُس کے دل پر کار دار کا خوف طاری ہو گیا تھا۔ اس خوف کا ہی اثر تھا کہ وہ پولیس کو کار دار کے متعلق کچھ بتانے سے ڈرتی تھی۔ رات انسپکٹر شاہ نے اُس سے کچھ باتیں کھلوالیں۔ اُس نے انسپکٹر شاہ کو یہ بھی بتا دیا کہ کار دار شاید اس کا چچا نہیں کیونکہ اس نے اُسے پانچ چھ سال کی عمر میں اغوا کیا تھا اور وہ پہاڑی خانہ بدوشوں کی بیٹی ہے.... انسپکٹر شاہ نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ کار دار کو پتہ نہیں چلنے دے گا اور اس کے پولیس کو اس کے متعلق کچھ بتایا ہے۔ پھر بھی نیلوفر ڈری ہوئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی کوٹھی میں کار دار کا داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔

وہ سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ تنہائی میں اُسے اور زیادہ ڈر آنے لگا۔ کوٹھی کے برآمدے میں دو کانسٹیبل موجود تھے۔ اسے ڈرنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ کانسٹیبل کار دار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کوٹھی کا ماحول ہی دہشت زدہ تھا۔ ان کمروں میں قاتل اور ڈاکو پھر گئے اور اپنا آسیب پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ نیلوفر نے چونک کر اُدھر دیکھا جیسے اسے بھی ڈاکو اُٹھا لے جانے کو آئے ہوں۔ دروازے میں جمیل کی ماں کھڑی تھی۔

"ابھی جاگ رہی ہے بیٹی؟"

جمیل کی ماں کے ان الفاظ میں خلوص اور پیار تھا اس نے رکھے ہوئے چشمے کا منہ کھول دیا۔ نیلوفر کی آنکھوں کے شفاف چشمے پھوٹ پڑے۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ آنسوؤں کے دھندلکے میں اسے ماں کا خان کی یہ پسماندہ پہاڑن اپنی ظفر پڑھتی نظر آئی۔ اس عورت نے تسبیح اور تسبیح والا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا۔ کچھ مسنون مدوں پڑھا اور نیلوفر کے سر سے پاؤں تک پھونک ماری۔ نیلوفر کو اُس وقت جنابی سارے کی ہی حضرت تھی۔

اُسے ہاتھ کے الفاظ یاد آنے لگے جو اُجو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہے تھے۔ "اپنا سر خدا کے نیچے جھکا لے۔ خدا بے نیاز ہے۔ تیرے ساتھ خدا کو کوئی دشمنی نہیں۔ تو خدا سے دشمنی نہ رکھ۔"

"اماں!" نیلوفر نے کہا۔ "میرے اس گھر میں تمہیں خدا بھی نظر آیا ہے؟"

"ہاں بیٹی!" جمیل کی ماں نے جواب دیا۔ "یہاں تو خدا مجھے زیادہ نظر آتا ہے۔"

ماں کہنے لگی تھی، تو ہم فاقہ کش خانہ بدوشوں کی بیٹی شہزادی بن گئی۔ اتنی مدت بعد ماں کو بچھڑی ہوئی بیٹی مل گئی۔ ماں اپنی بیٹی کی نوکرانی بن گئی اور ماں کا دل ایسا پتھر بنا کہ بیٹی کو یہ بھی نہیں بتا رہی کہ میں تیری ماں ہوں یہ سب خدا کے کرشمے ہیں اور یہ خدا کا ہی کرشمہ ہے کہ بیٹی نے اپنی نوکرانی کو ماں کا درجہ دے رکھا ہے۔

"کس سوچ میں کھو گئی ہو اماں!" نیلوفر نے ہتھیلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "آج تو میرا دل بہت ہی اداس ہو گیا ہے، حالانکہ آج مجھے خانہ بدوش تھوڑا سا سہارا دے گیا ہے۔"

"کیسا سہارا بیٹی؟" جمیل کی ماں نے پوچھا۔ "تمہارا مرکیا بتا گیا ہے؟"

"وہ جو آفتاب صاحب کے پڑوسی بیٹھے تھے نا!... میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان پر خون لگا ہوا تھا اسے متعلق تھانیدار کو شک تھا کہ شک ہے میں تھانے لے جا کر پوچھوں گی... اماں! خدا یہ معجزہ دکھا سکتا ہے کہ آفتاب صاحب جیتے جاگتے، زندہ و سلامت میرے پاس آجائیں؟"

یہ پہاڑن عالم فاضل نہیں تھی۔ مذہب کی شیدائی تھی لیکن مذہب کے نظنے سے بالکل ہی ناآشنا۔ وہ کچھ دیر نیلوفر کو دیکھتی رہی۔

"بیٹی!" ... اس نے آہ بھر کر کہا۔ "میں بہت دکھی عورت ہوں۔ کبھی اچھا کھانا نصیب نہیں ہوا۔ جنگل کے جانوروں کی طرح زندگی گزری۔ بیٹے کے ہجر کی ماری ہوئی ماں ہوں۔ میرے دل میں بڑے گہرے زخم ہیں، لیکن ایسا لفظ کبھی منہ سے نہیں نکلا کہ خدا کو محدود سے ماورا ہے۔ خدا معجزے کیوں نہیں دکھا سکتا۔ میں نے خدا کے معجزے دیکھے ہیں۔ دکھ خدا دیتا ہے اور جب بندہ یہ بھی اس کی دین سمجھ کر شکر ادا کرے تو خدا کے آگے ہی سر جھکا سے رکھنا ہے تو خدا خوش ہوتا ہے، پھر معجزہ ہوتا ہے۔ تم کے بھی بھٹکی ہوئی، ہجر کی ماری ہوئی ماں کو سر چھپانے کو جگہ اور عزت کی روٹی دی ہے تو بیٹی! تمہاری یہ نیکی ضائع نہیں ہوگی۔"

"میں ڈر رہی ہوں اماں!" ... نیلوفر نے کہا۔ "میں نے آج تھانیدار کو وہ باتیں بتا دی ہیں جو میں نے اپنے چاچے کو ڈر سے چھپا رکھی تھیں۔ اُفی بہت کچھ بتا ناجانی ہے۔ سوچتی ہوں تو اتل یا نہ بتاؤں۔"

"میں جنگلوں میں جنی پلی ہوں بیٹی!" ... جمیل کی ماں نے کہا۔ "ہم کسی اور طرح سوچا کرتے ہیں جس دُنیا میں تم رہتی ہو یہ بادشاہوں، رانیوں اور شہزادیوں کی دنیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری دنیا کی دشمنیاں اور دوستیاں کیسی ہوتی ہیں۔ میں یہ سنز دکھوں کی کوچ کا چھپا دست۔ کہہ دو۔ بتا دو اور اللہ پر چھوڑ دو... اگر یہ نہیں آ رہی اور دل بہت اداس ہے تو اٹھو۔ وضو کرو اور نفل پڑھنے شروع کر دو۔ میں تسبیح پڑھتی ہوں، وہیں بیٹھی پڑھتی رہوں گی۔"

تھوڑی دیر بعد نیلوفر مصلے پر کھڑی تھی اور جمیل کی ماں اس کے قریب بیٹھی تسبیح پر کوئی ورد کر رہی تھی۔ آدھی رات ہونے لو آئی تھی جب نیلوفر مصلے سے اُٹھی اور نڈھال ہو کر پلنگ پر جا گری۔ جوانی کی نیند نے اس کے دکھ درد کو گہری نیند سُلا دیا۔ جمیل کی ماں نے اس پر ریشم جیسا کمبل ڈالا تو بھی نیلوفر کی آنکھ نہ کھلی۔ اس کی پیشانی کو چھوا تو بھی نیلوفر غشی کی نیند سو رہی تھی۔ ماں اسے بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ جب نیلوفر کا چہرہ آنسوؤں میں چھپ گیا تو ان آنسوؤں میں ماں کو ایک گھٹ دکھاوی دی جس میں اُس نے اس بچی کو اپنے بیٹے جمیل کے ساتھ ملایا اور دونوں کے گرد ایک کمبل لپیٹ کر کہا تھا۔ "ڈرنا نہیں۔ ہم کلیاں لے کے آتے ہیں پھر آگ ملا تیں گے۔"

آگ ایسی جلی کہ ماں کا سینہ آج بھی جل رہا تھا۔ اب تو وہ شعلے زیادہ بے رحم اور ظالم ہو گئے تھے۔ وہ آج بھی اپنی بچی سے کہہ رہی تھی۔ "ڈرنا نہیں۔ خدا کو یاد کرو۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

صبح نیلوفر کی آنکھ کھلی تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا تھا۔ اسے گزری ہوئی رات یاد آنے لگی۔ رات کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ صبح ابھی دھندلی تھی۔ اس نے وضو کیا اور جیل کی ماں نے اسے جس طرح نماز پڑھنی سکھائی تھی، اس طرح پڑھنے لگی۔ اس کے بعد اس کا ذہن صاف ہو گیا اور وہ سوچنے لگی کہ پولیس کو باقی باتیں بھی بتا دے یا نہیں۔

اُس روز ملنے والوں کی قطار لگی رہی۔ اسے تھانے جانے کی مہلت ہی نہ ملی۔

ڈی۔ ایس۔ پی کے حکم پر جب ساجی کو بلانے کے لیے کانسٹیبل تھانے سے نکلا۔ اُس وقت نیلوفر تھانے میں داخل ہوئی۔ وہ ایس۔ ایچ۔ او کے دفتر میں چلی گئی جہاں ڈی۔ ایس۔ پی بیٹھا تھا۔ ایکسٹرا شاہ ڈی۔ ایس۔ پی کو بتا چکا تھا کہ نیلوفر نے کیا نئے انکشاف کیے ہیں۔

"مجھے آپ کے ماں آنا ہی تھا۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے نیلوفر کو بٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے کرم کیا کہ جلدی آ گئیں۔"

اُس نے دونوں انسپکٹروں کی طرف باری باری دیکھا۔ دونوں اشارہ سمجھ گئے اور کمرے سے نکل گئے۔

نیلوفر ڈی۔ ایس۔ پی کا بھی طرح جانتی تھی۔

"مسٹر کاردار تو نہیں آئے؟"

"کسی نے بتایا تھا کہ راولپنڈی گئے ہیں۔" ــــ نیلوفر نے جواب دیا۔

"آپ کو پتا کر نہیں گئے؟"

"مجھے وہ ایسی اہمیت نہیں دیا کرتے۔" ــــ نیلوفر نے جواب دیا۔ "واپس آؤں گی میرے گھر آئیں گے تو بھی نہیں بتائیں گے کہ کہاں چلے گئے تھے۔"

"وہ اب آپ کے گھر نہیں آئیں گے۔" ــــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔

"کیوں؟" ــــ نیلوفر یوں بدکی گویا جیسے کوئی بری خبر سننے والی ہو۔

"میں نے آپ کے گھر میں اُن کا داخلہ بند کر دیا ہے۔" ــــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اگر آپ کو ان کی طرف سے کوئی پریشانی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔"

"آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟" ــــ نیلوفر نے ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ رک رک کر بولی۔ "میں بتا نہیں سکتی کہ وہ میرے ساتھ کیسا برا سلوک کریں گے.... میں.... میں بالکل تنہا ہوں۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔" ــــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "خدا آپ کے ساتھ ہے۔ خدا کی ذات سے مایوس نہ ہوں۔"

"حقیقت یہ ہے خانصاحب!" ــــ نیلوفر نے دبی آواز لہجے میں کہا۔ "میں خدا اور مایوسی کے درمیان بھٹک رہی ہوں۔ کبھی تو خدا کے آگے سر جھکا دیتی ہوں اور کبھی خیال آتا ہے کہ خدا محض ایک خیال ہے۔ پھر سوچتی ہوں.... سوچتی ہوں....!" اس کے آنسو چھوٹ آئے۔ زندگی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن میں رحم اور شفقت کا رنگ تھا۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ نیلوفر کی سوسائٹی دولت، عیش، تعیش، نمود و نمائش، کاروکھی اور جدید سہولتوں کو ہی دین اور اسی کو دنیا سمجھتی ہے اور دنیا کی آسائش اور عیش و عشرت کے یہ پرستار سمجھتے نہیں کہ وہ فنا کے دھکارے ہوئے لوگ ہیں۔ ان پر جب کوئی آفت آ پڑتی ہے تو یہ اپنی عورتوں کی عزت تک کو قربان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ انہیں مذہب سے انحراف کی سزا مل رہی ہے۔

"میں آپ سے دو باتیں کہوں گا۔" ــــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "ایک یہ کہ مذہب سے اتنی بیزار نہ ہوں جتنی میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنی سوچیں میرے حوالے کر دیں۔ مجھے پولیس آفیسر کی بجائے اپنا غمخوار سمجھیں۔ آپ کے دل میں جو کچھ ہے مجھے بتا دیں۔ ایکسٹرا شاہ کو آپ نے جو باتیں بتائی تھیں وہ اُس نے مجھے بتا دی ہیں۔ میں نے کاردار کا آپ کے گھر میں داخلہ جو بند کیا ہے یہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ کو گزند پہنچا سکتا ہے۔ میں آپ کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کر رہا ہوں.... مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے میرے انسپکٹروں سے یہ جو کہا ہے کہ قتل اور ڈاکے کا مجرم وہ معلوم نہیں ہوتا جس کے پیچھے پولیس پڑی ہوئی ہے، یہ آپ کس بنا پر کہتی ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ یعنی جمیل جسے جیلا ٹا کہتے ہیں، حوالات سے بھاگا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پکا مجرم ہے۔ آپ کے دل میں جو کچھ بھی ہے مجھے بتائیں۔ ایک خوشخبری میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔ مسز آفتاب کے جو کپڑے جنگل میں پڑے ملے تھے، ان پر خون کسی انسان کا نہیں، کسی جانور کا ہے۔"

نیلوفر کا رد عمل ایسا تھا جیسے اُسے غشی آ جائے گی۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ کرسی سے آہستہ آہستہ اٹھی۔ اس کے ہونٹ وا ہو کھلے تھے، آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور ڈی۔ ایس۔ پی کے چہرے پر جم کے رہ گئی تھیں۔ اچانک اس نے لپک کر میز پر رکھا ہوا ڈی۔ ایس۔ پی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بھیگ کر بولی۔ "سچ خانصاحب!.... آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔"

نیلوفر نے ڈی۔ ایس۔ پی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور رپورٹ کرو رونے لگی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اسے کچھ سمجھایا، کہا۔ نیلوفر اس کا ہاتھ چھوڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور کچھ دیر روتی ہی رہی۔

"تو کیا اس سے میری یہ اُمید پختہ ہو سکتی ہے کہ آفتاب زندہ ہیں؟" ــــ نیلوفر نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر پوچھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس صاف مطلب یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "کہاں ہیں؟..... یہ پیر زادہ آپ کا منتو ہے۔ میں آپ سے پوچھ رہا تھا کہ آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ جمیل قتل اور ڈاکے کا مجرم نہیں ہو سکتا؟"

نیلوفر گہری سوچ میں کھو گئی۔ "ڈی۔ ایس۔ پی کو بتا دوں کہ وہ جمیل سے مل چکی ہے اور جمیل کے سوک لے اسے بتایا ہے کہ ایسا آدمی قتل اور ڈاکے کا مجرم ہو ہی نہیں سکتا؟"

"میں خود کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہی۔" نیلوفر نے کہا۔ "میرے پاس فلاں فلاں افسوس کے لیے لوگ آتے رہتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں اور وہ کچھ کچھ بتا جاتے ہیں۔ میں اُس دیہاتی لڑکی سے مل چکی ہوں جس کے متعلق پتہ چلا ہے کہ جمیل اُس کے پاس جاتا ہے۔ اس کا نام شاید ساجی ہے؟..... اس نے مجھے بتایا تھا کہ جس روز جمیل نے انکل کار دار پر حملہ کیا اور اُسی کھاتی میں چھپنے کا تھا، اس سے تین چار دن، ہی پہلے انکل کار دار نے ساجی سے کہا تھا کہ وہ ان کی کوٹھی میں بھی دودھ دے جایا کرے۔ ساجی شہر میں دودھ اور مانڈھ بیچنے آیا کرتی تھی.....

"اس لڑکی نے مجھے بتایا ہے کہ انکل کار دار نے پہلے دن، سے ہی اس کے ساتھ بدتمیزی کے مظاہرے شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز لڑکی، دودھ لے کر آئی تو انکل کار دار نے اس کی دودھ والی گاگر اپنے کمرے میں رکھ لی اور لڑکی کو اپنی مسہری ٹرکار میں بٹھا کر اُس طرف لے گئے جدھر جمیل نے ان پر حملہ کیا تھا۔ شہر سے تھوڑی دور جا کر کار سڑک سے ہٹا کر وہ پہاڑوں کے درمیان لے گئے۔ جنگل میں لے جا کر کار روکی اور ساجی پر ست لڑکی کی۔ لڑکی بتاتی ہے کہ اس نے انکل کار دار کا خوب مقابلہ کیا۔ اتفاق سے جمیل اپنی گھومتی کی ٹہلائی کے لیے اِدھر آنکلا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو ساجی کی مدد کو پہنچا.....

"انکل کار دار اسے دیکھ کر کار میں سوار ہوئے اور بھاگنے لگے جمیل نے گھوڑی پر ان کا تعاقب کیا اور راستے میں انہیں جالیا۔ دونوں گھونسوں سے لڑے۔ ساجی ان کے پیچھے دوڑی آ رہی تھی۔ اس نے یہ دیکھا کہ دونوں لڑتے لڑتے سڑک کے جنگلے کے قریب چلے گئے تھے جسکے دوسری طرف کھائی کی دیوار کی طرح ڈھلان تھی جو بہت دور نیچے نمک چلی گئی تھی۔ انکل کار دار گرے اور ڈھلان سے لڑھک گئے۔ جمیل اور ساجی اپنے گھر کو چل پڑے گئے۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ ایک دو روز بعد پولیس ان کے گاؤں گئی۔ جمیل کا نشہ انکل کار دار کے گھونسوں سے سوجا ہوا تھا۔ انسپکٹر خالد کو اس نے اتنا ہی بتایا کہ ایک آدمی سے اس کی لڑائی ہو گئی تھی۔ وہ جمیل کو تھانے لے آتے.....

"میں نے جمیل کو تھانے میں دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ میں نے انسپکٹر خالد کو بتایا کہ یہی ہے وہ آدمی جس نے لڑکے کی گیرہ بندوق کے چھرے لگنے کے بعد مجھے اور آفتاب کو دھمکی دی تھی کہ تمہاری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔ میں نے اس کی انگلی میں اپنی انگوٹھی پہچان لی۔ اُسی رات جمیل حوالات سے نکل گیا۔ ساجی نے مجھے بتایا کہ انگوٹھی اس نے بازار سے خرید کر جمیل کو پہنائی تھی۔ پھر پتہ چلا کہ جس دوکاندار سے انگوٹھی

خریدی گئی تھی وہ غائب ہو گیا ہے، اور یہ بھی پتہ چلا کہ انسپکٹر خالد بھی لاپتہ ہو گئے ہیں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے لیے۔ یہ انکشاف بالکل نیا تھا کہ کار دار نے ساجی پر دست درازی کی تھی۔ انسپکٹر خالد کی تحریر کردہ ایف۔ آئی۔ آر اُس کاردار کے بیان میں تحریر تھا کہ جمیل نے کاردار کو رہزنی کے ارادے سے روکا اور اسے مار پیٹ کر کھائی میں پھینک دیا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ جمیل نے گھوڑی پر کاردار کا تعاقب کیا تھا۔

"آپ نے انسپکٹر خالد کو یہ واقعہ بتایا تھا؟" ڈی ایس۔ پی نے پوچھا۔

"نہیں۔" نیلوفر نے جواب دیا۔ "اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یوں بھی ہوا ہے۔"

"صبحی آئی۔ اسے کے ان دونوں انسپکٹروں میں سے کسی کو بتایا ہے؟"

"نہیں۔" نیلوفر نے جواب دیا۔ "یہ تو مجھے اب معلوم ہوا ہے۔"

اُس نے جھوٹ بولا تھا۔ اگر وہ سچ بولتی تو اسے یہ بھی بتانا پڑتا کہ یہ واقعہ اسے جمیل نے سُنایا تھا جب وہ اتفاق سے اس کی پناہ گاہ تک جا پہنچی تھی۔ ساجی نے تو اسے ایک دو روز پہلے یہ واقعہ سنایا تھا۔

"انسپکٹر شاہ پرسوں رات آپ کے ہاں گیا تھا۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔ "آپ نے اسے کیوں نہیں بتایا؟"

"انکل کار دار کے ڈر سے۔" نیلوفر نے جواب دیا۔

"مسز آفتاب!" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ کو ساجی نے جو کچھ سنایا ہے، اگر اسے سچ مان لیا جائے تو ثبوت کے بغیر قانون اسے سچ نہیں مان سکتا۔ میرا خیال ہے اس لڑکی نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔"

"میں اسے اس لیے سچ مانتی ہوں کہ انکل کار دار جب ہسپتال میں تھے تو میں ان کی کوٹھی میں گئی تھی۔"

نیلوفر نے بتایا۔ "یہ اس واقعہ کے اگلے روز کا ذکر ہے۔ میں نے ان کے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے کے قریب دودھ کی گاگر پڑی دیکھی تھی۔ اس میں بہت سا دودھ تھا۔ صوفے پر ایک ٹوکری پڑی تھی جس میں دس بارہ مڈے تھے۔ میں نے خانساماں، اور نوکر کو بلا کر پوچھا کہ گاگر اور ٹوکری کس کی ہے۔ نوکر نے مجھے بتایا کہ چند دنوں سے ایک پٹھان لڑکی دودھ دینے آتی تھی۔ کل آئی تو نوکر نے دیکھا کہ انکل کار دار اسے کار میں بٹھا کر باہر لے جا رہے تھے۔ صاحب رات کو واپس نہ آ سکے۔ لڑکی بھی نہ آئی۔ دوسری صبح پتہ چلا کہ صاحب زخمی ہو گئے ہیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں.....

"میں نے نوکر اور خانساماں سے وہ باتیں پوچھیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے گاگر اور ٹوکری یہیں کیوں پڑی رہنے دیں اور دوسری یہ کہ دودھ لینا نوکر کا کام تھا۔ دودھ دینے والی ڈرائنگ روم میں کیسے آئی؟..... انہوں نے بتایا نہیں پتہ چل گیا تھا کہ صاحب پر کسی رہزن نے حملہ کیا ہے۔ ہم نے اس خیال سے یہ دونوں چیزیں سمیٹ دی ہیں کہ پولیس آئے گی تو وہ ثبوت کے طور پر یہ دونوں چیزیں دکھا کر بتائیں گے کہ صاحب کو دودھ اور

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

انڈے دینے والی لڑکی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔۔۔

"میری دوسری بات کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ کوٹھی کا دودھ ایک اور جگہ سے آتا تھا۔ انکل کاردار نے اس لڑکی سے اس طرح دودھ لینا شروع کر دیا تھا کہ وہ آتی تو انکل کاردار اُس کی انتظار میں ہوتے۔ اسے ڈرائنگ رُوم میں لے جاتے۔ وہ چلی جاتی تو نوکر یا خانساماں کو بلا کر دودھ سے بھرا جگ اسے دے دیتے۔۔۔۔ میں نے دونوں چیزیں وہاں سے اٹھوا دی تھیں۔ اس کے بعد بھی انکل کی کوٹھی میں جاتی رہی۔ نوکر اور خانساماں سے پوچھا کہ دودھ انڈوں والی اپنی گاہک اور ٹوری لینے آتی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ وہ نہیں آتی۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے انسپکٹر شاہ کو بلا کر کہا کہ کاردار کے دونوں نوکروں کو بلوا لو۔

"آپ کا کاردار نے یہ کیوں کہا کہ انہوں نے آپ کو پانچ سال کی عمر میں اغوا کیا تھا؟۔۔۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔۔۔ "آپ نے انسپکٹر شاہ کو جو باتیں بتائی ہیں وہ اُس نے مجھے بتا دی ہیں۔۔۔ میں آپ کو ایک بار پھر یقین دلا دوں کہ آپ کو کاردار سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ میں نے ان سے آپ کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔"

"وہ مجھے کر رہے تھے کہ میں ارشد کے ساتھ شادی کروں"۔۔۔ نیلوفر نے جواب دیا۔۔۔ "میں انہیں کہہ رہی تھی کہ آفتاب کے متعلق ابھی یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ زندہ ہیں یا واقعی قتل ہو گئے ہیں۔ مگر انکل مجھے یقین دلا رہے تھے کہ قتل ہو چکا ہے۔ اس سلسلے پر میری اُن کے ساتھ تُو تُو میں میں ہو گئی۔ انہوں نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ کی کوٹھی میں دودھ کی گاہک کیوں پڑی تھی؟ اور آپ نوکروں کو بتائے بغیر ایک جوان اور خوبصورت لڑکی سے ڈرائنگ روم میں کیوں دودھ لیتے تھے؟"

یہ سنا تھے سنا تھے نیلوفر پھر بات گول کر گئی۔ اُس نے کاردار سے یہ بھی کہا تھا کہ جمیل قتل اور ڈاکے کا مجرم نہیں، بلکہ اُس نے ایک دیہاتی لڑکی کی عصمت کی خاطر کاردار کو مار دیا تھا۔ یہ واقعہ اسے جمیس نے چکایا تھا۔

"تب انہوں نے مجھے کہا کہ میں غائبہ دشمنوں کی بیٹی ہوں اور انہوں نے مجھے اغوا کرایا تھا"۔۔۔ نیلوفر نے کہا اور کاردار نے اسے جو دھمکیاں دی تھیں وہ بھی سنا دیں۔

"آپ کو کاردار نے پالا پوس کس طرح سے؟"

"ایک دایا نے مجھے پالا ہے"۔۔۔ نیلوفر نے جواب دیا۔۔۔ "میں زیادہ تر راولپنڈی رہی ہوں۔ تعلیم وہیں پائی ہے۔ مجھے انکل کاردار بچپن سے اپنی بھتیجی کہا کرتے ہیں۔"

"عجیب بات ہے کہ آپ کو پانچ چھ سال کی عمر کی کوئی بات یاد نہیں"۔۔۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔

"اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انکل کاردار نے مجھے شہزادیوں کی طرح پالا پوسا ہے"۔۔۔ نیلوفر نے جواب دیا۔۔۔ "اپنے ماضی میں جہاں تک میری یادیں ساتھ دیتی ہیں میں اپنے آپ کو امیروں کی بیٹی سمجھ رہی ہوں۔ مجھے انگریزی سکول میں پڑھایا گیا۔ میرے گھر میں انکل کاردار سے ملنے بڑی خوبصورت اور بڑی

نازک خیال عورتیں آیا کرتی تھیں۔ ان میں سے بعض مجھ سے پیار کرتی تھیں۔"

نیلوفر کی نشیلی اور اداس آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ رافتہ پر کسی چیز کو دیکھ رہی ہو۔ اس کی آواز جذبات کی محو ہوتی چلی گئی۔ ہونٹوں پر تبسم سا آگیا مگر اس تبسم پر اداسی کے سائے رینگ رہے تھے۔ وہ مشغول سی تھی کہ وہ تھانے میں بیٹھی ہے اور ڈی۔ ایس۔ پی اس کا بیان لے رہا ہے۔

"ہاں۔۔۔ ذرا ٹھہرتے"۔۔۔ نیلوفر نے یوں کہا جیسے اسے کچھ اور یاد آگیا ہو۔۔۔ "میں غالباً گیارہ بارہ سال کی تھی۔ ایک عورت بڑے اچھے کپڑوں میں ملبوس انکل کاردار سے ملنے آتی۔ انہوں نے مجھے بلایا اس عورت نے میرے ساتھ پیار کیا اور مجھے اوپر نیچے سے دیکھ کر کہا، جاؤ کھیلو۔ میں پیٹھ پھیر کر چلی تو مجھے اس عورت کی آواز سنائی دی۔۔۔ "بولو کیا لیتے ہو"۔۔۔ اور انکل کاردار نے ہنس کر کہا۔۔۔ "اس سے میں انہوں کے تختے اُلٹوں گا۔۔۔ کیوں، کیا خیال ہے۔۔۔"

"معلوم نہیں مجھے یہ عورت اور اس کی یہ بات کیوں یاد آگئی ہے۔ ایسی تین چار عورتیں اور دو تین آدمی یاد آتے ہیں۔ یہ سب باری باری ہماری کوٹھی میں آتے رہتے تھے۔ میرے ساتھ بہت پیار کرتے تھے اور سب اس عورت کی طرح ایسی باتیں کرتے تھے جیسے انکل کاردار سے میرا رشتہ مانگ رہے ہوں۔"

"مسٹر کاردار نے شادی نہیں کی؟"۔۔۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"نہیں"۔۔۔ نیلوفر نے جواب دیا۔ ذرا سوچ کر شروع سے لہجے میں بولی۔۔۔ "یہ بھی مجھے یاد آگیا ہے۔ اُس وقت پندرہ سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ دو تین عورتیں انکل کاردار کے پاس بیٹھی تھیں۔ ایک عورت نے انہیں کہا۔۔۔ "کاردار! شادی بھی کر لو۔ شادی بڑا اچھا پردہ ہوتا ہے"۔۔۔ انکل کاردار نے جس کو جواب دیا۔۔۔ "ہر روز تازہ دودھ مل جاتے تو گھر میں گائے پالنے کی کیا ضرورت ہے"۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایک اور بات یاد آئی۔ دوسری عورت نے کہا تھا۔۔۔ "اسی سے کرلو"۔۔۔ انکل نے کہا تھا۔۔۔ "اُلو ہوں۔۔۔ اس کی کتنی باتیں ہوں گی"۔۔۔ ان کی ایسی باتیں میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں، میں نے کبھی ان پر غور نہیں کیا تھا شہزادگی تھی۔ دنیا کے ساتھ میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

ماضی کی جن باتوں پر نیلوفر نے کبھی غور نہیں کیا تھا، ان باتوں پر ڈی۔ ایس۔ پی چونک چونک اٹھتا اور پنسل کو کاغذ پر اس طرح چند الفاظ گھسیٹ دیتا تھا جیسے بے خیالی میں پنسل کاغذ پر پھیر دی ہو۔ اس نے نیلوفر سے یوں میں ایسے انکل کا مطالبہ کیا کہ نیلوفر اسے اپنا سرپرست اور غمخوار بلکہ محبوبی سمجھتی رہی اور بولتی چلی گئی۔

"میں تھی تو شہزادی"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔۔۔ "لیکن ایک خلش مجھے بے چین رکھتی تھی۔ یہ خلش ماں کی عمر کی کمی کی تھی۔ باپ کا خیال کم ہی آتا تھا، ماں کو میں بہت یاد کرتی تھی۔ یہ یاد کانٹا بن کر دل میں اتر گئی۔ میں جوں جوں بڑی ہوتی یہ کانٹا گہرا اترتا گیا اور یہ خواہش میری ایک کمزوری بن گئی کہ کوئی مجھے بیٹی کہے۔ میں ساری عمر کا پیار صرف ایک لفظ بیٹی پر قربان کر دینے کو تیار رہتی تھی۔ میں انکل کاردار سے کبھی کبھی پوچھا کرتی تھی کہ میری ماں کیسی تھی؟

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ کما کرتے تھے کہ تمہاری طرح خوبصورت تھی۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔ "انکل! آپ نے میری ماں کو میرے ساتھ پیار کرتے دیکھا ہوگا۔ بہت پیار کرتی ہوگی۔ آپ نے مجھے اس کا وہ وہ جیتے دیکھا ہوگا!..."

"انکل کاردار نے جھنجلا کر کہا۔ "بھول جاؤ نیلو! بھول جاؤ! انہیں جو دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ ابھی اتنی خوبصورت زندگی پڑی ہے ہمدوں کی یادوں کا آسیب طاری نہ کرنے رکھو۔ کیا میں تمہیں ماں کا پیار نہیں دے رہا؟ میرے پیار میں تمہیں باپ کا پیار نہیں ملتا؟ مجھے اپنے آس بھائی کے ساتھ بہت محبت تھی جس کی تم بیٹی ہو۔ میں نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ تمہاری بھی کوئی بھی سمجھ کو پالوں گا اور اس کی شادی کر کے خود شادی کروں گا دیکھو نیلو! میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ میں ان کے جواب سے مطمئن تو ہو گئی لیکن ماتما کا کانٹا دل سے نہ نکلا!"

نیلو فرہنس پڑی۔ گلاس سنسی میں مسرت نہیں تھی۔ کہنے لگی۔ "ایک غریب اور پولیس عورت کو میں نے صرف اس لیے گھر میں ملازم رکھ لیا ہے کہ وہ ہفتوں کے پیار سے مجھے بیٹی کہتی ہے۔ باتیں بھی ایسی کرتی ہے جن سے میرے دل کو سکون آجاتا ہے۔"

"آپ کے سسرال والوں کا آپ کے ساتھ کیا سلوک ہے؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"اُن میں سے کوئی آپ کے پاس آ کے نہیں رہ سکتا!"

"میرے سُسرال تو ہیں لیکن نہ میں ان کی صورت دیکھی ہے نہ اُنہوں نے" — نیلو فر نے جواب دیا۔ "آفتاب کی شادی اس کے والدین نے اپنی پسند کی کرائی تھی۔ تیسرے ہی مہینے آفتاب نے اس لڑکی کو طلاق دے دی تھی۔ والدین کے ساتھ اُس کی اسی بات پر ان بن ہو گئی۔ آفتاب نے جائداد لے لیا۔ کچھ نقد رقم بھی لے لی۔ بہت امیر خاندان ہے۔ آفتاب نے تھوڑی سی زمین بیچ کر روپیہ اپنے کے ساتھ کاروبار میں لگا دیا اور لائل پور سے ہمیشہ کے لیے راولپنڈی آگیا۔ وہاں ایک کوٹھی اس کے میں آئی تھی۔ انکل کاردار نے میرا تعارف اس سے کرایا۔ یہ آدمی مجھے بہت اچھا لگا۔ انکل کاردار آفتاب تعریفیں کرتے تھے۔ آفتاب ہمارے ہاں آتے اور ہم میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ ہماری شادی ابھی چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ..." نیلو فر کو ہچکی سی آئی اور اُس نے آنسو پینے لگے۔

"کیا آفتاب کاردار کے دوست تھے؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"انکل کاردار کہتے تھے کہ آفتاب ان کا دوست ہے!"

"آفتاب کی مالی حالت کیسی تھی؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا — "اور جائیداد کیا ہے؟"

"امیر آدمی ہیں" — نیلو فر نے جواب دیا — "مری میں یہ کوٹھی آفتاب کی ہے۔ ایک کوٹھی راولپنڈی ہے۔ لائل پور کے علاقے میں بہت سی زمین ہے اور وہاں بھی اپنا ایک مکان ہے۔"

"شادی کے بعد مسٹر آفتاب اور آپ نے انکل کے تعلقات دوستانہ رہے یا کبھی آپ سے

کچھ کھچا کھچا سا دیکھا تھا؟"

"حقیقت یہ ہے مجھے خالص صاحب!" — نیلو فر نے کہا — "میں آفتاب کی ذات میں جذب ہو گئی تھی۔ کبھی دھیان نہیں دیا کہ ان کے تعلقات کس کے ساتھ اچھے اور کس کے ساتھ ان کا کھچاؤ تھا!"

ڈی۔ ایس۔ پی نے اپنے ماتھے اور اپنے ہاتھ سے رگڑا جیسے دماغ پر زور دے رہا ہو۔

"کاردار اور آپ کے درمیان کبھی کوئی لین دین بھی ہوا ہے؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا — "کاروباری لوگوں میں لین دین لگا ہی رہتا ہے!"

نیلو فر نے بھی ڈی۔ ایس۔ پی کی طرح اپنے ماتھے کو ہاتھ سے رگڑا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"شادی سے کچھ دن بعد میں نے آفتاب سے پوچھا تھا کہ بنک میں ان کا کتنا روپیہ ہے اور ان کی جائداد کیا ہے" — نیلو فر نے کہا — "انہوں نے سبھی کچھ بتایا تھا جو میں نے آپ کو بتا دیا ہے... ہاں، ان کی انشورنس ایسی بھی ہے..." انہوں نے مجھے تفصیل بتا کر یہ بھی بتایا تھا کہ انکل کاردار نے ان سے چالیس ہزار روپیہ لیا ہے۔ کہتے تھے کہ ایک دو ماہ بعد واپس کر دوں گا!"

"واپس کر دیا تھا؟"

"نہیں!"

"آپ کو یقین ہے کہ کاردار نے مسٹر آفتاب کی رقم واپس نہیں کی تھی؟"

"مجھ سے آفتاب نے کبھی کوئی بات چھپائی تو نہیں تھی" — نیلو فر نے جواب دیا — "ابھی ایک ماہ پہلے کی بات ہے، میں نے آفتاب سے پوچھا تھا کہ انکل نے رقم واپس کی ہے یا نہیں۔ آفتاب نے بتایا تھا کہ تین بار مانگ چکا ہوں لیکن اُن کی مالی حالت شاید اچھی نہیں۔ وہ دے نہیں سکے۔ چالیس ہزار معمولی رقم نہیں تھی جو آفتاب انہیں بخش دیتے۔ آفتاب نے مجھے قدرے غصے میں کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں اتنی لڑکیوں پھنسا بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اتنی ہزار کیوں؟ انہوں نے جواب دیا تھا کہ کاردار نے اُن سے ۵ ہزار روپیہ مانگا تھا۔ کہتے تھے کہ جرمنی سے ایک مشین منگوا رہا ہوں۔ آفتاب نے چالیس ہزار دیا تھا!"

"مسٹر کاردار نے یہ رقم آپ کی شادی سے پہلے لی تھی؟"

"جی ہاں!" — نیلو فر نے جواب دیا — "شادی سے پہلے!"

ڈی۔ ایس۔ پی اس سے ہمدردی کے لہجے میں باتیں پوچھتا رہا۔ نیلو فر نے اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں اس بلاک واردات کے بعد تو اُس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ اس کے پاس اظہارِ افسوس کے لیے جو لوگ آتے تھے اُن کے انداز میں اپنائیت اور ہمدردی کم اور تصنع زیادہ ہوتا تھا۔ اس نے دل کی بات کبھی کسی سے نہیں کی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اُس کے ذہن سے اتار دیا تھا کہ وہ پولیس آفیسر ہے۔ وہ بڑی کامیابی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے اس کے قتل کا شریک بن گیا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ آپ کی کوٹھی تک چلنا چاہتا ہوں" ۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے کہا۔

وہ کسی شک پر نیلوفر کے گھر جا رہا تھا۔ وہ نیلوفر کے نوکروں سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کی کسی کے ساتھ دوستی تو نہیں؟ نیلوفر نے اس کے ساتھ جذباتی انداز سے باتیں کی تھیں۔ اس کے آنسو بہتے رہے تھے لیکن وائسنڈ پولیس آفیسر کسی کی جذباتی کیفیت سے متاثر ہونے لگیں تو وہ اُن جرائم پیشہ افراد سے زیادہ متاثر ہوں جو واردات کر کے باہر ہوتے ہیں۔

وہ نیلوفر کے ساتھ اس کے گھر چل پڑا۔

اُس نے ان دو کانسٹیبلوں سے جو نیلوفر کی کوٹھی کے پہرے پر رہتے تھے، بہت کچھ پوچھا۔ نیلوفر کو اُس نے اندر بٹھا دیا اور اس کے دونوں نوکروں کو الگ لے جا کر بہت پوچھ گچھ کی۔ دونوں نے اسے بتا کر کتنی نوکرانی آفتاب کے قتل کے بعد کوٹھی میں آتی ہے اور اسے نیلوفر کہیں سے اپنے ساتھ لاتی تھی اُنہوں نے یہی بتایا کہ یہ عورت نوکرانی لگتی ہی نہیں۔ نیلوفر نے اسے کوٹھی کا ایک کمرہ دے رکھا ہے بروقت کوٹھی میں نیلوفر کے ساتھ رہتی ہے اور رات نیلوفر کے سونے کے کمرے میں بہت دیر تک بیٹھی رہتی ہے۔

"یہ عورت کیسی ہے؟" ۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے پوچھا۔ "باتونی ہے؟ تیز طرار ہے؟ چالاک لگتی ہے؟"

"لگتی تو بالکل یہ عورت ہے" ۔۔۔ ایک نوکر نے جواب دیا۔ "تسبیح اس کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ صبح سویرے قرآن مجید پڑھتی ہے۔ اس کے آنے کے بعد ہم بیگم صاحبہ کو بھی نماز پڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ اس کی بہت عزت کرتی ہیں اور اسے اپنا کھانا دیتی ہیں۔"

جمیل کی ماں کے متعلق یہ تفصیل سُن کر ڈی۔ایس۔پی اس شک میں پڑ گیا کہ نیلوفر کے جذبات کسی طرح زخمی ہیں اور وہ جذباتی بھی ہے، اس لیے یہ عورت اسے نماز، تسبیح اور قرآن پاک سے دھوکہ دے رہی ہے۔ ڈی۔ایس۔پی نے نیلوفر کے ساتھ اتنی طویل ملاقات میں دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی کی جذباتی کیفیت کیا ہے؟ وہ پیار کی کتنی پیاسی ہے۔ اس کیفیت میں انسان نوسر باز لوگوں کے جال میں پھنسا کرتا ہے۔ ڈی۔ایس۔پی کو یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ یہ عورت نیلوفر کے گھر میں جو کچھ رو کیا ہے وہ اڑا کر لے جائے گی، اور یہ بھی ہے کہ یہ عورت کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہو۔ ڈی۔ایس۔پی نے دونوں نوکروں کو فارغ کر کے کہا کہ نئی نوکرانی کو اس کے پاس بھیج دیں۔

وہ آئی تو ڈی۔ایس۔پی نے اسے کوٹھی کے باہر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اسے سر سے پاؤں تک

اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر چالیس سے اُوپر لگتی تھی۔ چہرے پر مفلسی اور مشقت کے آثار نمایاں تھے لیکن نقش و نگار میں کشش ابھی باقی تھی۔ کشمیر کا رنگ ابھی پھیکا نہیں پڑا تھا۔ ڈی۔ایس۔پی کو اس چہرے میں وہ چند ایک عورتیں نظر آئیں جنہیں اُس نے اپنی ملازمت کے عرصے میں جرائم کی دنیا میں دیکھا تھا۔ اس قسم کی دو عورتیں اس کی مخبر بھی رہ چکی تھیں۔ اس نے ایسی عورتوں کو دیکھا تھا جو جوانی میں اپنے حُسن کو ذریعۂ معاش بناتی اور جوانی ڈھل جانے کے نوجوان لڑکیوں کو جال میں پھانس کر اپنی راہ پر چلاتی ہیں۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟" ۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے پوچھا۔

جمیل کی ماں نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔

"میری عمر میں کب سے ہو؟" ۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے پوچھا۔ "اس کوٹھی میں نوکری ملنے سے پہلے کیا کرتی رہی ہو؟ کہاں رہتی تھی؟"

جمیل کی ماں نے تفصیل سے بتایا کہ وہ مری کب اور کہاں آئی تھی اور نیلوفر کے ساتھ اس کی ملاقات کس طرح ہوئی اور یہ لڑکی رحم کھا کر اسے اپنی کوٹھی میں لے آئی۔

"کیا تم سچ کہتی ہو کہ بیگم صاحبہ نے تم سے نوکری نہیں مانگی تھی؟"

"بیگم صاحبہ امیر ہیں" ۔۔۔ جمیل کی ماں نے جواب دیا۔ "ان سے پوچھ لیں۔ میں تو ایک روز یہاں سے چل پڑی تھی لیکن بیگم صاحبہ نے نہیں جانے دیا۔"

"تمہارے پاس وہ خط ہے جو کہتی ہو کہ بیٹے نے تمہیں لکھا تھا کہ مری آ جاؤ۔ نوکری مل گئی ہے؟"

"نہیں" ۔۔۔ جمیل کی ماں نے جواب دیا۔ "گاؤں میں بھول آئی ہوں۔"

"میں کس طرح مان لوں کہ بیٹے نے تمہیں مری بلایا اور یہ بھی نہ لکھا کہ وہ کہاں رہتا ہے" ۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے کہا۔ "اور تمہارا یہ جواب بھی عجیب سا لگتا ہے کہ تم اس کا اتا پتہ معلوم کیے بغیر اتنی دُور پردیس کو چل پڑی۔"

"آپ بادشاہ ہیں" ۔۔۔ جمیل کی ماں نے کہا۔ "بادشاہوں کو اپنی رعایا کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ بادشاہ رعایا کا دل اپنے سینے میں رکھ لے تو وہ بادشاہی چھوڑ دے۔"

"میں جو بات پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو" ۔۔۔ ڈی۔ایس۔پی نے کہا۔ "بیکار باتیں نہ کرو۔"

"میرے بس آپ کی بات کا کوئی جواب نہیں" ۔۔۔ جمیل کی ماں نے کہا۔ "اگر آپ ماں ہوتے اور آپکا ایک ہی بیٹا ہوتا اور وہ آپ سے لڑ کر رونے کے باوجود گھر سے نکل جاتا تو آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جاتا۔ میں بیٹے کے خط پر کیوں، نعد ھند گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ہمارے لیے گھر سے نکل کھڑے ہونا کوئی مشکل نہیں اور کوئی عجیب بات نہیں ہوتی۔ غریب خانہ بدوشی میں نوکری ہے۔ یہ تو پاکستان بنانے میں نے طوفان میں جھگی بنائی۔ یہی ایک بیٹا ہے۔ اسی کے سہارے زندہ ہوں۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یہ عورت کشمیر کے دیہاتیوں کی سادگی سے بول رہی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی کا ذہن صاف ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ منجھا ہوا پولیس آفیسر تھا۔ اتنی جلدی ذہن سے شک کو نکالنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اسے اس عورت سے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ نیلوفر کی درپردہ زندگی کے شب و روز کس طرح گزرتے ہیں۔ اس لئے بے پناہ قیاس نہیں تھا کہ نیلوفر نے اپنے خاوند کو غائب کرایا ہے اور ضروری نہیں کہ نیلوفر نے جو باتیں سنائی ہیں وہ سچ ہوں۔

"بیگم صاحبہ تم پر اتنی مہربان کیوں ہیں؟" ـــ ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"بے چاری دکھوں کی ماری لڑکی ہے۔" ـــ جمیل کی ماں نے جواب دیا ـــ "آپ کیا جانیں اس کے حالات کس طرح گزر رہے ہیں۔ باپ نہ ماں۔ خاوند بھی سب کچھ تھا وہ قتل ہو گیا۔ ایک چچا ہے جو اتنا خاوند ہے کہ یہاں آتا ہے تو بیگم صاحبہ کے ساتھ لڑ جھگڑ کر اور اسے روتا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اسے کہتا ہے کہ فوراً دوسری شادی کر لو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہتی ہے کہ اس کا خاوند زندہ ہے۔ میں بھی یہ کہتی ہوں کہ جب تک اپنے خاوند کی لاش نہ دیکھ لوں میں بھی سمجھوں وہ قتل نہیں ہوا۔"

"تم کس طرح کہتی ہو کہ قتل نہیں ہوا؟"

جمیل کی ماں کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جس میں مسرت کے سوا باقی سب کچھ تھا۔ کہنے لگی ـــ "صاحب جی! میں نے بات کی تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ بیکار باتیں نہ کرو۔ میں پوچھ کر کیوں کی کہ آپ اس دنیا کے بادشاہ ہیں۔ چاہیں تو بیگناہ کو بھی سولی چڑھا دیں اور گناہگار کو بخش دیں۔ آپ انگریزی کی ڈگریوں کی سیڑھی سے بھی بڑے فقیر ہیں۔ ہم آپ کی دنیا سے دور جنگلوں میں جانوروں کی طرح رہنے اور ڈور کو چھیننے والے لوگ ہیں۔ ہم اپنے دلوں کو بڑا کرتے ہیں۔ خدا جا رہے دلوں میں جو کچھ ڈال دیتا ہے اسے ہم سولہ آنے سچ سمجھتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ لڑکی بیوہ نہیں ہوئی۔ میں اللہ کی عبادت کرتی ہوں۔ میں نے اپنے اللہ سے کہا ہے کہ اگر میرے اللہ! یہ لڑکی ایک کوٹھی مجھے بھی دے دے جہاں میرا بیٹا شہزادوں کی طرح رہے تو صاحب جی! میں نے اپنے اللہ کو کبھی پریشان نہیں کیا۔ مصیبت جو مجھ پر آئی تھی۔ خدا نہ کرے وہ کسی اور پر آتے مگر میں نے کہا۔ اللہ تیرا شکر ہے..... مجھے عبادت میں اشارے ملتے ہیں کہ اس لڑکی کا خاوند قتل نہیں ہوا۔"

"دیکھو مائی!" ـــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ـــ "مجھے چکر نہ دو۔ میں پوچھتا کچھ اور ہوں اور تم غیر متعلق باتیں کر کے مجھے کسی اور طرف لے جاتی ہو۔ میں نے کیا پوچھا تھا؟"

"صاحب جی!" ـــ جمیل کی ماں نے کہا ـــ "ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ خدا سے ڈرو یا نہ ڈرو۔ اس کی ذات بخش دے گی۔ پولیس سے ڈرو۔ پولیس نہیں بخشے گی خواہ تم نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ پھر صاحب! میں اپنے خدا سے ڈرتی ہوں۔ آپ کا مجھے کوئی ڈر نہیں..... آپ نے پوچھا تھا کہ بیگم صاحبہ مجھ پر کیوں

ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے اسے ماں کا پیار دیا ہے اور اسے کہا ہے کہ تمہارا خاوند قتل نہیں ہوا۔ اللہ کی اللہ جانے میں غریب کا حال تو نہیں بتا سکتی۔ بیگم صاحبہ کے زخمی دل پر مرہم رکھ دیا تو یہ خوش ہو گئیں۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ انسان کا سہارا صرف خدا ہے اور خدا کا کلام ہے۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ اتنی زیادہ تعلیم یافتہ مگر نہ قرآن مجید پڑھنا آتا ہے نہ نماز میں نے بیگم صاحبہ کو نماز پڑھنی سکھائی اور قرآن مجید کا بھی سبق دیتی ہوں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی اس عورت کو بول دیکھ رہا تھا جیسے اُسے کچھ بھی پلے نہ پڑ رہا ہو۔ کبھی وہ سوچتا کہ اس عورت کی اصلیت یہی ہے اور کبھی اسے شک ہوتا کہ بہت چالاک عورت ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس پر جرح شروع کر دی۔ جمیل کی ماں جواب دیتی چلی گئی۔ آخر پریشان ہو گئی۔

"صاحب جی!" ـــ اس نے بیٹھنا چاہا ـــ "آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کو کچھ پر کیا شک ہے؟ ..... آپ مجھ سے الٹی سیدھی باتیں صرف اس لئے کیے اور بولے جا رہے ہیں کہ میں بے آسرا اور بے ٹھکانہ ہوں اور اب سمجھتے ہیں نہ میرا دین نہ ایمان، میرا پیٹ ہے۔ کیا آپ یہ چاہتے کہ میں کوٹھی سے نکل جاؤں؟"

"میں نہیں صاف صاف بتا دیتا ہوں" ـــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ـــ "میری مدد کرو گی تو کچھ حاصل کرو گی۔ تمہارے دن پھر جائیں گے۔ مجھے چکر دو گی تو زندگی تمہارے لیے دوزخ بنا دوں گا..... مجھے اس کوٹھی کا کون راز بتاتا ہے۔ تم یہاں کیا کوتی ہو؟ بیگم کیا کرتی ہے اور واردات سے پہلے یہاں کیا ہوتا رہا ہے؟"

جمیل کی ماں اتنی طویل اور اتنی پُر پیچ تفتیش سے تنگ آ چکی تھی۔ اس کا ذہن اپنے قابو میں نہیں رہا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی اُسے اس مقام پر لے آیا تھا جہاں مجرم کا رادہ بڑے سے بڑے ڈھیٹ مجرم بھی پولیس کے مطلب کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کے چال چلن پر شبہ کیا جا رہا ہے اور یہ پولیس آفیسر یہ شبہ کر رہا ہے کہ اس کا نیلوفر کے ساتھ کوئی مجرمانہ تعلق ہے۔ وہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی۔ مہذب دنیا کے اسرار و رموز بھی نہیں سمجھتی تھی اور اس کا دماغ اپنے قبضے میں رہا ہی نہیں تھا۔

"رازی کی بات پوچھتے ہو صاحب جی!" ـــ اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے بتانا نہ کر لیا گیا ہو۔ کہنے لگی ـــ "راز یہ ہے کہ یہ لڑکی میری بیٹی ہے۔ اس کا نام نیلوفر نہیں ماہ جبیں ہے" ـــ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل تو گئے لیکن اس کے جسم کی جنبش سے پتہ چلتا تھا جیسے اسے دھچکا لگا ہو۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر ڈی۔ ایس۔ پی کو دیکھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مکرم نے اسے کیمپ میں کاروار کے ہاتھ بیچا تھا؟" ـــ ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"نہیں" ـــ جمیل کی ماں نے لپک کر ڈی۔ ایس۔ پی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے، پھر ہاتھ جوڑ کر بولی ـــ "میں نے اسے بتایا نہیں کہ میں اس کی ماں ہوں۔ میں نے تو اسے بیچا ہی نہیں تھا۔ آپ بھی اسے نہ بتائیں۔ یہ کوٹھی ٹاٹ سے کھٹ رنگ محل بنی ہے۔ محل میں ٹاٹ کا پیوند اچھا نہیں لگتا۔ میں اس کی لونڈی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رو کر ہی خوش ہوں۔ اسے بیٹی کتنی ملی ہوں تو یہ اور زیادہ خوش ہوتی ہے اور مجھے اماں کہتی ہے۔ اپنا خون اپنے خون کو پہچانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مجھ پر مہربان ہے اور اس نے مجھے کلثمی کا ایک کمرہ دے رکھا ہے میں اللہ کا کلام پڑھتی رہتی ہوں اور جب رات میری بیٹی سوتی ہوتی ہے تو اس کے وجود پر پھونکیں مارتی ہوں.... آپ اسے بتائیں گے تو نہیں؟"

ڈی۔ ایس۔ پی اپنے خیالوں میں گم ہو گیا تھا۔ اسے انسپکٹر شاہ اور نیلوفر سے معلوم ہو چکا تھا کہ کاردار نے نیلوفر سے کہا تھا کہ اس نے اسے پانچ چھ سال کی عمر میں اغوا کیا تھا اور وہ خانہ بدوشوں کی بیٹی ہے۔ اب یہ عورت کہہ رہی تھی کہ وہ نیلوفر کی ماں ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی یہ شک رفع کرنا چاہتا تھا کہ اس عورت نے اپنی بیٹی بچپن میں فروخت کر دی ہو گی۔ اس کا پہلا غرباء کاردار بھی ہو سکتا تھا، یا اس نے یہ بچی کسی اور خریدار سے خریدی ہو گی۔

"میں نے پوچھا ہے کہ تم نے اسے بیچا تھا؟" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔

"نہیں۔" جمیل کی ماں نے جواب دیا۔ "یہ اغوا ہو گئی تھی...." اور اس نے پوری تفصیل سے سنا دیا کہ نیلوفر جب باجرہ تھی، کس طرح اغوا ہوئی تھی اور کس طرح پندرہ سولہ سال بعد ماں بیٹی کی ملاقات ہوئی اور کس طرح اُس نے اپنی بیٹی کو پہچانا ہے۔ ماں کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے ڈی۔ ایس۔ پی کو یقین دلا دیا کہ یہ عورت سچ کہہ رہی ہے۔

"اگر تمہیں اپنی بیٹی سے پیار ہے تو اسے یہ نہ بتانا کہ میں نے تم سے کیا کچھ پوچھا ہے۔" ڈی ایس۔ پی نے کہا۔ "یہ راز ہی رہے اس سے چھپائے رکھنا کہ تم اس کی ماں ہو؟"

"مجھے ڈر ہے کہ آپ اسے یہ راز بتا دیں گے۔" جمیل کی ماں نے کہا۔ "میں تو عہد کر چکی ہوں کہ اسے کبھی بھی یہ نہیں بتاؤں گی کہ میں اس کی ماں ہوں۔ میں دن کو شہر میں گھومتی پھرتی رہتی ہوں۔ جوں ہی مجھے اپنا بیٹا مل گیا، میں اس کوٹھی سے نکل جاؤں گی۔ اگر بیٹے کے ساتھ میری میں رہنا پڑا تو اپنی بیٹی کو دور سے، چھپ کر دیکھ لیا کروں گی اور اپنے بیٹے سے بھی یہ راز چھپائے رکھوں گی۔ بیٹے میں جوان خون ہے۔ وہ تو بہن کے اغوا کی کہانی سن کر پاگل ہو جائے اور گھر سے نکل کھڑا ہو۔ اس نے اتنا بھی نہ سوچا کہ پندرہ سال گزر چکے ہیں، اغوا ہوئی تھی وہ اب کہیں نہیں ملے گی، اگر کہیں مل بھی گئی تو اُسے پہچان نہیں سکے گا۔ اگر اُسے پتہ چل گیا کہ یہ سے اُس کی بہن تو وہ قیامت لے آئے گا۔ بڑی غیرت والا ہے میرا بیٹا جمیل۔ دلیر اتنا ہے کہ کاؤں کے لوگ مجھے کہا کرتے ہیں کہ تمہارا بیٹا جتنا دلیر ہے اتنا ہی بیوقوف ہے۔ اُدھر کاغان میں آپ جیسے امیر باد شاہ سیر سپاٹے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ میرا بیٹا گھوڑی پر اُنہیں سیر کرایا کرتا تھا۔ یہی ہماری روزی کا ذریعہ تھا۔ ایک بار اُس نے ایسے ہی ایک امیر زادے کو پیٹ ڈالا تھا کیونکہ اس نے کسی لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی.... میں اسے یہ نہیں چلنے دوں گی کہ تمہاری بہن یہاں رہتی ہے۔"

اللہ کرے میرا جمیل بنا بھی مجھے مل جائے۔"

"میں بھی ایک جمیل کو ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز سے زیرِ لب کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"صاحب جی!" جمیل کی ماں نے التجا کے لہجے میں کہا۔ "میری بیٹی کا خاوند مل جائے گا؟.... زندہ تو ہے نا؟"

"تم دعا کرتی رہا کرو۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے دوستانہ بلکہ مشفقانہ لہجے میں کہا۔ "اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی کا خاوند زندہ و سلامت مل جائے اور اس کے دشمن پکڑے جائیں تو ایک کام کیا کرو۔ اس کے پاس جو لوگ آتے ہیں، اُن کی باتیں جو وہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کرتے ہیں وہ چوری چھپے سُنتی رہا کرو۔ یہ کہانی ختم ہونے تک میری میں رہوں گا۔ جب باز آ کر جاتی ہو تو تم نے آ کر میری پوچھ لیا کرو اور مجھے بتایا کرو کہ یہاں کیا باتیں ہوئی ہیں۔ تمہاری طرح میں بھی تمہاری بیٹی کو اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں واپس دلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"صرف ایک آدمی ہے جو میری بچی کو بہت پریشان کرتا ہے۔" جمیل کی ماں نے کہا۔ "وہ اس کا چچا ہے جس کا نام کاردار ہے۔"

"اب نہیں کرے گا۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔

وہ نیلوفر کے ڈرائنگ روم میں جلاد کی جاں دے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"میں آپ کے نوکروں سے پوچھ گچھ کرتا رہا ہوں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ کو اس پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ میں ان سے کیا پوچھتا رہا ہوں۔ آپ نہ مجھ سے پوچھیں، نہ نوکروں سے.... میں اپنا کام کر رہا ہوں، اور میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ آپ کی بھلائی کے لیے اور آپ کے خاوند کی زندگی کے لیے کر رہا ہوں۔ آپ نے اپنی زبان کو قابو میں نہ رکھا تو آپ تصور نہیں کر سکتیں کہ اس کا کیا نقصان ہو گا۔ یہ مسز آفتاب کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"انہوں نے دیکھا، جمیل کی ماں ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ چھجک کر پیچھے ہٹنے لگی تو ڈی۔ ایس۔ پی نے اسے کہا۔ "آجاؤ۔ آجاؤ۔"

وہ اندر آ کر نیلوفر کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"آپ کی یہ نوکرانی بہت اچھی اور بہت نیک بخت ہے۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ آپ کو نماز اور قرآن پاک پڑھاتی ہے۔ آپ اُدھر توجہ میں مسز آفتاب! عبادت اور دعا سے بہتر سے رونما ہوا کرتے ہیں۔ دنیا کی اس جھوٹی ان بان نے آپ کو کیا دیا ہے؟ یہی نا کہ آپ پر ایک مصیبت ٹل جاتی تو آپ زمین پر رہیں نہ آسمان پر۔ کیا آپ نے عبادت اور نماز میں رُوحانی سکون محسوس نہیں کیا؟ آپ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میرے لیے بھی دعا کیجیں کہ خدا مجھے روشنی عطا کرے جس میں مجھے آپ کے دشمن نظر آجائیں۔ میرا علم اور تجربہ کچھ بھی نہیں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی اپنی بات کہے جا رہا تھا مگر وہ ماں اور بیٹی کے چہروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے دونوں میں کچھ کچھ مشابہت نظر آرہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماں بیٹی ایک جیسے چلیے اور ایک جیسے لباس میں ہوتیں تو یہ مشابہت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ ماں بیٹی ہی ہیں۔

وہ جانے کے لیے اُٹھا تو نیلوفر بھی اُس کے ساتھ ہی چل پڑی۔ دونوں ٹہلتے ٹہلتے کوٹھی سے نکلے اور تھانے کی طرف چل پڑے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نیلوفر کی باتیں سن بھی رہا تھا اور باتیں کر بھی رہا تھا لیکن اُس کا دماغ کسی اور مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔ ایک وہ ملزم جو تھانیدار نے کار دار پر حملہ کیا اور وہ حوالات سے فرار ہو گیا تھا دوسرا کار دار تھا جسے ڈی۔ ایس۔ پی اپنے ملنے اور افسروں کی سوسائٹی کا معزز فرد سمجھتا رہا تھا مگر اُس کا کردار کچھ اور نکلا اور تیسری یہ عورت تھی جسے اپنی گمشدہ بیٹی معجزے کے طور پر مل گئی تھی۔

وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا جا رہا تھا۔ اُسے جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ نیلوفر بھی اس کے ساتھ جا رہی ہے۔ وہ جب تھانے میں داخل ہوتے تو برآمدے میں ساجی اور اُس کا دادا اجڑ بیٹھے تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی اُن کی طرف دیکھے بغیر ایس۔ ایچ۔ او کے دفتر میں چلا گیا۔ نیلوفر ساجی کے پاس رُک گئی۔ اُس کے پوچھنے پر ساجی نے اُسے بتایا کہ اُسے تھانے بلایا گیا ہے۔

"دیکھو ساجی!" نیلوفر نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "یہاں یہ نہ بتانا کہ جمیل کہاں ہے۔ میں نے بھی نہیں بتایا۔ بتا دُگی تو وہ ساری عمر کے لیے قید ہو جائے گا۔ یہ بتا دینا کہ تم سے ملنے آیا تھا۔ یہ بھی بتا دینا کہ تم پر میرے چمانے دُور لے جا کر دست درازی کی تھی۔ میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"تم نے بتا دیا ہے کہ جمیل بے گناہ ہے؟" ساجی نے پوچھا۔

"سب کچھ بتا دیا ہے۔" نیلوفر نے کہا۔ "ڈرنا نہیں، لیکن پھر سن لو کہیں نہ بتانا کہ جمیل کہاں ہے۔"

"نہیں بتاؤں گی۔" ساجی نے کہا۔

نیلوفر نے اندر جا کر ڈی۔ ایس۔ پی سے جانے کی اجازت مانگی اور تھانے سے نکل گئی۔

*

ڈی۔ ایس۔ پی نے جب ساجی کو اندر بلایا تو اُس کا دادا بھی اُس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ ڈی۔ ایس۔ پی کو قرائن یقین دلا رہے تھے کہ یہ دونوں داؤں کے۔ ہاتھ پلنے والے گھن ہیں اور یہ مجرم نہیں بلکہ مجرموں کے جال میں آتے ہوتے ہیں۔

"بابا! تم اسی دروازے کے ساتھ باہر بیٹھ جاؤ۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے اجڑ دادا سے کہا۔ "اپنی بچی کا غم نہ کرو۔ یہ میری بھی بچی ہے۔ میں سے دو چار باتیں پوچھ کر تمہارے ساتھ گاؤں بھیج دوں گا۔"

اجڑ پر رقت طاری ہو گئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر اور جھک کر ڈی۔ ایس۔ پی کو سلام کیا اور اُس کی طرف پیٹھ کیے بغیر اُلٹے پاؤں دروازے سے نکلا اور برآمدے میں رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا۔

"تم اس لڑکی کو جانتی ہو جس کا خاوند قتل ہو گیا ہے؟" ڈی۔ ایس۔ پی نے ساجی کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا اور اُس کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے کہا۔ "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، تم مجھے ساری باتیں بتا دو۔"

"ہاں صاحب جی!" ساجی نے جواب دیا۔ "میں اس لڑکی کو جانتی ہوں۔" اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ نیلوفر کے ساتھ اس کی ملاقات کہاں ہوتی تھی۔

"جمیل کی پہلی ملاقات سے اب تک کی ساری باتیں سنا دو۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "کوئی بات چھپا کے نہ رکھنا ورنہ تمہارا ہی نقصان ہو گا۔ میری کوشش یہ ہے کہ تم پر جو تہمت لگ گئی ہے وہ اُتر جائے۔ میں نے سنا ہے کہ کار دار نے تمہیں جنگل میں لے جا کر تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔"

ساجی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اُس نے سر جھکا لیا۔

"غریب کی بیٹی کی عزت پر کون ہاتھ ڈالتا صاحب جی!" ساجی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "گاؤں میں جو دیکھتا ہے بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ گاؤں میں خانو نام کا ایک جوان

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آدمی ہے۔ مجھے راستے میں روک کر ڈراتا ہے کہ جمیلا ڈاکو تجھے مار ڈالے گا۔ اب پولیس کو بتا دوں گا میرا کوئی بھائی نہیں، باپ نہیں، چچا نہیں، دادا بہت بڑھا ہے۔ خانو سے میں بہت ڈرتی ہوں کبھی کہتا ہے میرے ساتھ شادی کر لو کبھی کہتا ہے تھوڑی سی دیر کے لیے شادی کر لو۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے ساجی کے آنسو اور بولنے کے انداز سے محسوس کر لیا کہ لڑکی چالاک نہیں۔ اُس نے اُسے کہا۔ "کسی سے مت ڈرو ساجی! میں سب کو سیدھا کر دوں گا۔"

"خانو کو بھی؟"

"ہاں ہاں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے شگفتہ سی جھنجھلاہٹ سے کہا۔ "مجھے وہ بات سناؤ جو میں نے تم سے پوچھی ہے۔ جمیل تمہیں کب ملا تھا؟ کار وار کب ملا تھا؟"

ساجی نے اُس طوفانی رات سے داستان کی ابتدا کی جس رات جمیل اُس کے گھر آیا تھا۔ اُس نے کوئی بات نہ چھپائی۔ محبت کی باتیں بھی سنائیں۔ انگوٹھیوں کے تبادلے کی، وعدے بھی سنائی۔ کار وار کی کوٹھی میں وہ وعدہ دینے کا قصہ بھی سنایا۔ اس کے ساتھ کار وار جو باتیں کرتا تھا وہ بھی سنائیں۔ وہ داستان کا میں جس طرح لے گیا تھا اور جہاں لے گیا تھا اور جس طرح دست درازی کی تھی، اس نے کار وار کا جس طرح مقابلہ کیا تھا، پھر جمیل آ گیا تھا، سب کچھ سنایا۔ پوری تفصیل سے سنایا۔ جمیل اور کار وار کی لڑائی سنائی، اور اُس کے بعد کی سرہت سنا دی۔ اس نے یہ بھی کہا۔ "میری گاگرا و انہوں کی نوکری بھی ہمیں کی کوٹھی میں پڑی ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ جمیل تمہیں ملنے آیا تھا؟" ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"یہ تا خاصا حب جی!" ساجی نے جواب دیا۔ "میں اُسی جگہ بیٹھی ہوئی تھی جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے۔ وہ جانے لگا تو کسی نے دیکھ لیا۔" ساجی نے تفصیل سے سنایا کہ جمیل کس طرح بچ گیا تھا ڈی۔ ایس۔ پی نے اُس سے پوچھا کہ جمیل کے ساتھ کیا باتیں ہوئی تھیں۔ ساجی نے کچھ باتیں بتا دیں کچھ نہ بتائیں۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟"

"دیکھو صاحب جی! میں آپ کو ساری باتیں بتا رہی ہوں۔" ساجی نے جواب دیا۔ "دل میں کچھ بھی نہیں رکھا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں رہتا ہے تو میں یہ بھی آپ کو بتا دیتی۔"

ڈی۔ ایس۔ پی کو اس پر یقین آتا جا رہا تھا۔ حالانکہ ساجی نے بہت کچھ دل میں رکھ لیا تھا۔

"وہ بنگلہ ہے نا صاحب جی!" ساجی نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ ہم غریبوں کے نیچے کیوں پڑ گئے ہیں جس رات اس کوٹھی میں ڈاکہ پڑا اور نیلوفر کا خاوند غائب ہوا، اُس رات جمیل ہمارے گھر میں تھا۔"

ڈی۔ ایس۔ پی ساجی سے کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے ریسیور

اٹھایا۔ نیلوفر بول رہی تھی۔ اُس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"انکل کار وار میری کوٹھی کے باہر کھڑے کانسٹیبل سے جھگڑ رہے ہیں۔" نیلوفر کہہ رہی تھی۔ "کانسٹیبل انہیں اندر نہیں آنے دے رہا۔ خالصا حب! وہ زبردستی اندر آ گئے تو معلوم نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ کانسٹیبل انہیں بتا چکا ہے کہ آپ آئے تھے، اور آپ نے نوکروں اور نوکرانی کے بیان لیے تھے اور آپ نے کوٹھی میں اُنکل کا داخلہ بند کر دیا ہے۔"

"میں آ رہا ہوں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اُس نے ریسیور رکھ کر ساجی کے دادا کو اندر بلایا اور اُسے کہا کہ وہ ساجی کے ساتھ تھانے میں ہی رہے۔ اُس نے اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ ان دونوں کو کھانا کھلا دے۔ چائے پلا دے اور انہیں کہیں آرام اور عزت سے بٹھائے۔ وہ دونوں کو لے کر باہر نکلا۔ انسپکٹر شاہ، ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر اوپر چلا گیا جہاں اُس کی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ میں سب کو بٹھایا اور خود جیپ کے سٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔

جیپ جب نیلوفر کی کوٹھی کے سامنے رکی تو نیلوفر اور کانسٹیبل دوڑے آئے۔ انہوں نے ڈی ایس۔ پی کو بتایا کہ کار وار ابھی ابھی لڑ جھگڑ کر گیا ہے۔ وہ اپنی لال رنگ کی جیپ میں تھا۔ اسے کوٹھی میں داخل نہیں ہونے دیا گیا تھا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے نیلوفر کو تسلی دلاسہ دیا اور جب کھلا کہ سڑک پر سے آیا۔ اب اُس کا رخ کار وار کی کوٹھی کی طرف تھا۔ کوٹھی وہیں تھی۔ وہاں کچھ تو کار وار وہاں نہیں تھا۔ خالصا ماں اور ایک نوکر تھا اُن سے کار وار کے متعلق پوچھا تو دونوں نے کہا کہ کار وار آیا ہی نہیں۔

"بالکل نہیں آیا؟" ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"بالکل نہیں جی!" خالصا ماں نے کہا۔ "دو نوں اولاد ایندھن گئے ہوئے ہیں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے خالصا ماں کے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ وہ چکر کھا کر ایک طرف گرا۔ ایک ہی تھپڑ نوکر کے منہ پر مارا۔ پھر دونوں کو اپنے ساتھ کھڑا کر کے زمین کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "یہ کس کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان ہیں؟..... فوراً بولو۔ ورنہ حوالات میں بند کر کے تم سے پوچھوں گا۔"

خالصا ماں نے اٹھ کر غصہ بھری ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم اس پیٹ کی خاطر جھوٹ بول رہے ہیں سرکار! سچ کہتے ہیں تو سچوں کی مانی جاتی ہے، جھوٹ بولتے ہیں تو آپ حوالات میں بند کرتے ہیں....."

صاحب آ گئے تھے۔ کچھ غصے میں تھے۔ ہم نے پوچھا کہ تم سے پولیس نے کچھ پوچھا تھا؟ ہم نے کہا کہ نہیں، انہوں نے کہا اگر کسی کو بتایا کہ میں آیا تھا کہ کتنا صاحب پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ وہ بس اتنی سی بات کہہ کر وہ بھی چلے گئے ہیں۔"

Scanned By Azad Kashmir

"جس لڑکی سے تمہارا صاحب چند دن، دو دن لیتا رہا تھا۔ اس کی گاڑی ابھی تک یہیں پڑی ہے؟"

"ہاں سرکار!" ۔ خانساماں نے جواب دیا۔ "کچن میں پڑی ہے"

"ڈی ایس۔ پی باورچی خانے میں گیا۔ خانساماں نے اُسے پیتل کی گاگر دکھائی۔

"اور انڈوں والی ٹوکری؟"

"وہ شاید سٹور میں پھینک دی تھی"۔ خانساماں نے جواب دیا اور سٹور کی طرف دوڑا گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی کہنے لگا۔ "یہ تھی"

"یہ دونوں چیزیں باورچی خانے میں پڑی رہنے دو"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "انہیں کوئی ہاتھ نہ لگائے"۔ اُس نے انسپکٹر شاہ سے کہا۔ "سمجھتے ہو نا شاہ جی؟"

"سمجھتا ہوں جی!"۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "یہ باقاعدہ برآمدگی ہیں"

"تم دونوں کوٹھی میں موجود رہنا"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے خانساماں اور نوکر سے کہا۔ "کاروار آجائے تو اُسے گاگر اور اس ٹوکری کے متعلق کچھ نہ بتانا، کوئی گڑبڑ ہو تی تو پڑے جاؤ گے"

ڈی۔ ایس۔ پی جیپ میں بیٹھا، جیپ چلائی اور ارشد کی کوٹھی کے سامنے جا رُکا۔ ارشد برآمدے میں بیٹھا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کو دیکھ کر دوڑا آیا۔

"کاروار یہاں آیا تھا؟"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"آیا تھا"۔ ارشد کے لہجے میں تذبذب اور خوف تھا۔ کہنے لگا۔ "ابھی ابھی گیا ہے"

"اُس کے ساتھ گیا ہیں نہیں؟"

"اُس نے مجھے کہا کہ نیلوفر بہت بگڑی ہوئی ہے۔ اُس نے معاملہ نہیں پولیس کو بتایا تو اسے کہ اُس کی کوٹھی میں میرا داخلہ بند کر دیا کیا جائے"۔ ارشد نے کہا۔ "وہ کہنے لگا کہ وہ نیلوفر سے یہ بھی بتا دیا ہو کہ میں اس کی شادی تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں.... اگر پولیس تم سے پوچھ گچھ کرے تو کہہ دینا کہ میں نے تمہیں ایسی چیز کی کشف نہیں کی۔ یہ بھی کہہ دینا کہ نیلوفر بدقماش لڑکی ہے۔ مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے ... میں خانصاحب کا اس جھنجھٹ میں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں نے کاروار سے کہہ دیا کہ میں ڈی۔ ایس۔ پی کو ساری بات بتا چکا ہوں۔ اُس نے پوچھا کہ تم نے یہ تو نہیں بتایا کہ میں نے تم سے اتنی ہزار روپیہ مانگا تھا؟ میں نے کہا کہ میں نے یہ بھی ڈی۔ ایس۔ پی کو بتا دیا ہے۔ وہ بہت گھبرایا اور کوئی اور بات کیے بغیر گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا"

"مسٹر ارشد!"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "آپ پولیس کے گواہ ہیں۔ آپ گھر پر ہی رہا کریں۔ مجھے بتائے بغیر یہاں سے باہر نہ جائیں"

ڈی۔ ایس۔ پی نے تھانے میں جا کر سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک ہاکنسٹیبل سے کہا کہ وہ پراسیوٹ کیٹر سے

پہن کر کاروار کی کوٹھی پر نظر رکھنے کے لیے چلا جائے جونہی کاروار کوٹھی میں آتے۔ کانسٹیبل فوراً تھانے اطلاع کرے۔

"انسپکٹر شاہ!"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے انسپکٹر شاہ سے کہا۔ "آپ نے نوٹ نہیں کیا کہ کاروار نے نیلوفر سے شادی آفتاب کے ساتھ کرانے سے پہلے آفتاب سے اسی ہزار روپیہ مانگا تھا مگر آفتاب نے بیچارہ پچاس ہزار دیا تھا جو کاروار نے ابھی تک نہ لوٹایا نہیں۔ اب وہ نیلوفر کی شادی ارشد کے ساتھ کرنا چاہتا ہے اور ارشد سے بھی اُس نے اسی ہزار روپیہ ادھار مانگا ہے۔ ارشد نے کہا تھا کہ پچاس ہزار روپیہ دوں گا.... نیلوفر نے مجھے اپنے لوگوں کی رو تیدا دسنائی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ایک عورت نے کاروار کو شادی کا مشورہ دیا تھا اور گھر مار کر کہا تھا کہ اسی (نیلوفر) سے کرلو۔ کاروار نے کہا تھا۔ "اس کی کتنی شادیاں ہوں گی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگے جیسے یہ اونچے درجے کی داروات ہے۔ مجھے امید ہے کہ شام تک کاروار میرے ہاتھ آجائیگا۔

"کیا آپ اسے مجرم سمجھتے ہیں؟"۔ انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔ "یا ابھی شک ہے؟"

"کاروار مجرم نہ ہو تو اُس وہ اس جرم میں کسی نہ کسی طرح شریک ضرور ہے"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "وہ مل جائے تو مجھے امید ہے کہ بات صاف ہو جائے گی"

انسپکٹر خالد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"۔ انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے وہ روپوش ہے"۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے جواب دیا۔ "اُس نے تفتیش میں بہت لاپرواہی کی ہے۔ یا اُس نے والدہ کی ہے اور قیمت وصول کی ہے"

ڈی۔ ایس۔ پی کو جب خیال آیا کہ سامی اور اُس کا دادا ابھی تک تھانے میں ہی بیٹھے ہیں تو اُس نے دونوں کو بلا کر کہا۔ "تم دونوں گاؤں چلے جاؤ، اور اگر جمیل آجائے تو اسے کہنا کہ وہ تھانے آجائے۔ اسے بلا دینا کہ تم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں"

دونوں تھانے سے نکل گئے۔

انسپکٹر خالد کہیں دور نہیں گیا تھا۔ وہ روپوش نہ ہوا نہیں تھا۔ اسے روپوش کیا گیا تھا۔ وہ مری شہر کے نزدیک نواح میں اسی کھنڈر نما مکان میں قید تھا جہاں رازی نام کا ایک معزز صورت انسان اسے دھوکے میں لے گیا تھا۔ یہ مکان شہر سے کہیں دور دراز تھا۔ تین طرف ٹھاٹھیں پہاڑیاں اور گھنے جنگل نے قدرتی حصار کے دسوں جتنے طویل اور بلند بنا رکھے تھے۔ درختوں کو درختوں نے۔ بیلوں کو جھاڑیوں نے، جھاڑیوں نے گھاس کو دھانپ رکھا تھا اور سب نے مل کر پہاڑیوں کی بلندی اور پستی، گھاٹیوں کی گہرائی اور نشیب کو اپنی پرتوں پر ڈھال رکھا تھا جیسے موت کی ہولناک سازش کا عملی جامہ پہنا رہے ہوں۔

خالد وہیں قید تھا۔ آج وہ اُوندھے منہ فرش پر بیٹھا وہی کچھ سوچ رہا تھا جو اُس نے اُس روز سوچا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھا جس روز وہ دھوکے میں اس کمرے میں داخل ہُوا تھا تو ایک پستول اور دو آدمیوں نے اسے بے بس کر کے اس کمرے میں بند کر دیا تھا۔

وہ لمحے گن کر کٹ سکے جی رہا تھا اور باہر کی کرہٹ کو موت کی آہٹ سمجھتا تھا۔ وہ اپنے انجام سے آگاہ تھا لیکن انجام قریب آتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ دن میں ایک بار وہ آدمی منہ اور سر رسالوں میں لپیٹے اندر آتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول اور دوسرے کے ہاتھ میں دو روٹیاں اور دال کی پلیٹ ہوتی تھی جو اُس کے سامنے رکھ دی جاتی تھی پھر اُس کے گھڑے سے میں پانی ڈالا جاتا تھا اور یہ آدمی باہر سے تالا لگا کر چلے جاتے تھے۔

اس تمام عمل کے دوران کمرے میں ہولناک سی خاموشی طاری رہتی تھی۔ انسپکٹر خالد کو ان دونوں کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں اور وہ ان آنکھوں کو بڑی غور سے دیکھتا رہتا تھا لیکن دماغ میں کوئی ایسا چہرہ نہ آتا تھا جس کی یہ آنکھیں ہوں۔ وہ راولپنڈی اور مری کے تمام بدمعاشوں، عادی مجرموں اور چربیوں جرائم پیشہ کی آنکھیں پہچانتا تھا لیکن یہ آنکھیں اس کے لیے اجنبی تھیں۔

"وہ مجھے قتل کیوں نہیں کرتے؟ مجھے کس طرح مشتعل کرنا چاہتے ہیں؟ کب قتل کریں گے؟" — اُس نے پہلے روز بھی یہی تھیں اور وہ ان آنکھوں کو بڑی غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ مگر آج کی سوچ میں اسے اپنے انجام کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ آج تمام دن اسے کھانا دینے کوئی نہیں آیا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی اور وہ بھوکا تھا۔ گھڑے سے پانی بھی نہیں تھا اور وہ پیاس کی تلخی محسوس کر رہا تھا۔

شاید یہی اس کا انجام تھا۔ وہ لوگ اسے بھوکا پیاسا مارنا چاہتے تھے۔ اس بھیانک انجام سے وہ لرز اٹھا۔ اور دل ہی دل میں دعا کی — "یا خدا! انہیں ہدایت دے کہ وہ مجھے ریوالور یا خنجر سے قتل کر دیں۔ یوں تڑپا تڑپا کر نہ ماریں۔"

وہ جسم میں کمزوری سی نقاہت محسوس کرنے لگا کہ خدا اور اندھیرے میں رہ کر جسم کا وقت زائل ہوتی جا رہی تھی۔

خدا نے اس کی دعا سن لی تھی۔ اُس کے قید خانے سے تھوڑی ہی دور تین آدمی اخروٹ کے پیڑ تلے کھڑے اُسے آج رات ٹھکانے لگانے کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ایک آدمی تو وہی تھا — مسٹر رائی — جو پراپیرٹی مرا خر سانی کے بھائے میں خالد کو یہاں لے آیا تھا۔ اُس کے چہرے پر دین تھا جو اُس روز تھا جس روز وہ انسپکٹر خالد کو ٹھکانے میں ملا تھا۔ سلیقے سے تراشی ہوئی مونچھیں، ہمراہ ڈھی، وہ تھوڑے پر وہی چشمہ جو اُس کے چہرے کو اور زیادہ پُر رعب بنائے ہوئے تھا — وہ آج گھوڑ سواری کی بجائے پہنے ہوئے تھا اور سر پر ہیٹ کیپ تھی۔ وہ جس کی جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا اور اس کی انگلیاں جیب میں پڑے ہوئے چھوٹے سے پستول سے کھیل رہی تھیں۔

"مگر تم دونوں کو ایک ہی رات سنبھال نہ سکو تو ابھی بتا دو" — وہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ "ایک آج اور دوسرے کو کل سہی۔"

"کیا باتیں کرتے ہو استاد" — ایک آدمی نے کہا — "ایک رات میں ہم دو گھر توڑ کر ایک قتل بھی کر سکتے ہیں تو کیا وہ ادھ موئے آدمیوں کو ٹھکانے لگانا مشکل کام ہے؟"

"پہلے اُدھر پیچھے چلو" — رائی نے کہا — "تینوں چلتے ہیں۔"

"نہیں" — دوسرے آدمی نے فیصلہ کیا — "تم دونوں اُدھر جاؤ، میں ٹھانیدار کی خبر لیتا ہوں۔"

"لاش وہیں رہنے دینا" — رائی بولا — "وہ مری کی لاش بھی وہیں رہے، کل اِدھر اُدھر کر لیں گے۔"

"تو میں چلا" — ایک نے کہا — "تم دونوں اُدھر جاؤ۔" اور وہ چل پڑا۔

"کوشش کرنا پستول نہ چلے" — رائی نے نصیحت کی — "خنجر سے کام ہو جائے تو اچھا ہے۔"

رائی دوسرے آدمی کو ساتھ لیے ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چل پڑا اور ان کا ایک ساتھی اُس مکان کی سمت ڈھلان چڑھنے لگا جہاں انسپکٹر خالد قید تھا۔

انسپکٹر خالد سامنے دروازہ کھلنے کا منتظر رہا تھا لیکن اب مایوس ہو کر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ رکھے اس مختصر سے عرصے میں فرار کی ترکیبیں سوچتا رہا تھا جس کمرے میں وہ قید تھا، اس کے دو دروازے تھے۔ کھڑکی اور روشندان، ایک بھی نہ تھا۔ دونوں دروازے باہر سے مقفل تھے۔ فرار کی ایک ہی صورت تھی کہ جو وہ آدمی اُسے ہر روز کھانا دینے آتے ہیں اُن سے اُلجھ جائے لیکن وہ ریوالور سے مسلح تھے اور وہ جتنی دیر وہاں رہتے تھے ریوالور اُس پر تانے رکھتے تھے۔

آج رات اُس نے طے کر لیا کہ اب مرنا تو ہے ہی پھر بھوکا پیاسا کیوں مرا جائے؟ کیوں نہ پستول کی گولی کو دعوت دی جائے۔ اُس کے جسم میں وہ دم خم نہیں رہا تھا جو قید سے پہلے ہوتا تھا۔ تاہم اُس نے ملدر کیا کہ رات کو تو شاید کوئی نہ آئے۔ اگر کل آ گئے تو وہ اُن پر ٹوٹ پڑے گا۔ اگر بزدلی نکل گئی تو اچھا، اگر مر ہی گیا تو بھی اچھا ہو گا۔

موت کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے سے اُس کے تھکے ہارے اعصاب تازہ دم ہو گئے اور اس کے دل پر جو بوجھ تھا وہ اُتر گیا۔ اس رات کو زندگی کی آخری رات سمجھ کر وہ دروازے کے ساتھ دیوار کے سہارے بیٹھ گیا اور اُس کا ذہن عمر رفتہ کی حسین یادوں سے اُس کا دل بہلانے لگا۔ اسے بھولی بسری باتیں یاد دلانے لگیں۔

یادوں کی دلکشی اسے جانے کتنی دور پیچھے لے گئی تھی کہ اسے آہٹ سنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا۔ خالد نے رات کی دنیا سے ایک ہی جست میں نکل آیا اور اس کا دل یوں دھڑکنے لگا جیسے وہ مر گیا ہو اور اس پر مقدمہ

www.paksociety.com
Bilal Azeem Paksitanipoint

تعمیر کر دیا گیا ہو۔ اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز اُسے موت کے پیروں کی چاپ کی طرح سنائی دینے لگی۔ موت کے تصور سے اس کا وُجود تاول اُبھر آیا اور اس کا خون کھولنے لگا۔

وہ سرکر کر اُڑ کے ساتھ ہو گیا۔ باہر سے پہلے تالا کھلنے کی پھر خشخشی کھلنے کی آواز آئی کواڑ کھلے اور ٹارچ کی روشنی چمکی۔ ایک آدمی کمرے میں داخل ہُوا۔ اچکڑ خالد کو چھپے کسی نے کہ دیا ہے ۔ ابھی ورنہ بھی نہیں ۔

وہ آدمی ابھی دو تین قدم ہی آگے گیا ہو گا کہ خالد پیٹھ پیٹھے لپکا اور اُسے دونوں ٹخنوں سے پکڑ کر زور سے پیچھے کھینچا۔ وہ آدمی اوندھے منہ گرا۔ خالد نے اچھل کر دونوں گھٹنے اس کی پیٹھ میں گاڑھ دیئے۔ اس آدمی کے سر پر صافہ تھا۔ خالد نے صافہ پرے پھینک کر اس کے بالوں کو مٹھی میں لے لیا اور اُس کا ماتھا زور زور سے فرش پر مارنے لگا۔

خالد کو خدشہ تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا کوئی دوسرا ساتھی اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دے گا یا پستول داغ دے گا لیکن خنجر چلانا پستول، کیونکہ یہ آدمی اکیلا تھا۔ ٹارچ جو اس آدمی کے ہاتھ سے گر پڑی تھی، فرش پر دو تین گز دور پڑی جل رہی تھی۔ اس سے کمرہ روشن ہو گیا تھا۔

وہ آدمی تازہ دم تھا۔ خالد کے گھٹنوں سے نکل آیا۔ خالد کا دام اتنی سی لڑائی سے ہی اکھڑ چلا تھا اور وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اس آدمی نے ناف سے خنجر نکال لیا لیکن وہ خنجر نیام سے نکال ہی رہا تھا کہ خالد نے اس کے منہ پر بھرپور گھونسہ مارا۔ وہ آدمی لڑھکا اور کمر دیوار سے ٹکرا یا اور گر پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے دُور جا پڑا۔ خالد خنجر پر لپکا تو اس آدمی نے اچھل کر اس کے پہلو میں دولتی ماری۔ خالد گرا اور فرش پر لڑھکتا ہی چلا گیا۔ اسے یوں محسوس ہُوا جیسے پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں اور اب وہ اُٹھ نہ سکے گا۔

وہ اُٹھ ہی رہا تھا کہ خنجر کا گہرا وار اُس کی جنس کی ہڈی کے قریب کندھے میں اتر گیا۔ اس وار نے خالد کی تھکی ماندی اور دھکی ہوئی قوتیں بیدار کر دیں۔ اس نے خنجر پڑتے ہی اس آدمی کے خنجر والے ہاتھ کی کلائی مضبوطی سے پکڑلی اور دھوبی پٹڑا مارا۔ وہ آدمی خنجر کو خالد کے کندھے میں ہی چھوڑ کر سامنے گرا۔ اس کے وزن اور اپنے جھٹکے سے خالد کے گھٹنے فرش پر لگ گئے تھے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور حریف کی کنپٹی پر ٹھڈا مارا۔ ساتھ ہی اپنے کندھے میں اُترا ہوا خنجر کھینچ کر نکالا۔ درد کی ٹیس سے اسے غشی آنے لگی لیکن وہ سنبھل گیا۔ خنجر اب اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے اُس کا حوصلہ تر و تازہ ہو گیا۔ اُس نے اس آدمی پر وار کیا لیکن وہ اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور وار خالی ہو گیا۔

خالد نے کندھے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر حملہ کیا تو حریف نے بازو پر لیا۔ خنجر اس کے بازو کے پٹھے میں اُتر گیا لیکن خالد کو یوں لگا جیسے یہ وار اس کے اپنے بازو پر پڑا ہو۔ کندھے کا گہرا زخم اس قدر شدید جھٹکوں سے درد کرتا تھا۔

خالد کا خنجر اس کے حریف کے بازو میں اترا تو حریف نے ایک ہاتھ سے خالد کی کلائی ہو

ہاتھ سے خنجر کے دستے کو گرفت میں لے لیا۔ خالد کو زخمی کندھا تیزی سے معذور کتا جا رہا تھا اور خون بہ جانے سے جسم سے جیسے جان نکلتی جا رہی تھی۔ اس نے حریف کی ناک پر سر کی ٹکر ماری تو وہ پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی خالد نے اس کے ناف کے نیچے لات ماری۔ وہ آدمی اس ضرب سے دوہرا ہو گیا۔ خالد نے خنجر کھینچا اور جھکے ہوئے حریف کے نیچے سے بھرپور وار کیا۔ خنجر اس کی پسلیوں میں دو بنک اُتر گیا۔ وہ سیدھا ہو گیا اور لڑکھڑایا۔ خالد نے خنجر کا دستہ پکڑ کر اس کو اس کی رگوں کے قریب سے پھیر دیا۔ اس کے ہاتھ سے خنجر گر رہا تھا جب خالد نے جسم کا سہارا دے کر لگا کر زور لگا کر تسلہ وار کیا۔ خنجر دستے تک حریف کی ریڑھ کی ہڈی کا نلنا جسم میں اُتر گیا۔

خالد کو غشی آنے لگی تھی لیکن وہ ابھی خطرے میں تھا۔ کمرے سے جلدی نکل جانا لازمی تھا۔ اسے اپنی موت یقینی دکھائی دے رہی تھی کیونکہ کندھے کے زخم کی وجہ سے خون بہ گیا تھا لیکن وہ مرنے سے پہلے تھانے پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے جانشینوں کو کچھ بتانے کے مرنا چاہتا تھا۔ وہ انہیں سفید پوشیں رازی سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔

اُس نے ٹارچ اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ باہر کی فضا نے اس کے ہوش سنبھال لیے لیکن کندھے سے خون تیزی سے بہ رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ زخم پر رکھ لیا اور ڈگمگاتے قدموں سے ڈھلان اُترنے لگا۔ سامنے کی چاندنی نکھری ہُوئی تھی۔ وادی کا تو تہ تہ نظر آ رہا تھا۔ خالد کو چکر آیا اور وہ پیل کے تنے سے سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ چلیتے ہی اسے غشی محسوس ہونے لگی اور اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ اس نے جسم کو جھٹکا دیا اور یوں اُٹھ کھڑا ہُوا جیسے موت کا چیلنج قبول کر کے میدان میں کودا ہو۔

اُس کا سر ڈال رہا تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ ٹانگیں اور بلیں اس کی راہ روکے کھڑی تھیں۔ پتھروں سے پاؤں پھسلتے تھے۔ درختوں سے گرے پتے شبنم سے تر ہو رہے تھے اور پاؤں جمنے نہ دیتے تھے۔ خالد کے کندھے سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ بھوک نقاہت میں اضافہ کر رہی تھی۔ ٹانگیں بوجھ جسم کو گھسیٹنے سے معذور ہُوئی جا رہی تھیں۔ آگے، پیچھے، دائیں بائیں گھنا جنگل تھا اور رات کے خشک سکوت میں جنگل کی آوازیں تیر رہی تھیں۔ پتوں کی سرسراہٹ، سال، سال اور گیدڑوں کی ماؤ ہُوں اسے موت کی سسکیاں اور بدروحوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہر چند قدم پر ایک سانپ رینگتا اس کے قریب سے گزر جاتا تھا اور خالد ہر قدم پر پھسلتا تھا اور ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل خود کو اپنا جسم گھسیٹتا تھا۔ راستے کا اسے اندازہ سا احساس تھا۔ وہ اسی دھندلاہٹ میں چلا جا رہا تھا۔

جانے کتنی دیر گزری ہو گی جب وہ ایک پہاڑی راستے پر چڑھ رہا تھا۔ اسے ذرا زیادہ ہمت تھا کہ وہ اسی راہ پر وادی کے ساتھ آیا تھا اور شاید یہی وہ راستہ ہے جو پہاڑی پر جا کر دوسری طرف گھوم جاتا ہے اور اس کے نیچے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem

ایک ندی بہتی ہے۔

چڑھائی چڑھنا آسان نہ تھا۔ وہ بلیدہ گیا اور ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلنے لگا لیکن زخمی کندھے والا بازو وزن اٹھانے سے معذور تھا۔ درد کی ایسی بے رحم ٹیس اٹھی کہ خالد نے محسوس کیا جیسے زخم اور زیادہ کھل گیا ہو، یا بازو ہی جسم سے الگ ہو گیا ہو۔ اس نے وہ بازو سینے سے لگا لیا اور ایک ہاتھ اور گھٹنوں کے بل رینگنے لگا۔ نوک دار پتھروں، راہ میں بکھری ہوئی خاردار بیلوں اور جھاڑیوں نے اس کے ہاتھ کی ہتھیلی اور گھٹنے زخمی کر دیئے۔ وہ اٹھا اور ایک چیل کے پیڑ کے سہارے موت کی کٹھن مسافت کا ایک ایک انچ فتح کرتے کرتے طے کرنے لگا۔ اسے ندی کا خیال آیا تو پیاس کی تلخی اور بڑھ گئی اور وہ ذرا تیزی سے چلنے لگا۔

مری کا تھانہ تو ابھی بہت دُور تھا جو اُس کے لیے عمر بھر کی مسافت تھی لیکن ندی جو پہاڑی کے دُوسری طرف بہہ رہی تھی، اسے اُفق جتنی دور محسوس ہونے لگی۔ دُوری کے احساس سے اس کا دل ڈوب گیا۔ اس نے ایک پیڑ کے تنے کا سہارا لیا، اسے چکر آیا اور وہ دھڑام سے بیٹھ گیا۔

رازی ایک ساتھی کو خالد کے قتل کے لیے بھیج کر دوسرے ساتھی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا جس قسم کے ویران مکان میں اُنہوں نے خالد کو قید کیا تھا، ایسے ہی ایک اور کھنڈر نما مکان میں جو بہت کی ترائی میں درختوں کے گھنے جھنڈ اور گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا، اُنہوں نے سمین دوکاندار کو قید رکھا تھا۔ اُس وقت رازی اور اُس کا ساتھی سمین کو قتل کر چکے تھے اور رازی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا:

"جس لاش کا خاتمہ ہو چکا ہو گا۔ وقت بہت ہے۔ لاش آج ہی ٹھکانے لگ سکتی ہیں۔"

"ایک ہی بوری میں بند کر کے کار کی ڈگی میں ڈالتے ہیں۔" — اس کے ساتھی نے کہا تھا۔ "رات ہی رات راول جھیل میں پھینک آتے ہیں۔ جیلو کل کا دن پنڈی میں گزاریں گے۔"

رازی کھل کر مسکرایا اور بولا۔ "چلو ہم بھی راول ٹوم سے فائدہ اٹھا لیں۔ جگہ موت نے دیا ہے۔ ہم ایسے ہی تو بناتے ہیں۔"

جب وہ دونوں انسپکٹر خالد کے قید خانے میں داخل ہوئے تو وہاں موت کا سناٹا تھا۔ رازی جمائے کو آوازیں دیں لیکن گیدڑوں کی چیخ و پکار کے سوا اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ کمرے میں گئے تو ٹارچ روشن کی، دیکھا جمائے کی لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ فرش پر خون بہا خون تھا اور خالد لاپتہ۔

دونوں دوڑ کر باہر آئے۔ رازی نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ زمین پر خون کے دھبے تھے کے کندھے سے خون بازو سے بہتا ہاتھ کی راہ نیچے گرتا رہا تھا۔ انہوں نے آگے خون کے قطرے دیکھے اور وہ ٹارچ کی روشنی میں خون کے قطروں کو دیکھتے تیزی سے چلنے لگے۔ خالد لاپتہ

تھا لیکن غم بے ہوشی کی حالت میں اسے خیال تک نہ تھا کہ وہ اپنے پیچھے نمایاں نقوش چھوڑتا جا رہا ہے۔

خالد ندی سے دُور ہی تھا۔ پہاڑی راستہ اسے دوسری طرف لے گیا تھا گڑھنگیں جواب دے گئی تھیں اور وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ ندی تک بھی نہ پہنچ سکے گا۔ اس نے ایک بار پھر جسم کی تمام مجروح قوتیں یک جا کیں اور چند قدم تیز تیز اُٹھائے لیکن سنبھل نہ سکا اور ایک جھاڑی میں گر پڑا۔

رازی کی ٹارچ کی بھیانک روشنی پتھروں، گھاس اور جھاڑیوں پر خون کے دھبے تلاش کرتی تیزی سے بڑھتی آ رہی تھی۔ جب خالد پہاڑی کے اُس طرف گر پڑا تھا، اُس وقت رازی پہاڑی کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا اور بہیت تاک تیزی سے راستے کی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔

نیچے ندی میں جمیل نہا کر نکل رہا تھا۔ وہ تو رات کا راہی تھا۔ دن کو چھپا رہتا تھا اور رات کو باہر نکلتا تھا۔ آج رات بھی وہ ندی سے نہا کر پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اوپر کی جھاڑیوں، ٹڈی زور سے میں جیسے کسی نے انہیں جھنجھوڑا ہو۔ اس نے سوچا کوئی جانور بھاگتا جھاڑیوں سے نیچے اتر رہا ہے یا گر رہا ہے۔

انسپکٹر خالد اُوپر سے لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔ وہ جھاڑی پر گرا تھا اُٹھنے اُٹھنے مجبور کو سنبھال نہ سکا اور پھر گرا اور لڑھکتا نیچے آ گرا۔ اس نے تاریخ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ جمیل چاندنی میں اسی قدر جان سکا کہ کوئی انسان ہے۔ وہ چیل کے تنے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اوپر دیکھا، اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے وہ کوئی انسان نظر نہ آیا۔ خالد کراہ رہا تھا اور اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمیل اوٹ سے ایک ہی جست میں اس تک پہنچا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پتوں سے چھن چھن کے آتی چاندنی میں اُس نے پہچاننے کی کوشش کی۔ تاریخ کی روشنی میں دیکھا۔

"کون ہو؟" — اُس نے پوچھا۔

"انسپکٹر خالد" — خالد نے کراہتے ہوئے کہا اور وہ چونک کر بولا — "اور تم؟ ... تم جمیل تو نہیں؟"

"تمہارا ہمدرد صاحب؟" — جمیل نے حیرت سے کہا — "تم؟ ... مگر وہ بوکھلاہٹ اور ہیجان میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

خالد پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ اس نے جمیل پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور کراہتے لہجے میں بولا — "تم میرے مغفور ملزم ہو! ... وہ ہاری ہوئی سنسنی جنس پڑا۔ کہنے لگا "کاش، مجھ میں ذرا سی سکت ہوتی ... بایوں بے کسی میں تیرے ہاتھوں نہ مرتا ... میرے دوست! انتقام لے لینے ایک کر کر کر کر کر مجھے ٹرک کے سڑی لاش سڑک پر پھینک دینا جہاں سے کوئی اُٹھا کر تیرے بیوں تک پہنچا دے۔ آفتاب لاش کی طرح گم نہ کر دینا۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"تمہارے دارجی!" — جمیل نے کہا۔ "میں کسی کا قاتل نہیں ... تمہیں کیا ہوا ہے؟ مجھے معلوم ہے زگرہ ہو گئے تھے۔"

"تم جانتے ہو دوست مجھے کیا ہوا ہے؟" — خالد نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "تم سب کچھ جانتے ہو۔"

جمیل نے اس کی قمیض کھولی۔ خون سے لال سرخ ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھا جاگ کر نمدی پر گیا اور چلو میں پانی بھر لایا۔ چلو خالد کے منہ سے لگا کر بولا۔ "میں تمہیں زندہ رہنا ہے۔ چلو اب تمہیں پہنچا دوں گا۔ خدا تو میں جسم کچھ ہی ہو۔"

خالد کے پیٹ میں پانی کے چند قطرے گئے تو اس کی پیاس اور بھڑک اٹھی۔ بیتاب ہو کر بولا۔ "پانی ... پانی ... اور اس کا سر کو منے لگا۔

جمیل نے اس کا سر تھام لیا اور اسے سہارا دے کر اُٹھا دیا۔ وہ اس پر اپنی جھکا ہی ہوا تھا کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ سعالجہ دارغ روشن ہوئی اور کوٹھی جمیل نے چونک کر دیکھا۔ رازی اس کے قریب پستول تانے کھڑا تھا۔ اس کا ساتھی اس کے ساتھ تھا۔ شفاف چاندنی میں دونوں کے چہروں کا ایک ایک خط دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاتھ" — رازی نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "ایک ہی ساتھ دو شکار — جمیل خالد کے پاس بیٹھا اور اوکا مانہ لہجے میں کہہ رہا تھا — "انسپکٹر صاحب کو ہمارے حوالے کر دو اور اپنے آپ کو بھی ہمارے سپرد کر دو۔ قاتل کی تلاش میں انسپکٹر صاحب خود قاتل بن گئے ہیں۔ ہم انہیں وہیں جا کر سزا دیں گے۔ موت دیں گے جہاں یہ قتل کر کے بھاگے ہیں۔"

"سالے نوسر باز" — خالد نے کراہتی آواز میں کہا۔ "جسم میں ذرا سا بھی دم ہوتا تو ... لیکن تقاضا نے اسے بولنے نہ دیا۔

"صاحب بہادر!" — جمیل نے دہاتی سے لہجے میں کہا۔ "یہ تو پہلے ہی مر رہا ہے۔ لے جا آپ ہی لے جائیں چلیں میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

صورت حال جمیل کی سمجھ سے باہر تھی۔ اُسے اس قدر معلوم ہو سکا کہ یہ دو آدمی انسپکٹر خالد کو مار دینا چاہتے ہیں۔ وہ پستول سے دُکر خالد کو ان کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ کر بھی نہ سکتا تھا۔ خود وہ ساہو آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔ اس نے رازی کی طرف جھک پھیر لی۔ اور خالد کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اس کی جگہ مجھے قتل کر دو۔ اسے بخش دو۔ بال بچے والا آدمی ..." اور وہ بولتے بولتے بجلی کی طرح سے گھوما اور دوسرے لمحے اس کے دونوں ہاتھ رازی کے پستول والے ہاتھ کو شکنجے میں جکڑ چکے تھے۔

جمیل نے زندگی میں دو دفعہ پستول دیکھا تھا۔ چھوا بھی نہیں تھا نہ اُسے علوم تھا کہ گولی کیسے چلتی ہے۔ رازی نے اپنے ہاتھ کو آہنی شکنجے میں محسوس کیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ جمیل کی انگلی بھی اس

والی انگلی پر جم گئی۔ رازی کا ساتھی ایسا ساچوکا نکال کر جمیل کی طرف لپکا تو جمیل بچنے کے لیے رازی کے پیچھے ہو گیا۔ اس کوشش میں جمیل کو بے تحاشہ زور لگانا پڑا کیونکہ رازی اسے سامنے ہی رکھنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ اسی میں جمیل کی انگلی پر اس قدر دباؤ آ گیا کہ رازی کی انگلی بھی دب گئی اور پستول چل گیا۔ دھماکے سے جمیل تو لرز گیا لیکن گولی رازی کے ساتھی کے سینے سے پار ہو گئی اور وہ چکرا کر گرا پھر اُٹھ نہ سکا۔

رازی اس کوشش میں تھا کہ پستول کی نالی جمیل کی طرف کر سکے لیکن جمیل کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اس نے رازی کا بازو اوپر کر لیا اور اس کا بازو کہنی سے اپنے کندھے پر رکھ کر ہاتھ پر زور دیا تو رازی اس کے کندھے کے اوپر سے ہوتا ہوا نظر آیا۔ کھا کر جمیل کے سامنے گرا۔ وہ بڑی پھرتی سے اُٹھا۔ ہاتھ کا جمیل نے اس کے منہ پر پھر پور ٹھڈا مارا۔ اس کی پہلی چپل کے ایک انچ موٹے تلے کے نیچے نے رازی کے ایک چہرے کو بلا دیا۔ وہ پھر گرا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ جمیل کے لیے پستول بے کار تھا۔ اس نے جست لگائی اور رازی کو دبوچ لیا۔

انسپکٹر خالد لیٹا ہوا تھا۔ وہ اٹھا اور لپک کر ایک وزنی پتھر اٹھایا لیکن رازی جمیل کی اوٹ میں تھا۔ رازی کے جسم میں طاقت تھی۔ وہ جمیل کی گرفت سے نکل آیا لیکن جمیل نے پیچھے ہو کر اپنا ایک بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور بازو کو دبانے لگا۔ رازی بازو کے پھندے سے نکلنے کے لیے تڑپنے لگا۔ اس نے جمیل کے بازو کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اوپر دبایا اور گردن نیچے کھینچنے لگا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ جسم کی پوری طاقت صرف کر رہا تھا۔ جمیل کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ رازی کو وہ اسی شکنجے میں ہی ختم کر دے گا لیکن رازی میں کچھ زیادہ ہی طاقت تھی۔

آخر رازی نے جمیل کا بازو ڈھیلا کر ہی لیا اور گردن نیچے کھینچ لی۔ اس کوشش میں اس کے گھٹنے زمین سے لگ گئے۔ اس نے گردن تو جمیل کے بازو کے پھندے سے کھینچ لی لیکن اس کی داڑھی، ہیرپٹ کیپ اور سر کے بالوں کا ایک گچھا سا جو ہیرپٹ کیپ کے ساتھ تھا جمیل کے بازو میں اٹکا رہا۔ جمیل ہونکا رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے جو آدمی کھڑا تھا، وہ کار دار تھا۔ اور اس کی داڑھی سر کے بال اور ہیرپٹ کیپ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ کار دار کا بہروپ تھا جو اتر گیا تھا۔

انسپکٹر خالد کے پاس ماچس تھی۔ اس نے حادثی لو فی شبہ نہ رہا۔ وہ کار دار ہی تھا۔ اس کا بہروپ جمیل کے ہاتھ میں تھا اور اس کا گلوبند بھی غائب ہو چکا تھا۔

"کون ہے؟" — انسپکٹر خالد نے نحیف آواز میں کہا۔ "کار دار؟"

کار دار نے گھبرا کر اُدھر اُدھر دیکھا۔ وہ شاید دیکھ رہا تھا کہ پستول کہاں پڑا ہے۔ جمیل کو پستول نظر آ گیا۔ وہ اُدھر کو دوڑا تو کار دار بھاگ اُٹھا۔ جمیل اس کے تعاقب میں گیا لیکن کار دار چند چھلانگوں میں جمل میں غائب ہو گیا۔ جمیل جنگل کی دوڑ میں کم تھا لیکن اسے خالد کا خیال آیا۔ وہ لوٹ آیا اور پستول خالد کو دے کر کہا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

—تھانیدار جی! آپ ریوالور چلا سکتے ہیں نا؟ اسے تیار کہیں۔

اس نے اپنی قمیص اتاری، خالد کا زخم دیکھا اور قمیص اس کے زخم پر لپیٹ دی۔ پھر اسے کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ دکان کا بار بردار تھا۔ سو من وزن اٹھا سکتا تھا۔ وہ چل پڑا مگر جنگل میں موت کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ انسپکٹر شاہ اور انسپکٹر حمید اللہ خان تھانے میں موجود تھے۔ بیڈ کانسٹیبل اور تین سپاہی بھی تھے۔ رات کے پہلے پہر بازار بند ہونے کے فوراً بعد وہ آدمی لوٹ بازار کی ایک دکان کا تالا توڑنے موقعہ پر پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے وہ آدمیوں کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ یہ ایک عام قسم کا کیس تھا لیکن پولیس والے اسے آفتاب کے قتل اور انسپکٹر خالد کے اغوا کی وجہ سے بہت اہمیت دے رہے تھے اور ملزموں سے بڑی جانفشانی سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ایک ملزم نے بازار کی چند باتیں بتا دی تھیں لیکن انسپکٹروں کو شک تھا کہ اس نے پورے کا صرف ایک کونا اٹھایا ہے اور باقی باتیں ہضم کر رہا ہے وہ تمام باتیں اگلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

سب کی نظریں یک بارگی دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ انسپکٹروں کے ہاتھوں پر اکتاہٹ کے شکن پیدا ہوئے۔ سوچا۔ لو ایک اور کیس آ گیا ہے۔ ایک آدمی ایک زخمی کو کندھے پر اٹھائے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ جمیل تھا جو خالد کے بوجھ تلے دہرا ہو کر کراہ رہا تھا۔ اس کا پسینہ ٹپک رہا تھا۔ کوئی بھی انہیں پہچان نہ سکا کیونکہ انہیں کوئی پہچاننا چاہتا ہی نہ تھا۔ وہ پہلے کیسوں میں بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

جمیل نے خالد کو انسپکٹر کی میز پر لٹا دیا اور بیدھا ہوا۔

"جمیلا" — بیڈ کانسٹیبل نے ہڑبڑا کر کہا — "مفرور ملزم"

"یہ تو انسپکٹر خالد ہے" — انسپکٹر حمید نے کہا۔

ایک سپاہی نے لپک کر دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ دوسرے نے دوسرا دروازہ بند کر دیا۔ دونوں انسپکٹر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرے میں پراسرار سناٹا پیدا ہو گیا۔ سناٹا چھا گیا۔

"دیکھنے کیا ہو" — جمیل نے بازو سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میرا رہا ہے۔ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ جلدی کرو۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ بکواس"

ایک کانسٹیبل نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ دوسرے نے اس کی بغلی اور بیڈ کانسٹیبل نے "حوالات میں بند کر دو۔ حوالات میں تھی تھلکڑ پن نکال کے رکھ دو"

"میں" — خالد نے بے ہوشی کی حالت میں کمزور آواز میں کہا — "نہیں ہوں۔ اسے۔ کار۔ ... کی کوٹھی۔ خبردار۔ تھانے کو کسی آدمی کو نہ بتانے دینا۔ کسی کو نہ ملنے دینا۔ ڈپٹی کمشنر کو بھی نہیں۔ سیلوفر کو بھی نہیں۔ اسے لیا ... ت کی

بو جھیلا ملزم نہیں یہ ہمارا گواہ ہے..... مجھے ہسپتال لے چلو۔ وہیں بیان دوں گا۔ میں..... میں..... تھوڑی بر زندہ ہوں گا..... میرے گھر اطلاع..... اور اس پر غشی طاری ہو گئی۔

ڈی۔ ایس۔ پی کو فوراً بلا لیا گیا۔ اس نے انسپکٹر خالد کو اسی وقت ہسپتال بھجوا دیا اور جمیل کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

صبح تک خالد کو آکسیجن میں رکھا گیا۔ زخم سی دیا گیا اور خون کی چند ایک بوتلیں اس کے جسم میں ڈال دی گئیں۔ وہ باتیں کرنے کے قابل ہو گیا۔ انسپکٹر شاہ اور انسپکٹر حمید اس کے پاس بیٹھے تھے۔ خالد نے طویل بیان لکھوایا جس میں اس نے کار دار کے متعلق تمام تر تفصیلات بتائیں کہ کس طرح وہ رازی کے کامیاب شرپ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پھر قید کے دوران اس پر کیا بیتی اور وہ کس طرح قید سے آزاد ہوا۔ جمیل کے جنگل میں اچانک مل جانا، کار دار کا بہروپ اتر جانا اور جمیل کا خالد کو بچانا اس کے بیان کا اہم ترین حصہ تھا۔ خالد نے آنکھوں کی حقیقت بتائی اور وثوق سے کہا کہ آفتاب کا قاتل کار دار ہی ہے۔

سی۔ آئی۔ اے کے سپیشلسٹ تیزی سے جمل پڑی۔ انہوں نے کار دار اور سیلوفر کی کوٹھیوں پر رات ہی پہرے لگا دیئے تھے۔ کار دار کی کوٹھی میں ملازموں کے سوا کوئی نہ تھا۔ پولیس نے کوٹھی سیل کر دی اور ملازموں کو تھانے لے گئے۔

تھانے میں ٹیلیفونک سی سی ٹی وی تھی۔ تمام تر فوری تیاری کی حالت میں تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی ایک بات ٹیلیفون پر کرتا اور کرتی رہتی انسپکٹروں سے کرتا تھا۔ اسے ہر طرف سے یہی خبر ملتی تھی کہ کار دار کہیں نظر نہیں آ رہا۔ اس کی لال سپورٹس کار کا بھی کہیں کھوج نہیں مل رہا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے رات ہی مری کی گرفتاری کی روی تھی۔ رات جمیل نے بیان دے دیا تھا جس کے کئی حصے تصدیق طلب تھے لیکن کار دار کے متعلق بھی شک نہیں رہا تھا۔

ڈی۔ ایس۔ پی رات سے مسلسل کام کر رہا تھا۔ حکم اور ہدایات دے رہا تھا۔ فون کر رہا تھا، سن رہا تھا۔ اس نے سیلوفر کی کوٹھی کا نمبر ملایا۔

"مسز آفتاب" — اس نے کہا۔ "آپ کے انکل کا پروگرام اٹھ گیا ہے۔ آپ گھر میں ہی ہیں..... ہاں ہاں۔ یہ بامروی کانسٹیبل میں نے ہی بھیجے ہیں..... کون؟ کار دار؟..... وہ روپوش ہے..... مل جائے گا۔ آپ محفوظ ہیں..... آپ گھر کیوں نہیں رہی ہیں۔ میں نے آپ کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ کو ایک برقع کو دینے والی بات نہ دوں — اور اس نے سیلوفر کو سنایا کہ جمیل رات کس طرح تھانے میں آیا ہے اس نے انسپکٹر خالد کے زخمی ہونے کا واقعہ سنا دیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے جمیل اور اپنے عملے کو ساتھ لیا۔ ایک فوٹو گرافر کو بھی ساتھ لیا ... ت کی

www.paksociety.com

واردات کے موقعہ پر چل پڑا۔ جمیل کو اُس ندی تک کا راستہ معلوم تھا جہاں وہ نہایا کرتا تھا۔ ندی سے ہی پرے ایک جگہ خون بکھرا ہوا تھا جیسے بکرا ذبح کیا گیا ہو۔ قریب ہی کار کا بہروپ پڑا تھا۔ مصنوعی داڑھی، مونچھیں، سر کے مصنوعی بال اور بیرٹ کیپ ــــ وہاں اس کے ساتھی کی لاش ہونی چاہیے تھی مگر نہیں تھی۔ کھاس پر صاف نشان تھے کہ لاش سمیٹ کر لے جائی گئی ہے۔ اس نشان کو دیکھتے آگے بڑھے تو غرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جگہ دیکھا۔ دو بھیڑیے اور دو تین گیدڑ لاش کو کھا رہے تھے۔ بھگا یا گیا گرلاش کا چہرہ بھی کھایا گیا تھا اس لیے پہچانا نہ جا سکا کہ کون تھا۔

"میں آپ کو اپنا ایک اور راز بتا دیتا ہوں" ــــ جمیل نے ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا اور کچھ دور اُوپر کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے بولا ــــ "میں وہاں چھپا رہتا تھا اور رات کو اس ندی میں نہایا کرتا تھا۔"

ڈی۔ ایس۔ پی جمیل کے ساتھ اوپر چلا گیا اور جمیل کی پناہ گاہ دیکھی۔ اس نے کہا ــــ "اس جگہ تک پولیس کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔"

جمیل کو معلوم نہ تھا کہ انسپکٹر خالد کہاں سے آیا تھا۔ خالد نے اپنے بیان میں اُس مکان کا محل وقوع بتایا تھا جہاں اُسے قید رکھا گیا تھا۔ خالد کو ہسپتال میں کم و بیش بیس روز رہنا تھا۔ وہ نشاندہی کے لیے نہیں آسکتا تھا۔ وہ مکان فوراً تلاش کرنا تھا۔ جمیل اسی قدر بتا سکا کہ خالد کہاں سے گرا تھا۔ خالد نے اپنے بیان میں اس مکان کے راستے کی تشریح کی تھی۔ پولیس اوپر گئی تو وہاں سے آگے کا راستہ تلاش کر نا مشکل نہ تھا۔ کوہان کے دھبے صبح کی تیز بارش نے دھو ڈالے تھے لیکن جیل کے تین چار پٹروں کے تسوں کے ساتھ جہاں خالد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رکا تھا خون کے کچھ نشان باقی تھے۔

گھنٹہ بھر کی سرگرمانی کے بعد وہ مکان مل گیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اپنے آدمیوں کو مکان کا محاصرہ کر لینے کو کہا اور خود ریوالور ہاتھ میں لے کر دبے پاؤں برآمدے میں داخل ہوا۔ آگے چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی اور اس سے ملحق ایک کمرہ جس کا دروازہ کھلا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی ذرا سی دیر دروازے کے ساتھ چھپا رہا پھر یکا کر اندر داخل ہوا۔ یہ خالی کمرہ تھا۔ اس کا ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی اس کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہاں ایک لاش پڑی تھی۔ ایک اُدھ بلاؤ اس کا ایک بازو بڑے مزے سے کھا رہا تھا چیونٹیوں نے لاش پر پھیل کر اسے ہر طرف سے سیاہ کر رکھا تھا۔

فرش پر ایک گڑھا کھدا ہوا تھا۔ پاس ایک بیلچہ اور کدال پڑی تھی۔ کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر پر قدموں کے نشان تھے اور ایسے ہی نشان دوسرے کمرے سے ہوتے ہوئے باہر چلے گئے تھے۔ مٹی تازہ تھی۔

ڈی۔ ایس۔ پی دوڑ کر باہر آیا اور سب سے کہا ــــ "ہمارے آنے سے ذرا ہی پہلے کوئی یہاں سے نکل کر گیا ہے۔"

"ایک اُدھ بلاؤ بھی نکل کے بھاگا ہے" ــــ ایک کانسٹیبل نے کہا۔

"نہیں" ــــ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ــــ "کوئی آدمی اس لاش کے لیے قبر کھود رہا تھا" ــــ اُس نے انسپکٹر سے کہا ــــ "مٹی پر جو گھڑے ہیں ان کا سولہ بنوانے کا انتظام کرو اور کل اور پیچھے کو انگلیوں کے نشانات کے لیے محفوظ کر لو۔ ان کے دستوں پر ہاتھ نہ لگانا۔"

ڈی۔ ایس۔ پی یہ باتیں باہر کھڑا کر رہا تھا۔ دور سے ایک ریوالور فائر ہوا۔ گولی سب کے درمیان سے گذر کر اسب اوٹ میں ہو گئے۔

مکان کے عقب میں پہاڑی تھی۔ دائیں اور بائیں دو نیکریاں اور درختوں کا گھنا جھنڈ اور سامنے کا علاقہ دور تک چلا گیا تھا جو سامنے کی پہاڑی کے دامن میں جا ختم ہوتا تھا۔ ڈی بائیں طرف کی ٹیکری سے آئی تھی۔ سب دبک کے اوٹ میں ہو گئے تھے لیکن ڈی۔ ایس۔ پی بے خوف اس طرف دوڑا۔ کے پیچھے رائفلوں سے مسلح دو کانسٹیبل دوڑ پڑے۔ وہ ٹیکری پر چڑھے تو انہیں دور جھاڑیوں کی اوٹ دو آدمی بھاگتے دکھائی دیئے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے ریوالور داغا لیکن وہ آدمی جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے۔ ڈی۔ ایس۔ پی۔ و کانسٹیبل تھوڑی دور تک گئے لیکن آگے گھنا جنگل اور اس میں ڈھکی ہوئی عمودی ایں تھیں۔ تعاقب آسان نہ تھا۔

ریوالور کی اس ایک گولی نے حوادث ایس۔ پی کی پارٹی [illegible] ونی تھی۔ [illegible] اس واردات کے ہم معمولی درجے کے نہیں اور وہ مطالبہ کریں گے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اس سے مطابق انتظامات کر دیئے۔ شام تک دونوں لاشیں [illegible] جو لاش وہاں مکان سے برآمد ہوئی تھی، اسے ایک جمیل نے پہچان لیا یہ کانسٹیبل [illegible] بات سے تعمیل ہوتا تھا اس نے [illegible] کہ آدمی گھر کے کنٹرول [illegible] اور سزا دلا [illegible] کانسٹیبل نے [illegible] اسے آفتاب کی بھی [illegible] سے ایک [illegible] عرض [illegible] کے کہا تھا کہ اس کی نوکری کر [illegible] ہے اور [illegible] کے [illegible] والیں جا رہا [illegible]

ڈی۔ ایس۔ پی نے [illegible] رات جمیل کو [illegible] لیا تھا [illegible] کی [illegible] خالد [illegible] سے ہو گئی [illegible] ڈی۔ ایس۔ پی [illegible] بہت جلد دی [illegible] تھا [illegible] بے حد [illegible] وف [illegible] اسے [illegible] پھر [illegible] کی [illegible] کے بغیر [illegible] نا [illegible] ہو سکتا تھا۔ اب دونوں لاشیں [illegible] گئیں" ڈی۔ ایس۔ پی نے [illegible] نہیں [illegible] کے [illegible] کے [illegible] اپنے کا [illegible] دے کر جمیل کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے کہا ــــ "وہ اپنا بیان ایک بار [illegible] دے۔ [illegible] اور تازہ بیانات میں فرق دیکھنا چاہتا تھا۔

[illegible] سے پھر وہی کہانی سنا دی جو پہلے سنائی تھی۔ اس سے ساجی کے بیان کی بھی تصدیق ہو گئی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

"تم ہم الات سے کیوں بھاگے تھے؟" ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"انگوٹھی کی وجہ سے۔" جمیل نے جواب دیا۔ "یہ ساجی کی عزت کا سوال تھا۔ میں یہ نہیں بتا چاہتا تھا کہ یہ انگوٹھی مجھے ساجی نے دی ہے۔ بتا دیتا تو اسے بھی آپ تھانے بلا لیتے۔ مجھے ڈر تھا کہ اتنی خوبصورت اور ایسی جوان لڑکی کے ساتھ تھانے والے اچھا سلوک نہیں کریں گے۔"

"تم یہیں کیوں چھپے رہے؟" ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔ "کافان ٹیوں نہیں چلے گئے؟"

"آپ کو بتا چکا ہوں کہ اپنی ماں کا انتظار تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میں ساجی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں اس سے جب بھی ملا یہی پوچھا کہ میری ماں آگئی ہے؟ پھر پوچھتا اسے پولیس یا کاروار کی طرف سے کوئی خطرہ تو نہیں؟ اگر کوئی ساجی کی عزت پر ہاتھ ڈالتا تو میں قتل سے بھی دریغ نہ کرتا۔ پھر میں ساجی اور اس کے دادا کو ساتھ لے کر غائب ہو جاتا۔ میں نے کاروار کو تو قتل کر دیا تھا جب پتہ چلا کہ نہ رہے تو مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔"

ڈی۔ ایس۔ پی نے اس پر بہت جرح کی۔ جمیل جواب دیتا جاتا تھا۔ وہ چونکہ مجرم نہیں تھا اس لیے اس کا ہر جواب واضح اور قابل قبول تھا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا لیکن یہ نہ بتایا کہ نیلوفر کے ساتھ بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی عزت کا اسے بہت خیال تھا۔

"آپ مجھے ساجی کے گھر تک نہیں جانے دیں گے؟" جمیل نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ کہنے لگا۔ "میری گھوڑی وہاں ہے اور..."

"ہاں، ہاں۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں... آج رات یہیں رہو کل صبح بتاؤں گا کہ آپ مجھے ابھی تک مجرم سمجھ رہے ہیں؟"

"جمیل تم جانگلی ہو۔" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "تم نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ تم مجرم نہیں ہو لیکن مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میری ضرورت کو تم نہیں سمجھتے۔ رات یہیں گزارو۔ میں تمہارے سونے کا انتظام کرا دیتا ہوں۔"

رات آئی تھانے میں دن کا منظر نہ رہا۔ ڈی۔ ایس۔ پی سویا نہ اس نے کسی کو سونے دیا۔ دن میں پولیس نے کئی جگہوں پر چھاپے مارے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں پر بھی چھاپے مارے گئے۔ دن کے گزرنے اور نواح میں بھی پولیس کے مخبر سرگرم رہے مگر کاروار کا کوئی سراغ نہ ملا۔

صبح طلوع ہوئی تو جمیل نے ڈی۔ ایس۔ پی سے گاؤں جانے کی اجازت مانگی۔ جمیل نے جو بات کر دکھایا تھا اس سے ڈی۔ ایس۔ پی اس سے بہت خوش تھا۔ وہ کاروار کو ابھی پکڑ نہیں سکا تھا لیکن یہ بھی جمیل کا ہی تھا کہ اس نے کاروار کو بے نقاب کر دیا اور پولیس کو ایک معمول کر دیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی

جان گیا کہ جمیل میں دیہاتیوں والی غیرت ہے اور عزم و جاسوسی کے ساتھ اس کا دوہرا کا بھی تعلق نہیں۔

"تم چلے جاؤ جمیل!" ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ "لیکن سوچ غروب ہونے سے پہلے آجانا۔ بارش ہو، طوفان ہو، گاؤں میں نہ رکنا۔ آجانا... اور ذرا اپنی ہوش رکھنا۔ تم خطرے میں ہو۔"

جمیل چلنے لگا تو انسپکٹر عبدالرحمان نے ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا۔ "اگر یہ گاؤں میں اکیلا گیا تو جہاں سے آدمی جو وہاں ہیں اور گاؤں والے لوگ اسے پکڑنے کے لیے اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اگر اسے وہاں بھیجنا ہی ہے تو ایک کانسٹیبل کو بھیج دیں جو سب کو اس کے متعلق بتا دے۔"

جمیل جب ایک دردی کانسٹیبل کے ساتھ گاؤں میں داخل ہوا تو گاؤں کے بچے نے نعرہ لگایا۔ "جمیلو ڈاکو پکڑا گیا... وہ دیکھو۔ سپاہی کے ساتھ آرہا ہے۔"

اس آواز کے ساتھ ہی گاؤں میں نیچے، اوپر، اس سے اوپر ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ "جمیلو پکڑا گیا... پولیس پکڑ لائی ہے۔"

گاؤں کے لوگ گلیوں کی سیڑھیاں دوڑ کر اترا و چڑھ رہے تھے۔ پولیس کے جوآدمی گاؤں میں ڈیوٹی پر تھے، دوڑے آتے۔ نمبردار منہ ہاتھ صابن کی جھاگ سر سے دھوئے بغیر باہر نکل آیا۔ عورتیں ٹبیاں چولہوں پر پھول کے نکل آئیں۔ تنور الی سے تنوں میں روٹیاں جل رہی تھیں لیکن وہ مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑی جمیل کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب تھی اور گاؤں کا بچہ بچہ یوں باہر نکل آیا جیسے مکانوں کو آگ لگ گئی ہو۔

اجو دادا اور ساجی گھر میں دبکے بیٹھے تھے جیسے سرے بھرے پڑے کے دو پتے سوکھے کے جھڑ گئے ہوں۔ باہر کی آوازیں انہیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے سارے گاؤں میں پڑ لیں چیخ رہی ہوں۔ جمیل کی بے چین نگاہیں ہجوم میں ان کو ہی ڈھونڈ رہی تھیں۔

کانسٹیبل نے اس سپیڈ کانسٹیبل کے ساتھ جو گاؤں میں خفیہ ڈیوٹی پر تھا اور نمبردار کے ساتھ چند باتیں کیں اور چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پولیس کے تمام آدمی چل پڑے۔ انہیں جمیل کی واپسی کی زندہ بھر خوشی تھی۔ انہوں نے یہ چند روز بڑے مزے میں گزارے تھے۔ جوں جوں جمیل کی روپوشی طول پکڑتی جا رہی تھی گاؤں سے مرغیوں کی نسل ختم ہوتی جا رہی تھی اور آج جب پولیس کے سپاہی گاؤں سے چلے تو ان کے چہرے طول سے تھے۔

پولیس کے چلے جانے کے بعد ترائی سے بلند ہی تک پھیلے ہوئے گاؤں میں ہنگامے پھوٹنے لگے۔ جمیل جو تھوڑی دیر پہلے تک ڈاکو اور قاتل تھا اب ہیرو بن گیا۔ گاؤں والوں نے اسے نرغے میں لے لیا۔ کسی نے اجو دادا کو بھی اطلاع دی۔ یہ تمہارا نوکر ہاجو کر آیا ہے اور کہتے ہیں کہ اس نے شہر میں کوئی ایسا جہادی کارنامہ کیا ہے کہ پولیس اسے ساتھ آگے چھوڑ گئی ہے۔

www.paksociety.com

اجو دادا اور ساجی کو یوں لگا جیسے ان کے جسم بخار سے پھنک رہے تھے کہ اچانک بخار اتر گیا ہو۔ مسرت کے دھچکے نے انہیں ہلا کے رکھ دیا اور دونوں کے آنسو بہہ آئے۔ اجو بوڑھا ہو گیا تھا لیکن جمیل کی چوٹ نے اسے قبر تک پہنچا دیا تھا اور اب وہ لاٹھی کے سہارے کے بغیر چل نہ سکتا تھا لیکن اسے خبر ملی کہ جمیل بے گناہ ہے اور واپس آ گیا ہے تو وہ لاٹھی کے بغیر ہی اٹھ دوڑا۔ اس کے پیچھے ساجی دوڑتی پھلانگتی باہر نکل۔ جمیل سہمی کی سیڑھیوں پر کھڑا ہجوم کو آپ بیتی سنا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جمیل ایک بار پھر اجو دادا اور ساجی کے پاس اُسی انداز سے بیٹھا تھا جس انداز سے وہ ایک طوفانی رات آیا تھا۔ ان میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔ اجو دادا کی تو جیسے جوانی عود کر آئی تھی اور ساجی کے ہاتھوں پاؤں میں ایک بار پھر پہلے والی پھرتی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے گالوں کی لال آج پھر دہک رہے تھے اور اجڑے اجڑے گھر میں آج پھر رونق آ گئی تھی اور آنگن میں ساجی کی تین سہیلیاں بیٹھی گھونگھٹ کی اوٹ سے جمیل کو دیکھ رہی تھیں۔

جمیل گھر آنے سے پہلے ساجی سے اپنی گھوڑی سے لپٹ گیا تھا۔ اس کے منہ سے اپنا منہ رگڑا تھا۔ اس کی بالیں لی تھی۔ باتیں کی تھیں اور گھوڑی مسرور ہو کے کھڑی رہی تھی۔

ساجی نے اُس کے لیے پراٹھے پکائے، ان پر مکھن رکھا، انڈے تلے اور جمیل کے آگے رکھ دیئے۔

"میں تھانے جا رہا ہوں۔" اس نے کھانا کھا کر کہا۔ "تھانے دار نے کہا تھا واپس آ جانا۔"

اور وہ گھوڑی پر زین کسنے لگا۔

جب وہ کالی گھوڑی پر سوار ہو کر گاؤں کی گلیوں سے گزر رہا تھا تو اس کی گردن تن گئی اور سینہ پھیلنے لگا۔ ساجی گھوڑی بڑی تمکنت سے گلیوں کی سیڑھیاں اور ڈھلانیں اتر رہی تھی۔ جب وہ وادی میں آئی تو جمیل نے ایڑ لگائی۔ گھوڑی بھی تھمتی سی چال دوڑنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں گھوڑی نے جمیل کو مری کی بلندی پر پہنچا دیا۔ جمیل کو نیلوفر کی کوٹھی کا راستہ کچھ کچھ یاد تھا۔ وہ کنٹیر پوائنٹ سے گزرا تو اسے نیلوفر کی کوٹھی نظر آ گئی۔

فیکری کی اوٹ میں اونچے اونچے سنگتے کی گھنی باڑ کے زمنے میں نیلوفر کی کوٹھی تھی جس کے برآمدے میں جمیل کی ماں باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اسے گھوڑے کے سُموں کی آواز سنائی دی۔ وہ رکی۔ کھڑکی دیکھا تو اسے کالی گھوڑی اور اس پر سوار اپنا بیٹا نظر آیا۔ ایک دو لمحوں کے لیے تو اُس پر خواب کی سی کیفیت طاری رہی۔ جمیل نے اپنی ماں کو دیکھا تو وہ ٹھٹھک کے رہ گیا۔ اس نے گھوڑی روک لی۔ ماں بیٹے نے حیرت و استعجاب سے انھیں دیکھا کہ ایک دوسرے کو دیکھا اور دل بیلیاں توڑنے لگے۔

دونوں کے درمیان باؤلی کے بڑھے کی دھند آ گئی اور اس سپید دھند لاہٹ میں وہ حیرت زدہ سرگوشیاں سنائی دیں۔ "ماں جی؟" ... جمیل؟"

باؤلی کا ٹکڑا اتیرا آگے نکل گیا تو جمیل گھوڑی سے کود کر اُترا اور ماں باہیں پھیلائے اس کی طرف بھاگی۔ ماں نے بیٹے کو سینے سے لگایا اور بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اسے سونگھ رہی تھی، چھو چھو کر محسوس بھی کر رہی تھی۔

ماں نے وہیں کھڑے کھڑے سچائی کیفیت اور جذبات کی شدت سے اُکھڑی سانسوں اور لرزتی زبان سے بتایا کہ وہ کس طرح اُس کے خط پر مری چلی آئی تھی اور بھٹکتی ہوئی نیلوفر کے ہاں آ پہنچی۔

"اور تم اس کوٹھی میں کیوں آتے ہو؟" ... ماں نے پوچھا۔

یہ تو لمبی داستان تھی اور جمیل کو تھانے بھی جانا تھا لیکن یہ بات ماں نے پوچھی تھی۔ جمیل جو قانون، پولیس اور پہاڑیوں سے ٹکرا کر ہمیشہ ہٹو تے بچاؤ تے بن گیا اور اس کا دل پھر ٹوٹنے لگا جیسے درد سے بے حال ہو رہا ہو۔ اس درد کا احساس تو اسے پہلے نہیں ہوا تھا لیکن ماں نے جاں دل پوچھا تو ایک ایک چوٹ درد کرنے لگی اور جمیل باہیں ہی سینے کے بیچ پر بیٹھ گیا جیسے تھک کر چور ہو گیا ہو۔ اس نے ماں کو وہ سب سنا ڈالا جو اس پر بیتی تھی۔ اس نے ماں کو تفصیلاً سنایا کہ نیلوفر اسے کس طرح اور کہاں ملی تھی اور یہ بھی کہ وہ ایک رات نیلوفر کی کوٹھی میں آ چکا ہے۔

ماں کے سینے سے ہوک اُٹھی اور اس نے سینے کے انگارے سینے میں ہی دبا لیے۔ آنسو تو اس کے بہتے ہی رہے تھے مگر جمیل نے سنایا کہ نیلوفر کس طرح بارش میں بھیگتی، بھٹکتی اس کے پاس پہنچی تھی تو ماں سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"ماں جی!" ... جمیل نے کہا۔ "یہ میرے پاس آئی تو میں نے ایسے محسوس کیا جیسے یہ لڑکی دنیا میں تن تنہا ہے اور میں ہی اس کا رکھوالا ہوں۔"

"بہنوں کے رکھوالے بھائی ہی ہوتے ہیں نا بیٹا!" ... ماں نے کہا اور وہ یک بارگی ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

"مگر اب تو میں آزاد ہوں ماں جی!" ... اس نے ماں کو کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ "پولیس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اب کیوں روتی ہو؟"

"خوشی سے بیٹا!" ... ماں نے کہا۔ "خوشی سے ..."

لیکن جمیل کو معلوم نہ تھا کہ ماں نے اُس سے کس قدر تلخ حقیقت، کس قدر عظیم المیہ اور زندگی کا سب سے بڑا بھید چھپا لیا تھا۔ ماں کے دل میں تو یوں آئی تھی۔ "بیٹا! تم ہی اس کے بھائی ہو، یہی تو تمہاری بہن ہے جو تجھ سے بچپن میں چھن گئی تھی۔" لیکن سینے سے جو بات نکلی تھی وہ شعلہ بن کے سینے میں لوٹ گئی اور ماں کا اُمید اُگ جلنے لگا۔

Scan & Page Azeem Rasheed

بیٹے کے لمس میں جو ٹھنڈک تھی اس سے ماں کو خنک سا سکون محسوس ہونے لگا۔ اس نے طے کر لیا کہ جمیل کو کبھی نہ بتائے گی کہ نیلوفر اس کی بہن ہے۔

"ماں جی!" — جمیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھانے میں حاضری دینی ہے۔ میں ذرا سلیم صاحب سے مل لوں۔"

ماں جب جمیل کو ساتھ لیے نیلوفر کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو اس کا دل یوں ڈوبنے لگا جیسے اسے پھانسی کے تختے پر لے جایا جا رہا ہو۔ اس نے چاہا کہ جمیل کو وہیں سے واپس لے آئے لیکن واپس لانے کا کوئی بہانہ نہ تھا۔ وہ اسے اندر لے ہی گئی۔

"نمرہ!" — نیلوفر اچھل کر صوفے سے اٹھی اور دوڑ کر جمیل کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "تم آ گئے؟ .... مجھے پولیس سٹیشن سے پتہ چل گیا تھا کہ تم نے انسپکٹر خالد کی جان بچائی ہے اور...."

"اور ایک عجیب بات بتاؤں بیٹی!" — ماں نے جانے کس قدر زہر ملا غبار دل میں جذب کر کے کہا۔ "بیٹی! میرا پگلا بیٹا یہی ہے جس نے مجھے آتا پتا بتائے بغیر یہاں بلا لیا تھا۔"

"سچ اماں؟"

"ہاں تو!"

"ارے؟" — نیلوفر نے جمیل کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔

جمیل زندگی میں پہلی بار صوفے پر بیٹھا اور سجے سجائے کمرے میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔ اس پر کمرے کی کچھ ذرا سا اجنبیت طاری ہو گئی اور وہ صوفے سے سرک کر قالین پر ہو بیٹھا۔ نیلوفر بھی صوفے سے اتر کر اس کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی مگر اس کی مسکراہٹ ملول تھی۔

ماں نے دونوں کو یوں اکٹھے بیٹھے دیکھا تو اس کا ذہن ایک ہی جست میں پندرہ سولہ برس دور پیچھے کو جا پہنچا جب نیلوفر اور جمیل ذرا ذرا سے بچے تھے۔ اس رات بھی اس نے بہن بھائی کو اسی طرح گفٹ میں اکٹھے بٹھایا اور کہا تھا۔ "ڈرنا نہیں، ہم لکڑیاں لے کے آتے ہیں۔ آگ جلائیں گے پھر تمہیں سردی نہیں لگے گی۔"

ماں کو وہ گئے گزرے لمحے اچھی طرح یاد تھے جب بجلی چمکی تھی تو نیلوفر سہم گئی تھی اور جمیل نے کہا تھا۔ "ماں جی، ہم ڈرتی ہے" — اور نیلوفر ڈر کو چھپانے کے لیے ہنس پڑی تھی لیکن اس کی ہنسی میں ڈر ہی تھی، بالکل آج ہی کی طرح — نیلوفر آج بھی ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی میں دہشت اور دکھ کی جھلک نمایاں تھی۔

ماں کے سینے میں مامتا بڑی زور سے تڑپی — اس نے لپک کر دونوں کو سینے سے لگا لینا چاہا لیکن وہ اپنی بچی کے محمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے سے گریز کر رہی تھی۔

اماں — نیلوفر بولی — "اپنے بیٹے کو چائے نہیں پلاؤ گی؟ .... بنا لاؤ نا!"

ماں کمرے سے بھاگ جانے کے ہی بہانے ڈھونڈ رہی تھی تیزی سے گھومی اور باہر نکل گئی برآمدے میں گئی تو لکڑی کے پاس جا رکی، پر وہ ذرا سا جتنا ٹھہرا تھا۔ اس نے جھانک کے دیکھا، اس کے بچے اکٹھے بیٹھے تھے۔ وہ انہیں دیکھتی رہی اور اسے خیال آیا کہ ایک ہی مہینہ پہلے جب اس نے جمیل پر پہلی بار انکشاف کیا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کو کوئی اٹھا لے گیا تھا تو وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھا تھا اور جب وہ گھر سے لکڑی پر سوار ہو کے نکلنے لگا تھا تو اس نے کہا تھا۔ "جیتے انسان کہیں تو مل ہی جاتے ہیں میں نوکری کے لیے جا رہا ہوں لیکن میں بہن کو بھی ڈھونڈوں گا۔"

آج وہ دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھے ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹ رہے تھے لیکن ماں نے سوچا۔ بہن بھائی میں کتنی دوری حائل ہو گئی ہے جیسے دو ستارے مختلف سمتوں کو ٹوٹ گئے ہوں۔ ماں کے سینے سے ٹیسوں کے بگولے اٹھ آئے اور وہ بھاگ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی اور ہچکیاں لے کے رونے لگی۔ دور سے اس کا دم اکھڑنے لگا۔

جب وہ چائے کی ٹرے اٹھائے نیلوفر کے کمرے میں آئی تو اس کا منہ دھلا دھلایا تھا اور وہ ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس نے چائے بنائی، دونوں کو پلائی اور جمیل تھانے جانے کے لیے چل پڑا۔

"رات یہیں آ جانا جمیل!" — نیلوفر نے اشتیاق سے کہا۔

"آ جانا بیٹا۔" — اس کی ماں نے کہا۔

"تھانے والوں نے آنے ..... جانوں کا" — جمیل نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

"تمہارا بیٹا بہت اچھا ہے اماں!" — نیلوفر نے کہا۔ "دعا کرو مجھے آفتاب صاحب مل جائیں میں تو دونوں خوانے پر بس کھلوں گی۔"

ماں چپ رہی اور نیلوفر اس کے آنسوؤں میں جھلملانے لگی۔

*

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کاردار کے متعلق مخبر وٹی سے اطلاعیں دے رہے تھے کہ وہ ابھی مری کے علاقے سے باہر نہیں نکلا۔ پولیس نے رات ہی رات تمام کچے پکے راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ ہوائی اور غیر سرکاری مخبر اور مری کے چند ایک جیٹر غنڈے مری میں اور گرد و نواح میں پھیلا دیئے گئے تھے۔ ضلعے کے تمام پولیس سٹیشنوں کو کاردار کے متعلق تفصیلی اطلاعیں دے دی گئی تھیں۔ مری سے ہر سمت کو نکلنے والی بسوں، کاروں اور ٹرکوں کو روک کر چیک کیا جا رہا تھا۔

مری کی روح افزا شگفتگی پر مسلسل طاری ہو گئی تھی۔ میدانوں سے آئے ہوئے لوگ کوٹھیوں، فلیٹوں اور ہوٹلوں میں بیٹھے بامال روڈ پر بازار کے علاقے میں جھنجھٹوں کی نسبت میں جگہ جگہ کھڑے اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکوؤں کا بڑا ہی خطرناک گروہ مری میں سرگرم ہے اور رات کو پولیس دو لاشیں لائی ہے۔ دن بھر شہر کی فضا میں ڈراؤنا سا کھچاؤ رہا اور ہوٹلوں سے خوفناک اور سنسنی خیز افواہیں تخلیق ہو ہو کر مری میں پھیلتی رہیں۔

جمیل تھانے میں پہنچا تو گھٹائیں چمک رہی تھیں اور بچھو اڑنے لگی تھی۔ راولپنڈی سے ایس۔ پی بھی آ گیا تھا۔ اس وقت جمیل سامی کے گاؤں چلا گیا تھا۔ ایس پی رات کا واقعہ اسپکٹر خالد اور جمیل سے بیانات سنتے گئے۔ جمیل تھانے کے دفتر میں گیا تو ایس۔ پی نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور چند ثانیے کاغان کی مٹی کے اس شاہکار کو دیکھتا ہی رہا۔ اس کی آنکھیں سکڑنے لگیں اور آنکھوں کے قریب کی جھریاں اور گہری ہو گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز سا تبسم آ گیا۔

"کتنا کچھ پڑھے ہوئے ہو؟" — اس نے جمیل سے پوچھا۔

"اَن پڑھ ہوں صاحب جی!" — جمیل نے جواب دیا۔

"خانصاحب!" — ایس۔ پی نے ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا — "گو یہ لڑکا آٹھ جماعتیں بھی پڑھا ہوا ہوتا تو میں اسے کل ہی پنڈی لے جا کر ایس۔ آئی کی ٹریننگ کے لیے بھیج دیتا... میں بڑا پولیس میں تھا تو اس قدر خال اور ڈیل ڈول کے دو آدمی دیکھے تھے۔ انسانوں کی بنیل خال ملتی ہے۔ یہ شخص بھوکا مر سکتا ہے چوری نہیں کر سکتا۔"

"تم شاید کاغان کی وادی کے جوان ہو" — ایس۔ پی نے جمیل سے پوچھا۔

"اب تو کاغان میں ہی رہتے ہیں جی" — جمیل بولا — "لیکن ماں کہتی ہے کہ ہم خانہ بدوش تھے۔ گرمیاں کشمیر میں گزرتی تھیں اور سردیاں میں نیچے اتر آتے تھے۔ اب کاغان اپنا وطن ہے۔"

"تمہارا وطن پاکستان ہے اور کاغان میں تم رہتے ہو" — ایس۔ پی نے کہا — "تمہارا دادا یا پردادا ترک تھا۔" ایس۔ پی نے اُسے اپنے پاس بلا کر اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑی غور سے دیکھا۔ آنکھیں بھیگیں جن کا رنگ سُرخی تھا۔ ایس۔ پی نے کہا — "تمہاری رگوں میں دو خون ہیں۔ ترک اور عراقی" — اُس نے ڈی۔ ایس۔ پی سے مخاطب ہو کر کہا — "فطرت انسان کی اصلیت، اہلیت اور تم تر خوبیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ آج ہم انسانوں کو لباس اور مالی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ نیچے موتی غلاظت میں چھپ گئے ہیں اور غلاظت کے ذرے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی چمک والوں کو ہی بلند و برتر کہتے ہیں.... ذرا غور کرو خانصاحب! کاردار کا گاہ دیکھو اور اس مفلس مزدور کا اپنا رہ دیکھو۔"

"تم پولیس میں بھرتی ہو جاؤ" — ڈی۔ ایس۔ پی نے جمیل سے کہا۔

"نہ خان جی!" — جمیل نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"میں اپنے وطن میں سیر سپاٹے کے لیے آنے والوں کو گھوڑی پر سواری کرایا کرتا تھا" — جمیل نے جواب دیا — "میرے ساتھ اور بھی کئی مجھ جیسے یہی کام کرتے تھے۔ وہاں پولیس کا جو بھی سپاہی ڈیوٹی پر ہوتا تھا ہر گھوڑی والے سے آنکھ آنے روز وصول کرتا تھا میں ایسی آمدنی کو پسند نہیں کرتا۔"

ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی نے قہقہہ لگایا۔

ایس۔ پی نے اُس سے کیس کے متعلق بہت کچھ پوچھا۔ پھر ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا کہ اس کی آج رات تو کوئی ضرورت نہیں۔ اسے گاؤں جانے دیں۔

"تم چلے جاؤ" — ڈی۔ ایس۔ پی نے اُسے کہا — "کل صبح آ جانا"

جمیل نے جھک کر سلام کیا اور تھانے سے نکل گیا۔

وہ گھوڑی پر سوار ہو جھکیہ روڈ پر جا رہا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ یہ ایسی سڑک تھی کہ اس پر تو اُس وقت جمیل پیدل ٹہلا کرتی تھی۔ نو جیا بتا جوڑے اور بن بیاہے جوڑے بھی شہر کے ہنگامے سے کنی کاٹ ہو کر اسی سڑک پر چلے جایا کرتے تھے لیکن اس رات یہ سڑک سنسان پڑی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گھٹائیں بڑھی آ رہی تھیں اور زیادہ تر اس ویرانی کا باعث وہ افواہیں تھیں جو دن بھر تک ہر گلی کے موڑ پر خوف طاری کرتی رہی تھیں۔ شاہ نام افواہیں ایک جیالک خبر میں سمٹ آئی تھیں — آج مری میں ڈاکہ پڑے گا۔ پنڈی سے آیا ایس۔ پی۔ ایس کی دو مسلح گاڑیاں لے کے پہنچ جائے گا۔ گھوڑا

Azeem Paksitanipoint

گھروں میں دبک گئے تھے اور جمیل گھوڑی پر سوار سڑک پر چلا جا رہا تھا۔

جنگل میں مسلسل آہٹیں سنائی دیتی رہتی ہیں جو رات کو اور زیادہ بلند ہو جاتی ہیں۔ جنگلوں کے ہی ان آہٹوں اور طرح طرح کی آوازوں سے کبھی ڈرے ہیں نہ چونکے ہیں۔ وہ اُس رات چونکا کرتے ہیں جس رات جنگل خاموش ہو جاتے اور گیدڑ چپ رہیں۔

جمیل کی گھوڑی کے نعلوں کی آواز سنسان سڑک پر جنگل کی آوازوں کا حصہ معلوم ہوتی تھی جن کا جمیل عادی تھا لیکن اس نے محسوس کیا جیسے سڑک بالکل سنسان نہیں۔ دو تین آدمی اُس کے قریب ہی چلے جا رہے ہیں یا آ رہے ہیں۔ اس نے ایک بار گھوم کے دیکھا تو وہ اپنے آپ میں ہنس پڑا۔ اس سے چند ہی قدم دور سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ اُس نے سوچا کیا یہ نہیں۔

وہ اگلا موڑ مڑا تو اُسے وہی آہٹ پھر سنائی دی۔ وہ اس آہٹ سے مانوس نہیں تھا۔ پھر وار پڑنے لگی تھی۔ گھوم کے دیکھا تو ہر سو اندھیرا تھا۔ پچھلے کھمبے کے بلب کی روشنی پھوار کی دھندلاہٹ میں اور زیادہ دھندلی ہو گئی تھی۔ گھٹیں یک بارگی گرج اٹھیں اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ گھوڑی بدکی اور سنبھل گئی۔ ایسی بارش کی وہ عادی تھی۔ جمیل کو دو تین گز دور وسائے سے نظر آتے جو تیری سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بجلی چمکی تو سائے دو آدمی بن گئے جنہوں نے منہ اور سر صافوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ جمیل یہ تو نہ دیکھ سکا کہ ان کے ہاتھوں میں کیا ہے لیکن اسے یقین تھا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں۔ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئے۔ جمیل نے گھوڑی روکی۔ ان آدمیوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ ان میں سے ایک جمیل کی طرف بڑھا۔ جمیل نے گھوڑی کا رخ ان کی طرف کر کے ایڑ لگائی اور للکار کر بولا۔ "ہاؤ کی"

کالی گھوڑی نے جست لگائی اور ان آدمیوں کی طرف سرپٹ دوڑی۔ ایک آدمی گھوڑی کی ٹھوکر سے پرے جا گرا اور دوسرا ایک طرف بھاگ اٹھا۔ جمیل کو توقع تھی کہ کسی بھی لمحے پستول کی گولی اس کے جسم سے پار ہو جائے گی لیکن اس پر حملہ کرنے والے اتنے احمق نہیں تھے کہ وہ مری شہر میں گولی چلاتے۔ انہیں معلوم تھا کہ مری میں جگہ جگہ پولیس کا پہرہ ہے اور پولیس ہر طرح بیدار رہتی ہے۔ وہ خنجر سے جمیل کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

جمیل نے باگ کھینچی تو گھوڑی آٹھ دس قدم دور جا رکی۔ اس نے گھوڑی گھمائی اور پھر ایڑ لگائی لیکن دونوں آدمی غائب تھے۔ اس نے گھوڑی روک لی۔ سڑک کے ایک طرف پہاڑی اور دوسری طرف ڈھلان تھی۔ دونوں طرف گھنا جنگل۔ اندھیرا اور بارش تیز تھی۔

"مردود! سامنے آؤ۔" جمیل نے للکار کر کہا۔ "میں خالی ہاتھ ہوں۔"

بارش کی پوچھاڑ اور چیلوں کے پیڑوں کی سناں سناں اور کھٹا کی کڑکڑاہٹ کے سوا اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ آگے چل پڑا۔ وہ موسلا دھار مینہ میں آگے پیچھے دیکھتا جا رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ نیلوفر کی کوٹھی

میں چلا جائے اور رات اپنی ماں کے پاس گزارے لیکن اسے محسوس ہوا جیسے وہ حملہ آوروں سے چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بزدل نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس احساس کے علاوہ ساجی کی محبت اُس پر غالب آ گئی۔ ساجی کے دادا کا بھی خیال آیا۔ اس کی وجہ سے دادا اور پوتی کو بدنامی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے انہی کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔

وہ چوکنا ہو کر ڈھلان اتر گیا اور ساجی کے گاؤں اُسی حالت میں پہنچا جس حالت میں وہ پہلی رات پہنچا تھا۔ ساجی نے اُسے دیکھ کر دودھ کی دیگچی چولہے پر رکھ دی۔

دوسری صبح جب جمیل گھوڑی پر زین کس رہا تھا تو ساجی نے پاس آ کر جذبات سے بھرپور سرگوشی کی۔ "گھوڑی کو چرانے نہیں لے جو گے؟"

اجو دادا اصمعی میں نہ بیٹھا ہوتا تو جمیل طارق کچھ اور ہوتا لیکن کنکھیوں دادا کو دیکھ کر آہستہ سے بولا "نکل... اگر تمہارے سے جلدی لوٹ آیا تو آج ہی۔" جمیل کا دل یک بارگی دھک دھک کرنے لگا اور ساجی کلڑی میں جھک کر بولی "جلدی اُدھر اُدھر کر لے نی جیسے دادا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکی ہو۔"

"ماں کو ساتھ لے آنا بیٹا۔" اجو دادا نے کہا۔

"لے آؤں گا دادا! یہاں نہیں لاؤں گا تو اور کہاں لے جاؤں گا۔" جمیل نے کہا۔ "میں اُسے کوٹھی میں نوکری تو نہیں کرنے دوں گا۔"

اور وہ گھوڑی کی باگ تھامے باہر نکل گیا۔

نیلوفر کی کوٹھی میں اُس کی ماں ہر آہٹ پر باہر نکل آتی تھی۔ اُس نے ساری رات جاگتے گزار دی تھی۔ بیٹے جس قدر خوشی تھی اتنا ہی غم بیٹی کا تھا۔ رات بھر اس کے سینے میں ہر سانس دلوں کی آگ میں جھلستے رہے تھے۔ ایک بار تو اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نیلوفر پر یہ راز فاش کر دے۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے چنار کے پیڑ میں تھوہر کا بیج ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس خدشے سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ دونوں [illegible] جائیں اب اپنی اپنی جگہ پر سے بھرے تو ہیں۔

اس سے یوں [illegible] ویسا کہ ماں بیٹا [illegible] کی نوکری چاکری کرتے ہیں لے۔ بیٹی کو اس حال میں چھوڑ کے [illegible] آمادہ نہیں ہو رہا تھا لیکن وہ اس ڈر سے جھینپ گئی کہ نیلوفر پر طرح طرح کے [illegible] میں ایسا مذہب [illegible] کا ہر چہرہ ڈر کر ہنسی سا بن جائے۔ وہ رات بھر مانگ اور بارات کی [illegible] رہتی تھی اور اب برآمدے میں رہتی تھی۔ پوٹیک پرشس پھیلا رہی تھی [illegible] ٹیک پرشس یوں ہی [illegible] ڈر کر دوڑ آئی۔

[illegible] بیٹھا تھا۔ وہ ابھی تو یہ بات بھی نہ کر پایا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی۔ نیلوفر نے ریسیور اٹھایا۔ تھانے سے ڈی۔ ایس۔ پی بول رہا تھا۔

"کاردار گھیرے میں آگیا ہے"۔۔۔ ڈی۔ ایس۔ پی کہہ رہا تھا۔۔۔ "آپ گھر پر رہیں، باہر نہ نکلیں۔ میں دو اور کانسٹیبل بھیج رہا ہوں۔۔۔ کاردار کے ساتھ تین چار آدمی تھے جو شہر کی طرف بھاگے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جاتے جاتے آپ پر وار کر جائیں۔ گروہ خطرناک ہے۔۔۔ جی! کاردار کلفٹن روڈ پر پہاڑیوں کے اندر نظر آیا تھا اور اسی علاقے میں گھیر لیا گیا ہے۔ بہرحال آپ مطمئن رہیں۔۔۔ جی بی تو مشکل سے جنگل بہت گھنا ہے۔ بارشوں کی وجہ سے پھسلن اتنی ہے کہ ہمارے آدمی چل بھی نہیں سکتے۔۔۔ اُمید تو ہے پکڑا جائے گا۔"

نیلوفر نے ریسیور رکھ کر مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔۔۔ "وہ گھیرے میں آگیا ہے۔ تھانے والے کہتے ہیں ہم اُسے پکڑ لیں گے۔"

"کون؟"۔۔۔ جمیل نے پوچھا۔

"کاردار۔"

"کہاں؟"۔۔۔ جمیل نے اچھل کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ "کس جگہ؟"

"وہ کلفٹن روڈ کی طرف بتا رہا تھا۔"

"وہ میرا شکار ہے"۔ جمیل نے بے چینی سے کہا۔۔۔ "میں بھی جاتا ہوں۔۔۔ یہ کلفٹن روڈ کون سی جگہ ہے؟"

"جدھر تم نے اُسے کھائی میں گرایا تھا"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔

"مت جاؤ بیٹا"۔۔۔ ماں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔۔۔ "تم نہ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔"

"نہیں ماں جی"۔۔۔ جمیل نے کہا۔۔۔ "پولیس کے سپاہی پہاڑوں میں بھاگ نہیں سکتے۔ چلتے چلتے گر پڑتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ مجھے پکڑ نہیں سکے تھے۔۔۔ مجھے جانے دو ماں جی!"۔۔۔ اور وہ تیزی سے چل پڑا۔

"بندوق لیتے جاؤ جمیل"۔۔۔ نیلوفر نے اُٹھ کے کہا۔

جمیل رکا اور کھسیانے سے بولا۔۔۔ "میں نے کبھی بندوق نہیں چلائی۔۔۔ کبھی چھرے کے بھی نشانے دیکھے"۔۔۔ اور وہ باہر نکل گیا۔

نیلوفر اور اس کی ماں تو جمیل کی گھوڑی کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد یہ آواز پیڑوں کی سناں۔ سناں میں تحلیل ہو گئی۔

"اسے نہیں جانا چاہیے تھا"۔ جمیل کی ماں نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اُدھر سانپ ہے۔ گولیاں چلتی ہیں۔ میرے بیٹے کو نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"مت گھبراؤ اماں!"۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔۔۔ "وہ اکیلا تو نہیں۔ کاردار بخت کو پولیس پکڑنے کتنی دیر ہے۔"

ماں کو چین نہ آیا۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ مامتا کی ماری اندر چلی گئی۔ نیلوفر نے جا کر دیکھا۔ وہ مصلے پر بیٹھی تسبیح لیے بیٹھی تھی۔

کاردار اپنے ساتھیوں سمیت کلفٹن روڈ پر پیدل جانے پولیس کے ایک مخبر کو نظر آیا تھا۔ تھانے میں جلدی اطلاع بھجوانا ممکن نہ تھا۔ اس سے قبل مخبر کا غائب ہو جانا یقینی تھا۔ اتفاق سے ایک کار مری کی طرف جا رہی تھی۔ مخبر نے روک کر کار والے کو ساری بات بتائی تو اُس نے انتہائی فراخدلی سے کار چلا کر تھانے میں اطلاع دے دی۔ سی۔ سی۔ آئی۔ اے والوں کے پاس ایک بے جیب تھی۔ ایس۔ پی نے فون کر کے دو فوجی جیپیں منگوا لیں۔ اس دوران مخبر نے کاردار اور اس کے ساتھیوں پر نظر رکھی۔ وہ سڑک سے ہٹ کر ایک تنگ سی وادی میں داخل ہو گئے تھے۔

پولیس کو پہنچنے نصف گھنٹہ لگ گیا۔ اُنہوں نے وادی کو محاصرے میں لے لیا۔ باہر نکلنے کی جو سڑک راہ نظر آئی۔ روک لی اور محاصرہ تنگ ہونے لگا۔ وادی کا جنگل بہت گھنا تھا اور چٹانیں دشوار گزار۔

خاصا اندر جا کر ایک کانسٹیبل کاردار دو ساتھیوں کے ساتھ ایک ڈھلان اُترنے نظر آیا۔ کانسٹیبل نے بغیر سوچے رائفل کا نشانہ باندھا اور گولی چلا دی اور اس طرف اُٹھ بھاگا۔ جا کے دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اس گولی نے پولیس کی ساری سکیم تباہ کر دی۔ ملزموں کو شاید گولی چلنے سے پہلے علم نہیں تھا کہ وہ گھیرے میں ہیں یا گولی ان کا تعاقب کر رہا ہے لیکن گولی چلنے سے وہ چونکتے ہو گئے اور جھاڑیوں میں اندر ہی اندر رینگتے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

جمیل کی گھوڑی کلفٹن روڈ پر سرپٹ دوڑی آ رہی تھی۔ جمیل نے سڑک پر کھڑی جیپوں کے پاس گھوڑی روک لی۔ ذرا بیہودوں نے اسے بتایا کہ پولیس اس وادی میں چلی گئی ہے۔ جمیل نے پہاڑیوں کی بلندی سے ان کے دائیں جیں لکیریں، چٹانوں اور جنگل کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا کہ وادی آگے سے کیسی ہو گی۔ وہ پہاڑوں میں جنا پلا تھا۔ پہاڑی بھول بھلیوں کو خوب سمجھتا تھا۔

وہ وادی میں جانے کی بجائے سڑک پر آگے چلا گیا۔ ذرا سی آگے ٹیکری اور اس کے عقب میں پہاڑی تھی۔ وہ گھوڑی کو ٹیکری پر چڑھنے لے گیا۔ اس نے دیکھا کہ پہاڑی اور ٹیکری کے درمیان تنگ سی وادی ہے اور پہاڑی میں ایک کھاؤ بھی ہے جو گھنے پیڑوں نے چھپا رکھا تھا۔ وہ دوسری طرف نیچے اتر گیا۔

وہاں پاپیادہ چلنا ممکن نہ تھا۔ وہ بڑی مشکل سے پہاڑی کے کنارے میں جا پہنچا۔ آگے ایک اونچان آ گئی۔ جمیل کی گھوڑی اُسے اوپر لے گئی اور جمیل کو سامنے دور دور تک کشادہ وادی نظر آئی جس میں چھوٹی

Waqar Azeem Paksitanipoint

پتی سی ٹیکریاں بکھری ہوئی تھیں اور جنگل نسبتاً کم گھنا تھا۔ شاہ طوط کے درخت بھی تھے جنگلی امرود، ناشپاتیوں کے پیڑ بھی تھے اور باقی تمام درخت چیل کے تھے۔ دور پس منظر میں مجھر ناگ دکھائی دے رہا تھا۔

جمیل بلندی پر کھڑا تھا۔ اُسے تمام منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دائیں طرف دیکھا۔ کوئی پگڈنڈی موڑ کر دو ایک درخت تلے جھاڑیوں کی اوٹ سے ایک ہاتھ ہلتا نظر آیا۔ جمیل نے پہچان لیا۔ وہ پولیس انسپکٹر تھا۔ وہ اُسے ہاتھ کے اشارے سے چھپ جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس کی کالی گھوڑی دھلی دھلائی ہریالی میں بڑی دور سے نظر آ رہی تھی۔ اسی طرح بائیں طرف سے بھی اُسے ایک ہاتھ چھپ جانے کا اشارہ کرتے نظر آیا۔ پولیس نے اسی خطے کو گھیر رکھا تھا۔

کاردار اسی خطے میں تھا اور اسے محاصرے کا علم ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی جنگل میں اِدھر اُدھر رینگ رہے تھے۔

جمیل وہاں سے ہٹ کر اور اوپر چڑھ گیا۔ اُسے دور پرے جنگل کا لمبا سا تنگ سی پگڈنڈی دکھائی دی۔ وہ اس پگڈنڈی کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے ایک آدمی نظر آیا جو گھوڑے پر سوار تھا اور سپاہی گیت گاتا چلا آ رہا تھا۔

پولیس والے چوکنے ہو گئے۔ وہ آدمی انہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جمیل بلندی پر ہونے کی وجہ سے اُسے اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ پولیس انسپکٹر جمیل کو ہاتھ کے اشارے سے غالباً کہہ رہا تھا کہ اس آدمی کو روک لے۔

وہ آدمی شاہ طوط کے گھنے درخت کے نیچے سے گزر رہا تھا کہ ایک آدمی جو جانے کب سے درخت پر بیٹھا تھا، درخت سے کودا اور گھوڑا سوار کے پیچھے گھوڑے پر جا پڑا۔ اُس نے ایک بازو سوار کی گردن کے گرد لپیٹ کر اُس کے پیٹ میں تین چار گھونسے مارے۔ سوار اچانک قابو میں آ گیا تھا، نہ سنبھل سکا، نہ مقابلہ کر سکا اور وہ حملہ آور کے دھکے سے گھوڑے سے نیچے جا پڑا۔ حملہ آور نے گھوڑا سرپٹ بھگا دیا۔

جمیل نے پہچان لیا۔ حملہ آور کاردار تھا۔ جمیل نے ایڑ لگائی۔ اس کی گھوڑی پہاڑی نشیب و فراز پھلانگنے لگی۔ کاردار شاید گھوڑوں کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا تھا ورنہ وہ اس گھوڑے پر کود کر اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالتا۔ وہ پہاڑی راہوں پر خراماں خراماں چلنے والا ٹٹو قسم کا گھوڑا تھا۔ بھاگنے کا عادی نہ تھا، تاہم کاردار اسی ٹٹو کو بھگا رہا تھا اور اس کے تعاقب میں جمیل تھا جس نے گھوڑی کو جھونکے موٹے کھٹا نے خرگوش کی طرح چھلانگیں سکھا رکھے تھے۔ گھوڑی جمیل کے نیچے ہرن کی طرح دوڑ رہی تھی۔

پولیس والوں کو بڑی شدت سے احساس ہوا کہ پہاڑی تعاقب میں ہیپوں کی جگہ گھوڑوں کی ضرورت تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی اور دونوں پولیس انسپکٹر پاپیادہ دوڑے جنگل کے پیڑ پودے، پتھر، خاردار جھاڑیاں، بیلوں کی جڑیں انہیں قدم قدم پر روکتی تھیں۔ پاؤں گیلے پتوں سے پھسلتے تھے لیکن ڈی۔ ایس۔ پی پتھیار اور کانسٹیبل ان رکاوٹوں کو روندتے جا رہے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں اور پستول تو تھے لیکن یہ کاردار نظر نہیں آتا تھا۔ یہ گیدڑ سی آنکھ جا کر گہرائی میں چلی گئی تھی۔ دونوں گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی جس سے سمت کا پتہ چلتا تھا۔ رائفل اور پستول محض بیکار تھے۔

جمیل کی گھوڑی کاردار سے چند ہی قدم پیچھے پہنچ گئی اور یہ فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا۔ جمیل نے گھوم کر دیکھا۔ اُسے دور پیچھے پولیس کے دو کانسٹیبل اپنی طرف دوڑتے نظر آئے۔ کاردار اپنے بائیں طرف گھوم گیا۔ جمیل نے وہاں گھوڑی گھمائی تو دیکھا کہ یہ راستہ نہیں بلکہ تنگ سی جگہ ہے۔ سامنے، دائیں اور بائیں کنوئیں کی دیواروں کی طرح عمودی پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ آگے جانے کی کوئی راہ نہ تھی۔ تنگ سی جگہ اونچی اونچی جھاڑیوں اور درختوں سے اٹی پڑی تھی اور چاروں طرف جگہ گھری کھائی کی طرح نظر آتی تھی۔

کاردار نے گھوڑا روک لیا۔ آگے جانا بھی کہاں؟ جمیل اس سے چند ہی گز دور تھا اور رفتار خاصی تیز تھی۔ کاردار نے گھوم کے گھوڑا گھمایا اور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جمیل نے دیکھ لیا کہ کاردار نے پتلون کی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ جمیل نے گھوڑی کے پیٹ میں دونوں ایڑیاں بڑی زور سے ماریں اور پاؤں رکابوں سے نکال لیے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

پیشتر اس کے کہ کاردار کوئی چلا سکتا جمیل کی گھوڑی کاردار کے گھوڑے سے ٹکراتی جمیل اس تصادم کے لیے تیار تھا۔ اس نے پاؤں رکابوں سے نکال لیے تھے جمیل کچھ ٹکرے دھچکے سے کچھ اپنے زور سے کاردار کے کندھوں پر جا گرا۔ کاردار کا ٹٹو نما گھوڑا جمیل کی گھوڑی کی اتنی شدید ٹکر نہ سہ سکا اور گھنی جھاڑیوں میں جا بیٹھا۔ جمیل نے کاردار کو دبوچ لیا لیکن گرتے گرتے اس کی گرفت سے نکل گیا۔

اس نے اُٹھ کے دیکھا۔ اس کا پستول جانے کہاں گر پڑا تھا۔ وہ بولا کیا تھا لیکن خطرے کے احساس نے اسے بیدار رکھا۔ اس نے پتلون کی دوسری جیب سے خنجر نما چاقو نکال لیا۔ جمیل سنبھلا اور کاردار کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ کاردار اس پر حملہ کرے گا لیکن وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"آگے آ جاؤ صاحب بہادر!" — جمیل بولا — "میں تو خالی ہاتھ ہوں۔"

لیکن کاردار اچانک جھاڑیوں میں گھس گیا۔ پولیس کے آدمی ابھی دور تھے۔ جمیل نے گھوم کے دیکھا اس کی گھوڑی باہر نکل گئی تھی۔ اسے اطمینان ہوا کہ پولیس والے گھوڑی کو دیکھ کر رک جائیں گے۔

کاردار جھاڑیوں میں غائب ہوا تو جمیل کو سخت خطرے کا احساس ہوا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ قریب

Pakistan Virtual Library
Marfat.com
Marfat & Waqar Azeem Archive

ہی سستے کے پودے تھے۔ اس نے موٹی سی شاخ توڑ لی۔ جلدی جلدی اس کے پتے اتار لیے اور وہ کلہاڑے کے پیچھے گھنی جھاڑیوں میں گھس گیا۔

اسے کاردار نظر آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ اُلٹے پاؤں، ہاتھ میں چاقو پکڑے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ جمیل جھاڑیوں کو چیرتا آگے بڑھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ٹخنوں تک کھڑے پانی میں کھڑا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر لاٹھی نما شاخ کا وار کیا جو کاردار نے سر بچا کر کندھے پر لیا۔ معاً کاردار نے چاقو کا وار کیا جو جمیل نے لاٹھی پر لیا۔ چاقو اس کی کھال چیر گیا۔ کاردار اس کے اس قدر قریب آگیا تھا کہ لاٹھی کا وار ممکن نہ تھا۔ جمیل نے اس کی ناک پر سر کی ٹکر ماری تو کاردار لڑکھڑا کر پیچھے جھاڑی میں گرا لیکن اُٹھتے اُٹھتے جمیل کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا، اور جمیل کی لاٹھی سے بچ گیا۔

کاردار اٹھ کر تیزی سے پیچھے جا رہا تھا۔ جھاڑیاں اور درخت اور گھنے ہو گئے اور پانی ٹخنوں کو چھونے لگا۔ اوپر پہاڑیوں کی دیواروں اور درختوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ جمیل تیزی سے آگے بڑھا تو کاردار اور زیادہ تیزی سے پیچھے چلا گیا۔ پیچھے پہاڑی آگئی اور ذرا سی ڈھلان جہاں پانی نہیں تھا۔ کاردار ذرا سا جھاڑی کی اوٹ میں ہوا اور غائب ہو گیا۔

جب جمیل وہاں پہنچا تو وہاں کاردار نہیں تھا۔ بلکہ اونچی اونچی جھاڑیوں کے عقب میں ایک غار کا منہ تھا جو اس قدر فراخ تھا کہ آدمی سیدھا کھڑا ہو کر اندر جا سکتا تھا۔ جمیل غار میں داخل ہوا۔ اندر اندھیرا تھا لیکن غار کے منہ سے چند گز اندر تک باہر کی ہلکی ہلکی روشنی آتی تھی۔

جمیل کو اس دھندلی سی روشنی میں کاردار کھڑا نظر آیا۔ اس کے کاردار پر لاٹھی کا وار کیا جو کاردار نے پہلے کی طرح سر بچا کر کندھے پر لیا۔ کاردار اس پر جھپٹا تو جمیل نے لاٹھی گھمائی۔ لاٹھی اور چاقو ٹکرائے اور کاردار اور پیچھے ہٹ گیا۔ جمیل آگے بڑھا۔

"جمیل!" کاردار نے کہا۔ "منہ سے بولو۔ کتنے سو۔ کتنے ہزار روپے دوں۔ واپس چلے جاؤ۔"

"میں تمہاری جان لے کے جاؤں گا صاحب بہادر!" جمیل نے کہا۔

غار اندر سے فراخ اور بلند تھا۔ لاٹھی گھما کے چھت کو چھو بھی نہ سکتی تھی۔ کاردار نے اچانک حملہ کر دیا اور اس کا چاقو جمیل کے کندھے میں اُتر گیا۔ معاً جمیل نے اس کے پیٹ میں لات ماری تو کاردار دور پیچھے جا پڑا۔ وہ اُٹھ ہی رہا تھا کہ جمیل کی لاٹھی اس کے سر پر پڑی اور وہ لڑھک گیا لیکن وہ لاٹھی کا دوسرا وار بچا گیا۔

غار میں موت کا سا سکوت طاری تھا جس میں لاٹھی پڑنے اور کاردار اور جمیل کے قدموں کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس بھیانک سکوت میں کسی انسان کے مرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ جمیل نے سوچا شاید کاردار درد سے کراہ رہا ہے لیکن کاردار پوری جانبازی سے لڑ رہا تھا اور کسی طرف پیچھے

ہٹ رہا تھا جس طرف کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہاں گپ اندھیرا تھا۔

"اور لوگوں سے یہاں؟" — جمیل نے بلند آواز سے کہا اور وار کرنے لگا لیکن اس کا وار رک گیا۔ اسے کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "خدا کے لیے مجھے ختم کر دو.... او ظالمو، وحشیو!"

جمیل کچھ سمجھ تو نہ سکا لیکن وہ کود کر اُس طرف ہو گیا جہاں سے یہ آواز آئی تھی۔ کاردار اس کی طرف پھر بڑھا لیکن جمیل نے لاٹھی سے وار سے روک لیا۔ جمیل کو پولیس کا خیال آگیا اور اس نے بلند آواز سے چلانا شروع کر دیا۔ "آہو.... آہو.... آہو.... آہو.... ہوآہو!"

وہ کلاہا چھاڑ کر چلا۔ کاردار پر لپکا۔ کاردار غار کے منہ کی طرف ہٹ گیا۔ جمیل کا وار خالی گیا اور کاردار نے چاقو چلایا لیکن اُدھر سے پھر اُلٹی آ رہی تھی۔ لاٹھی کاردار کے کندھے پر پڑی اور چاقو جمیل کے بازو میں اُتر گیا۔

جمیل "آہو.... آہو.... ہوآہو" کی صدائیں بلند کیے جا رہا تھا — غار میں گپ اندھیرا چھا گیا — غار کے منہ میں تین چار آدمی کھڑے تھے۔ غار پستول کے دھماکے سے گونج اٹھا اور بندوق آواز آئی — "جہاں ہو رک جاؤ۔"

جمیل کا در خشک ہو گیا۔ وہ سمجھا کاردار کے ساتھی آگئے ہیں لیکن یہ انسپکٹر شاہ تھا جس نے ہوائی فائر کیا تھا۔ وہ تین کانسٹیبلوں کے ساتھ غار کے اندر آیا تو کاردار اپنا کٹا ہوا چاقو پھینک کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ کانسٹیبلوں نے اسے پکڑ لیا۔ جس غار کے اندھیرے کونے میں جمیل اندھیرے میں آنکھیں سکیڑ کر دیکھا تو وہاں اسے ایک آدمی بیٹھا نظر آیا جس کا سر ڈول رہا تھا۔ جمیل نے اس کو سہارا دے کر اٹھایا اور غار کے منہ تک لے گیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ نیم وا آنکھیں دور اندر دھنس گئی تھیں اور چہرہ لاش کی مانند تھا۔ سانسیں بڑی مشکل سے چل رہی تھیں اور اس کے جسم پر ایک چادر تھی جو کندھوں پر پڑی تھی، ورنہ وہ برہنہ تھا۔ لیپلیں کھال میں سے باہر آ گئی تھیں اور اس میں کھڑے رہنے کی تاب نہیں تھی۔

"کون ہو تم؟" — انسپکٹر شاہ نے پوچھا۔

"آفتاب" — لاش نما انسان نے سرگوشی کی۔ "میرا نام آفتاب ہے" — اور اس کا سر ڈول کر جمیل کے کندھے پر گر پڑا۔ آنکھیں نیم وا رہیں اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ انسپکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا، ابھی چل رہی تھی۔

"کون ہے یہ؟" — انسپکٹر نے کاردار سے پوچھا۔

"تمہارا مستقبل" — کاردار نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا — "بیلوفر کا جانشین"

"تو یہ قتل نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں" — کاردار نے کہا — "ابھی اٹھا ہوا تھا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem

"تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"اسی جنگل میں ہوں گے" — کاردار نے کھسیانی ہنسی سے کہا۔

انسپکٹر شاہ نے بھرپور گھونسہ اس کے منہ پر مارا تو وہ چند قدم دور پیٹھ کے بل جا گرا۔ انسپکٹر نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر گرج کر پوچھا — "تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"سچ کہتا ہوں چند نہیں" — کاردار پاؤں تلے بولا — "مجھ سے الگ ہو گئے تھے"

"اسے اور گھوڑے پر بٹھاؤ جمیل!" — انسپکٹر نے جمیل سے کہا — "دوسرا گھوڑا بھی لے چلو — لیکن جمیل کے دونوں کندھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ انسپکٹر نے کہا — "چلو رائفلوں والے دو کانسٹیبل ساتھ ہو جاؤ"

ایک کانسٹیبل آفتاب کو کندھے پر ڈال کر باہر چل پڑا اور دوسرا اس کے پیچھے چلے گئے۔ انسپکٹر واپس جلاکر مار کی تلاشی لینے لگا۔

جہاں آفتاب بیٹھا کراہ رہا تھا وہاں کاغذوں کا پلندہ پڑا تھا۔ اٹھا کے دیکھا تو ان میں آفتاب کی جائداد، انشورنس اور بینک کے کاغذات تھے اور ایک اسٹامپ بھی تھا جس پر لکھنے والے کے دستخط نہیں تھے۔ اسٹامپ پڑھا تو معلوم ہوا کہ آفتاب اپنی ساری جائداد کاردار کے نام منتقل کر رہا تھا لیکن ابھی دستخط نہیں کیے تھے۔ وہاں ایک پارکر پین بھی پڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" — انسپکٹر نے کاردار سے پوچھا۔

"معافی چل کر بتاؤں گا" — کاردار نے تھکے تھکے اور شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

ڈی۔ ایس۔ پی بھی آن پہنچا۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ نیلوفر اپنی ماں کے ساتھ ہسپتال کے اس کمرے کے باہر بے چینی سے ٹہل رہی تھی جہاں آفتاب آکسیجن ٹینٹ میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی رگ میں فوراً گلوکوز لگا دیا تھا۔ ڈاکٹر موت سے سینہ سپر تھے۔ آفتاب کو ہسپتال لایا گیا تھا تو ڈاکٹروں نے دیکھ کر سر جھکا لیے تھے۔ لیکن آکسیجن، گلوکوز اور دوا انجکشن ایک معجزے کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔

"مبارک ہو مسز آفتاب!" — نیلوفر کو آواز سنائی دی۔ اس نے گھوم کے دیکھا۔ نرس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ بولی — "مسٹر آفتاب ہوش میں آ گئے ہیں۔ ٹمپریچر ہے لیکن ٹمپریچر ہونا چاہیے۔ خطرہ ٹل گیا ہے"

"میں اندر چلی جاؤں؟"

"ابھی نہ جائیں تو اچھا ہے" — نرس نے کہا۔ "انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ آپ کو دیکھ کر ان کے اعصاب کو جھٹکا لگے گا۔ ان کے لیے ابھی ہیجانی کیفیت سخت خطرناک ہے"

وہاں سے ہٹ کر نیلوفر اور اس کی ماں وارڈ میں چلی گئیں جہاں جمیل پڑا تھا۔ اس کے دونوں

کندھوں پر پٹیاں بندھی تھیں اور وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بلوٹی نرس نے بتایا کہ اس کے متعلق کوئی فکر نہیں۔ بیدھے سے دو زخم ہیں جو چند دنوں میں بھر جائیں گے۔

کاردار تھانے میں بیٹھا اقبالی بیان لکھوا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے اُسے حوالات سے نکال کر دفتر میں ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی کے سامنے لایا گیا تھا۔ ایس۔ پی نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا تھا — "دیکھو میاں! دوستی والی بات یہی ہے کہ اب ہمیں چکر دینے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا کھیل ختم ہے۔ تم اقبالی جرم نہ بھی کرو تو ہمارے پاس اتنی شہادت اور ثبوت موجود ہے کہ....."

"او میں بھی تھک گیا ہوں.... کاردار نے ماری ہوئی سی مسکراہٹ سے کہا — "ہاری ہوں۔ سب کچھ بتاؤں گا" — اُس نے ایس۔ پی کے ہاتھ میں سگریٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ایس۔ پی نے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اس کی طرف سرکا دی۔ کاردار نے بیتابی سے سگریٹ سلگایا۔ لمبا کش لیا اور دھواں بگل لیا، پھر آنکھیں بند کر کے دھواں چھوڑنے لگا۔

"ہمارے ساتھ دوستوں کی طرح بات کرنا کاردار!" — ایس۔ پی نے کہا — "ہم تمہیں ایسا طعنہ نہیں دیں گے کہ تمہیں سوسائٹی میں اور حلقوں میں اتنی اونچی حیثیت حاصل تھی اور تم اتنے خطرناک مجرم نکلے۔ ہمارے ٹکٹ میں چوراُسے کہتے ہیں جو پکڑا جائے"

"آپ طعنہ نہ دیں چوہدری صاحب!" — کاردار نے کہا — "میرا وجود اور مجھ جیسے بے شمار کاردار وں کا وجود آپ کی سوسائٹی میں اور سرکاری حلقوں پر شرمناک طعنہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اتنے بڑے جرم کو چھپا نہیں سکوں گا۔ سچ نہیں سکوں گا۔ میرا انجام سوچ مجھے سزا نے موت سے نہیں بچا سکے گا۔ اگر آپ مجھے بولنے کا بہت سا وقت دیں تو میں آپ کو صرف یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے یہ جرم کس طرح کیا یا کرایا ہے، میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں جرم کیسے بنا اور ہمارے ملک میں مجرم کس طرح پیدا ہوتے ہیں"

"تم پورا سینہ پھلا کے بولتے رہو" — ایس۔ پی نے کہا — "ہم الیکشن سے نہیں لگے"

"عدالت میرے بیان کا یہ حصہ نہیں سنے گی کہ میں جرم کس طرح بنا تھا اور ہمارے ملک کے بچوں میں مجرمانہ رجحان کس طرح پیدا ہوتا ہے" — کاردار نے کہا — "قانون صرف یہ دیکھتا ہے کہ جرم کس طرح سرزد ہوا اور مجرم کو سزا سنا دیتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں قانون اپنا کام ختم کرتا ہے، وہاں سے سوسائٹی کا اور حکومت کا کام شروع ہوتا ہے۔ سوسائٹی اور حکومت کو مجاز و مستحقیت کا خاتمہ کرنا ہے جب ایک مجرم کو سزا ملتی ہے تو یہ سوسائٹی کے لیے وارننگ ہوتی ہے کہ اس کے دامن میں جرم پھلا پھولا رہا ہے، مگر سوسائٹی مجرموں کو جیل خانے میں بند کر کے مطمئن ہو جاتی ہے.....

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں اپنے ماں باپ کا لاڈلا بچہ تھا۔ عمر پانچ چھ سال تھی۔ میں سکول جانے لگا تھا۔ ایک بہن پیدا ہوئی اور دو سال بعد مر گئی تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی اور میرے لیے پیار کا سمندر موجیں مارتا تھا۔ میں اکلوتا تھا۔ میں خوبصورت بھی تھا۔ رنگ و روپ بھی اچھا تھا۔ میرے چہرے پر آج بھی آپ کو اس خوبصورتی کے آثار ملیں گے۔ پانچ چھ سال کی عمر میں میری ماں بیمار ہوئی اور چند دنوں بعد مر گئی۔ میرے لیے پہاڑ ٹوٹ گیا۔ باپ نے مجھے ماں کا پیار دینے کی بہت کوشش کی۔ رات کو مجھے اپنے پاس سلاتا تھا۔ نئے سے نئے کھلونے لاتا تھا مگر ماں جو خلا چھوڑ گئی تھی، اسے نہ باپ کی شفقت پُر کر سکی نہ کھلونے....

"ایک سال بعد باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اُس وقت باپ کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور میری سوتیلی ماں کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ لڑکی کے ماں باپ نے لڑکی میرے باپ کی خوشحالی اور اس کی حویلی کو دی تھی۔ لڑکی میری ماں کی نسبت زیادہ خوبصورت تھی اور بہت شوخ۔ اُس میں بچپن تھا۔ میرا باپ اس کی بچوں جیسی شوخیوں اور ہنسی مذاق کا شکار ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ بھی بچوں کی طرح کھیلتی تھی لیکن اس سے مجھے ماں کا پیار نہ مل سکا۔ میں سکول سے آتا تھا تو وہ مجھے ماں کی طرح کھانا نہ دیتی۔ کہہ دیتی۔ جاؤ باورچی خانے میں کھانا رکھا ہے۔ ڈال کر کھاؤ۔ یوں لگتا جیسے میری ٹھوک مر گئی ہو....

"دو چار مہینوں بعد باپ مجھے بھول گیا۔ پہلے وہ مجھے اپنے ساتھ سلاتا تھا، پھر اُس نے مجھے الگ سلانا شروع کر دیا۔ آدھی رات کو میں پیاس کی وجہ سے جاگ اٹھتا تھا۔ باپ مجھے پانی پلایا کرتا تھا۔ اس لڑکی کے آجانے کے بعد میری آنکھ کھلتی۔ میں باپ کو آواز دیتا تو مجھے جواب ملتا۔ جا کے پی لے۔ اُس وقت وہ اپنی نئی بیوی کے پاس ہوتا تھا۔ میں نے انہیں اکثر عریاں دیکھا۔ میں نے انہیں کئی بار دن کو بھی اسی حالت میں جانوروں کی سی حرکتیں کرتے دیکھا۔ اس سے میرے اندر غلط قسم کا رجحان پیدا ہو گیا۔ ذہن میں حیوانیت پیدا ہو گئی....

"اس کے ساتھ ہی مجھے سوتیلی ماں سے نفرت ہونے لگی کیونکہ اُس نے میرے باپ پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں آپ کو جھوٹی چھوٹی باتیں نہیں سناؤں گا۔ ورنہ میں آپ کا بہت سا وقت بلکہ دن ضائع کر دوں گا۔ میری عمر تقریباً بارہ سال تھی جب میری سوتیلی ماں کا پہلا بچہ ایک سال کا ہو گیا تھا۔ میرے سپرد یہ کام کر دیا گیا تھا کہ سکول سے آکر بچے کو بہلائے رکھوں اور باہر لے جایا کروں۔ اُسے بوتل سے دودھ پلانا بھی میری ڈیوٹی تھی۔ ماں اسے اس لیے اپنا دودھ نہیں پلاتی تھی کہ جسم خراب ہو جائے گا۔ اگر مجھے بھی اس بچے کی طرح پیار ملتا رہتا تو میں قاتل اور بردہ فروش نہ بنتا۔ ایک روز میں نے اپنے باپ اور سوتیلی ماں کو اکٹھے بیٹھے چائے پیتے دیکھا۔ اُن کا بچہ اُن کے ساتھ کھیل

رہا تھا....

"میں بھی ان میں جا بیٹھا۔ سوتیلی ماں نے حکم دیا کہ بچے کو باہر لے جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں جا تے پیتوں گا۔ سوتیلی ماں نے میرے باپ سے کہا۔ "دیکھا آپ نے؟ یہ اس طرح میرے ساتھ بدتمیزی کرتا ہے۔ آپ گھر نہیں ہوتے تو یہ میری کوئی بات نہیں مانتا۔" وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ میں بولا ہی تھا کہ باپ نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور غصے سے کہا۔ "اٹھا اور لے جا اسے باہر۔" یہ پہلا تھپڑ تھا جو باپ نے مجھے مارا تھا۔ میں آج بھی اپنے منہ پر اس تھپڑ کی ٹیس محسوس کرتا ہوں۔ اس تھپڑ نے میرے دل سے محبت اور پیار نکال دیا۔ میں نے اپنے سوتیلے بھائی کو باہر لے جا کر اس کے منہ پر الیسا ہی ایک تھپڑ مارا۔ وہ رو پڑا اور میں اسے اٹھانے کی بجائے اسے بازو سے پکڑ کر چلاتا رہا....

"وہ ذرا سا بلاؤ اسے گھر لے آیا۔ اس کے بعد اپنے ماں باپ کے ساتھ میری جنگ شروع ہو گئی۔ میں اُن کے خلاف جو کچھ کر سکتا تھا۔ کرنے لگا۔ گھر سے پیسے چرا لیتا۔ سکول سے بھاگ جاتا۔ سوتیلے بھائی کو باہر لے جا کر پٹتا۔ مجھ جیسے اور بھی چند ایک بچے تھے جو والدین کی کسی نہ کسی مجبوری یا بے اعتنائی کی وجہ سے گھروں سے غائب رہتے تھے۔ ان میں بڑی عمر کے لڑکے بھی تھے۔ میں ان کی منڈلی میں جا بیٹھا۔ وہ گالیاں بکتے تھے اور ننگی باتیں کرتے تھے۔ میرے دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ ان لڑکوں کی یہ بیہودہ باتیں مجھے اچھی لگتی تھیں لیکن سی ہوتی تھی۔ ان لڑکوں میں اور بھی کئی عیب تھے۔ وہ گھروں سے پیسے چرا لاتے اور جوا کھیلتے تھے۔ مٹھائیاں کھاتے اور بدکاری تک کرتے تھے۔ مجھ میں یہ سارے عیب پیدا ہوتے گئے....

"میں جب گھر میں ہوتا تھا تو میں محسوس کرتا تھا کہ یہ گھر میری جنت تھی اور مجھے سکون اور پیار یہیں سے ملنا چاہیے تھا مگر باپ اور سوتیلی ماں نے میری جنت کو میرے لیے جہنم بنا دیا تھا۔ میں سکول جاتا تھا۔ پڑھتا بھی اور بھاگتا بھی تھا۔ مجھے سکون گلیوں میں آوارہ لڑکوں میں ملتا تھا....

"میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور پاس بھی ہو گیا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کتنا ذہین تھا کہ آوارگی اور غلیظ باتوں میں بھی پاس ہو گیا۔ باپ میرے لیے نوکری تلاش کرنے لگا لیکن میں اب کسی اور طرف بہت دور نکل گیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں خوبصورت ہوا کرتا تھا۔ رنگ روپ بھی بہت اچھا تھا۔ اس لیے میں کئی لوگوں کی نظروں میں مقبول تھا۔ میں نویں جماعت میں تھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی مجھ پر مہربان ہو گیا۔ وہ میری ہر فرمائش اور ہر ضرورت پوری کیا کرتا تھا۔ اس سے مجھے اتنا زیادہ پیار ملا کہ میں اسی کا ہو کے رہ گیا۔ اسی کی حوصلہ افزائی سے میں نے میٹرک پاس کی مگر وہ مجھے کوئی اور سی ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ انگریزی بول چال سیکھ لو....

"مختصر یہ کہ اُس نے مجھے ایک مجرم بنا دیا مگر میں چوپٹ جیب کترا نہیں بنا۔ استاد نے مجھے کمسن اور

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نوجوان لڑکیوں کو ورغلانے اور گھروں سے بھگانے کے گُر سکھا دیتے۔ خُدا نے مجھے شکل وصورت بھی کشش والی عطا کی تھی اور جسم بھی۔ میں نے زبان کا جادو جلانا سیکھ لیا۔ اداکاری میں مہارت حاصل کر لی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ملک میں پیسہ عام ہوگیا اور سوسائٹی میں آزاد خیالی بھی پیدا ہو گئی۔ اس سے میرا کام آسان ہوگیا۔ میں نے کتنی لڑکیوں کو محبت کا جھانسہ دیا اور انہیں اُستاد کے جال میں پھینک دیا۔ گھر سے میں لاتعلق ہو چکا تھا۔ میں نے دلّی کو مرکز بنایا جہاں فوج اور ایئر فورس کے ہیڈکوارٹر تھے۔ فوجی افسروں کی بھرمار تھی۔ عورت کی محبت مانگ تھی۔ میں نے انگریز افسروں کو لڑکیاں سپلائی کیں اور بردہ فروشی بھی جاری رکھی اور انگریزی بول چال میں بھی مہارت ہوگئی....

"میری عمر بائیس تیئس سال ہو چکی تھی۔ میں نے شادی کی کبھی سوچا ہی نہیں۔ شادی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اُستاد بن چکا تھا۔ بہروپ دھارنے کی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ جنگِ عظیم نے ہندوستان کے لوگوں کے دل پھیر دیئے۔ جہاں پرانی طرز کا ایک سینما ال سہتا تھا، وہاں پانچ پانچ ہال بن گئے۔ اسی رفتار سے فلم ساز کمپنیوں میں اضافہ ہو گیا۔ ہیروئن بننے کا خبط عام ہو گیا۔ ایکٹرا عورتوں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ اُس وقت بمبئی فلم سازی کا مرکز تھا۔ میں بمبئی چلا گیا اور طوائفوں سے یارانہ گانٹھ لیا۔ جوان طوائفوں کو میں ایکٹرا کے طور پر سپلائی کرنے لگا۔ میں دوسرے شہروں میں بھی جاتا رہا۔ کہیں سے کوئی لڑکی ہیروئن بننے کی شوقین مل جاتی تھی۔ اسے میں بمبئی لے جاکر اچھی قیمت پر بردہ فروشوں یا عصمت فروشوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا....

"ملک کو آزادی ملی اور میں پاکستان میں آگیا۔ اُس وقت میری عمر تیس سال سے کچھ اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے ہندوؤں اور سکھوں کے کنبوں کو حفاظت سے ہندوستان جانے کے لیے ریل گاڑی میں بٹھانے یا سرحد تک پہنچانے کا کام شروع کر دیا۔ اس کاروبار کے لیے میں نے ایک گروہ بنا لیا۔ اس کاروبار سے میں نے بہت دولت کمائی اور اس کاروبار کے دوران میں نے چند ایک نہایت خوبصورت ہندو اور سکھ لڑکیاں اڑا لیں۔ ان میں دو تین تعلیم یافتہ تھیں اور آزاد خیال بھی۔ میں آپ کو تفصیلات نہیں سناؤں گا کہ میں نے انہیں کہاں رکھا اور کس طرح رکھا۔ وہ میرے ساتھ خوش ہیں کیونکہ میں نے انہیں بازار میں نہیں بٹھایا، انہیں دو کوٹھیوں میں شہزادیوں کی طرح رکھا۔ میں نے یہ دونوں کوٹھیاں انہی لڑکیوں کو استعمال کر کے اور کچھ نقد رشوت دے کر الاٹ کرائی تھیں....

"پھر پاکستان بنانے والا اللہ کو پیارا ہو گیا اور پاکستان میں بادشاہوں کی حکومت شروع ہو گئی۔ سیاستی کارنگ روپ بدلنے لگا۔ انداز صنعتی ہونے لگے۔ بے حیائی بڑھنے لگی۔ امریکہ کی مالی امداد آنے لگی تو اس کے ساتھ امریکہ کا ننگا کلچر بھی آگیا۔ جن کے پاس جاگیر اور دولت تھی وہ سرکار کے منظورِ نظر بننے لگے۔ اسمبلیوں کے ممبر بننے لگے۔ خوشامد اور رشوت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ سمگلنگ باقاعدہ پیشہ

بن گیا۔ میرے پاس دو کوٹھیاں تھیں، دو کاریں بھی ہاتھ آگئیں۔ اداکاری کا کمال اور زبان کا جادو مجھے حاصل تھا۔ بڑی شوخ، چالاک اور حسین لڑکیاں میرے قبضے میں تھیں۔ انہی اوصاف کے زور پر لوگ سوسائٹی اور سرکاری حلقوں میں اونچا مقام حاصل کر رہے تھے۔ سمگلر اور اُونچے درجے کے بردہ فروش بادشاہی کر رہے تھے۔ میں بھی بادشاہ بن گیا....

"خدا جب کسی قوم کو سزا دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے حاکموں پر کچھ جیسے آدمیوں کو غالب کر دیتا ہے۔ میں اُن پر غالب آگیا۔ آپ ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی ہیں۔ آپ سوسائٹی کے بھیدی ہیں مگر آپ دونوں مجھے جب بھی ملے اور جہاں بھی ملے، آپ نے مجھے احترام سے سلام کیا۔ آپ جانتے تھے کہ میں وزیروں اور اعلیٰ حاکموں کی منڈلی کا آدمی ہوں۔ آپ کے تھانیدار مجھے سیلوٹ کرتے تھے، لیکن خدا جب سزا دینے پر آتا ہے تو مجرم بے لگام ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ قانون اسی کے ہاتھ میں ہے اور خدا کے بندے کیڑے مکوڑے ہیں۔ خدا نے مجھے سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے میں نے یہ جرم اس قدر بے احتیاطی سے کیا کہ خود میرے گروہ کے آدمی جو مجھے استاد سمجھتے تھے، کہتے تھے کہ واردات کا سراغ مل جائے گا اور ہم سب پکڑے جائیں گے۔ میں نے کیا کیا بے احتیاطی کی؟ یہ میں آپ کو بتاؤں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ جرم ایک نہ ایک دن پکڑا جاتا ہے اور سزا ملتی ہے....

"میں نے سمگلنگ بھی کرائی۔ یہ میرا الگ گروہ ہے جس میں تین لڑکیاں ہیں۔ اگر آپ ان لڑکیوں کو دیکھیں تو آپ بڑ اٹھیں گے کہ دار، ہم تمہیں دس قتل معاف کر کے گولی کھولیں گے، یہ لڑکیاں ہمیں دے دو.... میں نے سمگلنگ کے ساتھ ساتھ بردہ فروشی بھی جاری رکھی۔ اس دولت سے سُوتی پٹڑے کی ایک مل لگالی۔ تین بڑی بڑی کمپنیوں میں لاکھا پیسہ لگایا کہ ان کا ڈائریکٹر بن گیا۔ میں فلمی اداروں اور سرکاری فنڈوں میں چندے دیتا تھا۔ اس سے میں معاشرے کا معزز فرد بن گیا....

"بہت عرصہ گزرا۔ میں نے چھوٹی چھوٹی خوبصورت بچیوں کو اغوا کرانے کا کام شروع کیا تھا۔ کشمیر کی بچیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ مقبوضہ کشمیر سے میں نے دو ہندو بچیاں بھی اغوا کرائی تھیں۔ نیلوفر دس میں سے پندرہ سولہ برس گزرے کاغان کے علاقے سے اغوا کیا تھا۔"

اُس نے نیلوفر کے اغوا کی وہی کہانی سنائی جو جمیل کو اُس کی ماں نے سنائی تھی۔ اسے اُس نے اُسی طرح پالا پوسا جس طرح نیلوفر نے ڈی۔ ایس۔ پی کو سنایا تھا۔

"نیلوفر خوبصورت بچی تھی لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ جوان ہو کر یہ اتنی خوبصورت نکلے گی۔" ڈار نے کہا۔ "میں نے اسے تعلیم دلائی اور سوسائٹی کے آداب سکھائے۔ میں اس کا چچا بنا رہا۔ اس قسم کی میری تین بھتیجیاں ہیں۔ انہیں بھی میں نے کیبن میں اغوا کیا تھا اور انہیں مختلف شہروں میں رکھ

www.paksociety.com

کران کا چچا زاد بھائی۔ انھیں بھی میں نے نیلوفر کی طرح پالا پوسا۔ تینوں کی شادی کردی ہے اور ہر ایک کا تیس تیس ہزار روپیہ لیا ہے۔ ان کے ساتھ بھی مجھے یہی ڈراما کھیلنا تھا جو آفتاب کے ساتھ کھیلا ہے....

"ان میں سے صرف ایک بدقسمت نکلا۔ وہ بڑا امیر آدمی تھا۔ قرض کے طور پر اس سے تیس ہزار روپیہ لے کر ایک لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کردی۔ شادی کے تیسرے مہینے فوری ضرورت بتا کر اور فوری واپسی کے تحت اس سے چالیس ہزار روپیہ لیا مگر وہ رقم کی طلبی کے لیے پیچھے پڑگیا۔ میں نے اسے قتل کروادیا۔ پولیس قاتل کو آج تک نہیں پکڑ سکی۔ تین سال گزر گئے ہیں۔ میں لڑکی کو کراچی لے گیا اور پچیس ہزار روپیہ قرض کے بہانے لے کر اس کی شادی ایک اور آدمی کے ساتھ کردی....

"نیلوفر کے متعلق بھی میرا یہی پروگرام تھا لیکن آفتاب کی بہت سی جائداد تھی۔ میں اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اغوا کرایا اور ڈاکہ بھی ڈلوایا تاکہ پولیس اسے ٹاکوؤں کی وارداتیں سمجھے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو بتایا تھا کہ ٹرک اور اچھی کہاں رکھے ہیں اور جائداد کے کاغذات میں نے ہی اپنے آدمیوں کو بتایا تھا کہ کہاں رکھے ہیں۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے واردات کی۔ میرے آدمی آفتاب کو اٹھا لے گئے اور اس کو کہاں میں۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے واردات کی۔ میرے آدمی آفتاب کو اٹھا لے گئے اور اس کو کہاں میں۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے واردات کی۔ میرے آدمی آفتاب کو اٹھا لے گئے اور اس کو کہاں میں۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے واردات کی۔ میرے آدمی آفتاب کو اٹھا لے گئے اور اس کو کہاں میں۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے واردات کی۔ میرے آدمی آفتاب کو اٹھا لے گئے اور اس کو کہاں

لے کے پڑے۔ ناکران پر ایک سرخی کا خون لگایا اور کپڑے راستے میں بکھیر دیئے....

"ساحی پر ایک روز نظر پڑی۔ یہ لڑکی مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ جوانی جوان ہوچکی تھی اس لیے یہ میرے کاروبار کے لیے بیکار تھی مگر یہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے وقتی طور پر اسے تفریح کا ذریعہ بنانے کا ارادہ کرلیا۔ اسے پیسے دیتے، ورغلایا، کار میں بٹھا کر جنگل میں لے گیا لیکن یہ میرے ہاتھ نہ آئی اور اوپر سے جمیل آگیا۔"

کاردار نے تفصیل سے سنایا کہ جمیل نے کس طرح اس کا تعاقب کیا اور اس کی اس سے لڑائی ہوئی اور جمیل اسے کھائی میں پھینک گیا تھا۔

"میں نے دلیورات میمن دکاندار کے ہاتھ بیچے تھے"۔۔۔ کاردار نے کہا۔۔۔ "وہ میرا پرانا گاہک تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک انگوٹھی جس کے اندر نیلوفر کی تصویر تھی وہ ساحی خرید کر لے گئی اور یہ انگوٹھی جمیل کی انگلی سے برآمد ہوئی۔ اتفاق سے جمیل کی میرے ساتھ لڑائی بھی ہوئی تھی اور اس نے واردات سے پہلے آفتاب اور نیلوفر کو دھمکی بھی دی تھی کیونکہ نیلوفر کی ہتھیلی سے نکلی ہوئی گولی ایک دیہاتی پہ لگ گئی تھی۔ جمیل پکڑا گیا اور وہ فرار ہوگیا۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب پیش کرو۔ تفتیش کا رخ جمیل کی طرف ہوگیا ہے۔ میں نے انسپکٹر خالد کو اپنے انڈر سوسخ میں لیے رکھا اور تفتیش کا رخ جمیل کی طرف رکھا۔"

"مگر تم نے خالد کو رشوت بھی دی ہوگی"۔۔۔ ایس پی نے کہا۔

"ضرورت ہی نہیں تھی"۔۔۔ کاردار نے جواب دیا۔۔۔ "وہ میری اس حیثیت سے مرعوب تھا جو مجھے سوسائٹی میں اور آپ کے محکمے میں حاصل تھی۔ آپ یہیں بھاگے بھاگے پھر تے رہتے ہیں، صرف اس لیے کہ کاردار کی تھیلی کا خاندان قتل ہوگیا ہے۔ اگر یہ واردات کسی عام شہری کی ہوتی تو آپ کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگتی اور کیس آپ کی فائلوں میں گم ہوجاتا۔۔۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ مجھے امید تھی کہ جمیل یہاں سے چلا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجائے گا مگر وہ نہیں رہا۔ آپ کی ایمی سی۔ آئی۔ ڈی ہے میری اپنی سی۔ آئی۔ ڈی ہے۔ میرے دو آدمی انسپکٹر خالد کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے تفتیش پر ان کی نظر تھی۔ میمن کی دکان پر انسپکٹر خالد گیا تو بھی میرا ایک آدمی دیکھ رہا تھا۔ میمن نے خود ہی مجھے فون پر بتادیا کہ انگوٹھی کے ذریعے راز فاش ہوگیا ہے۔ رات کو میمن کو تھانے جانا تھا۔ وہ آدمی گھات میں تھے۔ انہوں نے اس ڈبلے پتلے میمن کو اسی کے ایک ٹرک میں بند کیا اور اٹھا کر لے گئے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"اسے گذشتہ رات قتل کردیا ہے"۔۔۔ کاردار نے جواب دیا۔۔۔ "میں اسے بچانا چاہتا تھا لیکن حالات نے مجبور کردیا تھا۔"

"لاش کہاں ہے؟"

"برآمد کروادوں گا"۔۔۔ کاردار نے کہا۔۔۔ "اسے بھی انسپکٹر خالد کی طرح ایک ویران مکان میں قید کر رکھا تھا۔۔۔ میمن نے بتایا کہ مسز 3 انگوٹھی اور اس کی خفیہ ڈائری انسپکٹر خالد کے پاس ہے تو میں خالد کو مہروب دھمکا کر اس مکان تک لے گیا اور وہاں بند کردیا۔ میں اسے بھی قتل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر کرنا پڑا۔ یہ میری غلطیاں تھیں جنہوں نے مجھے پکڑوایا ہے۔ خدا نے مجھے سزا دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اس لیے میرا دماغ غلط باتیں سوچنے لگا تھا۔ ان دونوں کو میں پہلے ہی قتل کروادیتا تو میں پکڑا نہ جاتا....

"پولیس جمیل کو تلاش کرتی رہی ہے۔ میرے آدمی بھی اسے ڈھونڈتے رہے ہیں۔ وہ نظر آجاتا۔ اسے بھی قتل کردیا جاتا اور میں آپ کی فائلوں میں اپنے انڈر سوسخ سے لکھوا دیتا کہ قتل اور ڈاکے کے مجرم اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا ہے۔۔۔ آفتاب کا میں نے اس غار میں جا رکھا اور جائداد کی منتقلی کے لیے ایک اسٹامپ اس کے پاس رکھ کر کہا کہ دستخط کردو گے تو رہا کردیتے ہوگے۔ اس سے پچاس ہزار روپے کا چیک بھی لکھوانا تھا لیکن چیک بک کہیں راستے میں گر گئی تھی۔ یہ اب تھانے میں پڑی ہے۔ انسپکٹر خالد کو آفتاب کے کپڑوں کے ساتھ ملی تھی۔ آفتاب نے دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ یہ بھی میری حماقت تھی۔ اس سلسلے میں مجھے جعل سازی کرنی چاہیے

Pakistan Point
Syed Azeem Pakistani

گھر کی چھتیں اور کواڑ بج رہے تھے۔ مکان ڈول رہا تھا۔ جمیل اپنی ماں اور بہن کے ساتھ کوٹھی میں بیٹھا تھا اور اجو دادا اس کوٹھی سے دُور نیچے اپنے گاؤں میں اپنے گھر بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔

"ساجی بیٹا!" — دادا نے بڑے پیار سے کہا — "طوفانی راتوں میں چلتے ساتھی بچھڑ جاتے ہیں اور بچھڑے ساتھی مل جاتے ہیں۔ راستے الجھ جاتے ہیں اور الجھے راستے سلجھ جاتے ہیں" — اُس نے آہ لی اور کہا — "تو بھی اپنے دادا سے بچھڑ جاتے گی جمیل نے مجھ سے ہاں کرالی ہے۔ کل وہ اپنی ماں کے ساتھ آرہا ہے۔"

اخباروں میں جب کاروار کے جرائم اور گرفتاری کی خبر چھپی تو ہر محفل میں یہ آواز سنائی دی — "سب سیاسی چکر ہے جی! جس سیاسی پارٹی کا داؤ چلتا ہے وہ اپنے مخالفوں کو اسی طرح جھوٹے مقدموں میں پھانس لیتی ہے۔"

* *

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھے۔ انسپکٹر خالد جب سگریٹ سلگاتا تو بھی اسے دیکھتے تھے اور بھکاری نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ اب انہوں نے سگریٹ کی بھیک مانگنی شروع کر دی تھی لیکن خالد ہر سگریٹ پی کر پاؤں تلے مسل دیتا تھا۔

بھولی جب کتر آپ سے باہر ہو گیا۔ بھولی پنڈی کا بابا سچیا جیب تراش تھا اور سات سری کے لوئر بازار میں گھومتا پکڑا گیا تھا۔ وہ اکڑ کر اٹھا اور بولا — "کیا یہ ضروری ہے کہ جہاں کوئی وارداتیں ہوں ہم تھانے کو لازم جھوٹا مارا جائے؟ بھولی کی رگ کو چرس کے لیے تنتنہ تھی۔

"یہ بہت ضروری ہے بھولی!" — انسپکٹر خالد نے طنز کیا۔

"مکھوج تو لگا کیں سکتے" — بھولی اکڑ کر بولا۔ "تھانے سے تم باہر نہیں نکلتے، تمہارے سپاہی چوکوں اور نہ ہوٹلوں کی دکانوں پر کھڑے سگریٹ بیڑیاں پیتے رہتے ہیں اور آفت جو ہر آتی ہے وہ ہمارے سر پر ڈال دیتے ہو"

"کہنے کو تم سب چور ہو" — انسپکٹر خالد نے تحمل اور طنز سے کہا۔ "تم ڈاکو اور کسی ہو۔ تم جانتے ہو یہ وارداتیں کس نے کی ہیں؟"

"میں جیب کتر ہوں ڈاکو نہیں" — بھولی نے کہا۔

"او حضور الو!" — ایک اور بولا — "میں تھانی گیر ہوں قاتل نہیں۔ آپ جانتے ہیں میری کیل جان ہے۔ اللہ قسم میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں"

"مجھے تو جناب جانتے ہی ہیں" — ایک مرثیل صورت مشتبہ بول اٹھا — "پرسال اسلام آباد کے ایک منتے کو ارٹ ٹکا لا توڑے پکڑا گیا۔ اس روز نہ ہوتے سے چھینے کاٹ کے رہا نہ ہوا ہوں۔ پرسوں سری آیا تھا۔ رات ایسے نہ تھانے بیٹھا۔ حضور اپنے مزاج کو ہر کہ دے رہے ہیں آپ؟ روٹی نہ دیں۔ ایک کش سگریٹ کا لگا لینے دیں۔ اللہ تیرا عمدہ اوپکا کرے"

"تم لوگ بولتے کیوں نہیں؟" — بھولی سب سے مخاطب ہوا — "تم اسے کہتے کیوں نہیں کہ سری میں ایک دنیا جمع ہے۔ ان میں بھلے بڑے بھی ہیں۔ ڈاکو وہ بھی ہو سکتے ہیں جو کاروں اور ٹیکسیوں پر پہاں آتے ہیں۔ تالے سکوٹروں والے توڑ سکتے ہیں۔ لاہور بلکہ میں کوٹھیوں والوں کے لوٹے کوٹھیوں کے تالے توڑ سکتے ہیں۔ چاقو کیوں کھنے گئے ہیں؟"

"اور وہ چوقل سوکیا ہے کون سا شرافت آدمی تھا۔ یہ کوٹھیوں میں، بنگلے والے ایک دوسرے کی بیویوں اور بہنوں کو اپنی بیویاں سمجھ لیتے ہیں، سالے نے کسی کی چھوکری پر ہاتھ ڈالا ہو گا اور مار کھا گیا" — پرکرے اٹھائی گیر کا تجربہ تھا۔ کہنے لگا — "ہم میں کون ہے جو اتنا بڑا ڈاکو ہے کہ ایک آدمی کو اغوا کر کے قتل بھی کر دے"

تمام مشتبہ گروہ بکواس کرنے لگا اور تھانے میں ہڑبونگ مچ گیا۔ سرکاری جیل اور بلوا تھا۔ وہ جو کہ کبھی تھے اور سنتے سے بھی ٹوٹنے ہوئے انسپکٹر خالد نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو چپ کرایا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں" — انسپکٹر بولا — "کوشش میں سے جو بھی وارداتوں میں شامل تھا اسے وعدہ معاف گواہ بنا کر نشاندہی کر دو... بولو صرف ایک آدمی کا ہاتھ کھڑا کر دو پھر سب کو چھٹی"

"سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سبھی چپ رہے؟

"شوفوک صاحب!" — تنگی بدحواس نے سکوت توڑا اور الفاظ تول تول کر بولنے لگا — "پنڈی کی نشاندہی آپ سے ہے جو میں نے کرائی تھی۔ نتھیلی کی نشاندہی بھی آپ کو یاد ہو گی۔ پنڈی سیٹلائٹ ٹاؤن میں میں نے آپ کی خاطر اپنا جان بیاد کر کے آپ کو ایک واردات کا کھوج دیا تھا اور اپنا مخبری دوست پکڑوایا تھا۔ اُس وقت وہ علاقہ آپ کے پاس ملک صاحب! میں نے کہاں کہاں آپ کی مخبری نہیں کی۔ میں صرف اپنی وارداتیں چھپا لیتا ہوں۔ یقین کیجئے صاحب! یہ وارداتیں باہر کے آدمیوں کی ہیں۔ استاد ہوں اناڑی نہیں؟"

انسپکٹر خالد جرائم پیشہ لوگوں کے بال بال سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب یہ جھوٹ بولتے ہیں تو ان کی بھنویں کس کس زاویے پر کھڑی ہوتی ہیں اور ان کے نتھنے کیسے کیسے رنگ بدلتے ہیں اور جب یہ سچ بولتے ہیں تو ان کا انداز جب دلچسپ کیا ہوتا ہے۔ وہ گذشتہ چودہ پندرہ گھنٹوں سے ان آٹھ دس چہروں کے اتار چڑھاؤ اور آتے جاتے تاثرات کی خوب سے دیکھ رہا تھا اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس وارداتوں کے ساتھ ان میں سے کسی کا کوئی تعلق نہیں۔

انسپکٹر خالد کی ہر پولیس انسپکٹر کی طرح ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ جو جرائم پیشہ افراد اس کے لیے مخبری بھی کیا کرتے تھے بھی اسے تفتیش کے لیے جھنجھٹ سے بچا لیا کرتے تھے بعض کیسوں میں اُسے کیس مضبوط کرنے کے لیے ذہن سے جھوٹے گواہ بنانے پڑتے تھے۔ اس حد دکے عوض وہ انہیں چھوٹی موٹی وارداتوں کی اجازت دے دیتا تھا۔ ان میں سے کسی کے خلاف کیس کورٹ میں ہوتو وہ اسے گرفتار کر کے اسے بری کرا لیتا تھا۔ بہرحال پولیس اور جرائم پیشہ لوگوں کے درمیان تعلقات ایسے تھے کہ انسپکٹر خالد ان پر تنقید کرنے سے گریز کرتا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں، ذہن پر زور دیا اور آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا اور بولا — "میں تمہیں چھٹی دے دیتا ہوں سری سے کوئی ایک دن کے لیے بھی غیر حاضر نہ ہو" — پھر اس نے دو ستانہ لہجے میں کہا — "تمہیں شرم آنی چاہیئے کہ باہر کے آدمی تمہارے علاقے میں وارداتیں کر کے چلے جاتے ہیں۔ خیر تو میری مدد کرو"

"بس ہی لیں ملک صاحب!" — تین چار آدمی ایک ہی ساتھ بول اٹھے — "ہم آپ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں تحریری کریں گے"

"وہ جنتر اس کے کہ انسپکٹر خالد کچھ کہتا سبھی ہجوم کر کے دروازے سے نکل گئے اور وہ خلاؤں میں بھٹکنے کے لیے رہ گیا۔ وہ گذشتہ رات شاہی، وجو اور شہزاد سے بھی تفصیلی پوچھ گچھ کر آیا تھا۔

تینوں جوان سال لڑکیاں ہی ماں پکڑ ہوتی تھیں اور اونچے درجے کے ہوٹلوں میں بیٹھتی اٹھتی تھیں کسی بیرونی تھانے کی لڑکیاں معلوم ہوتی تھیں لیکن سوائے پولیس، سری اور پنڈی کی زمین دوز دنیا کے باسیوں اور سری پولیس کے لیے جانے والے مخبروں کے کسی کو گمان تک نہ ہوتا تھا کہ وہ طوائفیں ہیں اور کھلے بندوں کھوج پچھ

www.paksociety.com

جھلکے ہیں؟"

"نہیں ابھی نہیں" — ساجی باہر کو چل پڑی — پھر سسکی:

"دادا ذرا ٹھہرو" — وہ رکی تو جمیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "سوتم سے قیمتی تو نہیں، ایک انگوٹھی میری طرف سے سہی لینا، تمہاری اپنی دکان ہے"

"تم تو پگلے ہو چاچا!" — ساجی نے مسکرا کر کہا اور چل گئی۔

گاؤں کو آتے دو کتی بارنگی اور رومال سے انگوٹھی نکال کر دیکھی۔ سونے کی چمک میں اسے جمیل کا چہرہ مسکراتا نہیں نظر آ رہا تھا۔ دو مسکراتی، متانت سی چال چلتی وہ رہی سے اتری اور گھر پہنچ گئی۔ دادا اور جمیل کے چہرے کے رنگ اٹھے۔ وہ تیز خرام صحن عبور کر کے کمرے میں گئی۔ انگوٹھی اور جیسے اپنے نین کے سوٹ کیس میں چھپا دیئے اور خود باہر کی طرف بھاگی۔ اسے ابھی ہانڈی روٹی بھی کرنی تھی لیکن دیگ کا ٹھنڈی بھی بنی ہوئی تھی اور سکی کی رشیاں بھی، ساجی نے سوالیہ نگاہوں سے دادا کی طرف دیکھا۔

"جمیل نے پکائی ہیں یہ روٹیاں" — دادا نے شگفتہ سے لہجے میں کہا — "ہانڈی بھی اسی نے پکائی ہے چلو دیکھ ذرا کتنی مزے کی ہے میں نے کہا نہیں تھا جمیل بیٹا بڑا کاریگر ہے؟"

"ہونہہ" — ساجی ناک چڑھا کے بولی "خاک پکائی ہوگی ہانڈی"

وہ رات ساجی کی عمر کی بڑی لمبی رات تھی۔ نہ گزرنے میں آتی تھی، نہ نیند آتی تھی۔ آدھی رات کو اسے اونگھ آ گئی تو ایسی سوتی کہ دادوں کے عقب میں سورج بہت اوپر چڑھ آیا تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ بڑا ڈراؤنا خواب تھا جو اس کو ہلیلے کی طرف بھاگی لیکن جمیل ہنس بھی رہا تھا، گا رہا بھی تھا اور رات کی بچی ہوئی مکئی کی روٹی بھی مزے سے کھا چکا تھا اور وہ دھیں مسکرا کر دادا کو بھی کھلا چکا تھا۔ اس نے مرغیوں کا گوبر بھی کھلا کر کے الگ ڈھیر کر دیا۔ ساجی کے کرنے کو یہی رہ گیا تھا کہ گھر میں جھاڑو دے دے اور اپلے پاتھ دے لیکن اس نے گوبر سے بھری اور بار جا کر پھینک آئی۔ ساون میں اپلے بالکل بے فائدہ بے کار تھا۔ پل پل مینہ برستا تھا۔

گھر کے کام کاج سے فارغ ہو نے ہی اس نے مرغیاں کھولنے اور جمیل کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ گاؤں کو جھیل ہو کر جمیل نے ساجی کو کمر سے اٹھا اور اٹھا کر گھوڑی پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر اسی جگہ بیٹھے تھے جہاں گھر نے سے میں پہلی فاتحہ کے سوا کچھ دیکھ نہ سکتا تھا۔ ساجی نے قمیض کی پہلو والی جیب سے انگوٹھی نکالی اور جمیل کا ہاتھ کر اس کی درمیانی انگلی میں پہنا دی۔ ساز سوزوں سی نکلا جمیل انگوٹھی کو دیکھ رہا تھا کہ ساجی نے اس کی چھوٹی انگلی سے پتیل کی انگوٹھی اتار کر اپنی درمیانی انگلی میں پہن لی۔

"یہ انگوٹھی کتنے کی لائی ہو؟" — جمیل کے چہرے کا جیسے رنگ ہی اڑ گیا ہو۔

"ناپ کم ساٹھ پر"

"دھچکے سے جمیل کا منہ کھل گیا۔

"ہونہہ" — ساجی نے گردن کو خم دے کر پیار سے تکبر سے کہا — "تم نے تو ڈراسا منہ بنایا ہے میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ ایسی چار انگوٹھیاں خرید سکتی ہوں۔ سچی جمیل! یہ میرے اپنے پیسے ہیں، گھر کے پیسے تو میں نے صندوق میں رکھے ہوئے ہیں۔۔۔ پر ایک بات کہوں۔۔۔ دادا کو نہ بتانا" — اس نے جمیل کا چہرہ دونوں ہاتھوں تھام کر پوچھا — "تم قیمت کیوں پوچھتے ہو؟ پیار کی بھلا قیمت پوچھا کرتے ہیں؟" — اس نے بڑی سادگی سے پوچھا — جمیل، ہم گناہ تو نہیں کر رہے، ہم تجھے اچھے لگتے ہو نا! یہ گناہ تو نہیں؟"

جمیل جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں انگوٹھی پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ غریب اور بے یار بے بس ہے اور ساجی نے چادر آنے کی پیتل کی انگوٹھی کے بدلے پچیس بے کا سونا دے کر اس پر بھروسہ ظاہر کی ہے۔ اسے تلخ سا احساس ہوا کہ اس کے پاس کالی گھوڑی اور اس کی زین کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسے یوں صدمہ ہوا جیسے وہ خواب میں ملکوں کی رانی سے بیاہ رچا رہا تھا اور آنکھ کھل گئی:

"ساجی!" — اس نے یاس آلود لہجے میں کہا — "میں نے تمہیں چار آنے کی پیتل کی انگوٹھی دی ہے۔۔۔ وہ چپ رہی اور یکایک اس کی آواز جذباتی ہو گئی۔ بولا — "میں مفلس ہوں ساجی! میں پردیسی ہوں"

"تم مرے سے دل کے راجہ جو ہیں!" — ساجی نے بے ہنگام کی بات کاٹ دی اور ہاں اس کی گردن میں بولی — "تم اب پردیسی نہیں، اب تو کہیں جانے نہ دوں گی" — ایک جھٹکے سے پرے ہو کر پوچھا — "ماں خط لکھو گے؟"

"ابھی نہیں"

"مقدمے کی تیاری ٹھیک نہیں" — ساجی نے روٹھ کر کہا — "آج لکھ دو نا؟"

جمیل نے ساجی کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے ایک اور دھچکہ لگا۔ ساجی کی شربتی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"صبح ہی لکھ دادوں گا ساجی! میں کہیں نہیں جاؤں گا"

"بہن سب بھی بدا آتی ہے نا؟" — ساجی نے یوں کہا جیسے جمیل کے ذہن سے بہن کی یاد دھو ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یا جیسے دو گم شدہ بہن اس کی رقیبہ ہو۔ اس کی رقیبہ ہو اس کے اتنے دل کش چہرے سے بہن کا نام پکڑ کر پوچھ رہی ہو۔

"وہ تو یاد آتی ہی رہے گی" — جمیل نے آہ لے کے کہا۔ "ننھی سی بچی کو ظالم کھوں میں سے اٹھا کر لے گئے نہ جانے مار دی تھی یا کہیں بیچ دی تھی یکسی نے پال لی تھی" — جمیل کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔

نیلوفر کی طبیعت تو اسی شام سنبھل گئی تھی اور آفتاب کے متعلق کاروار نے جھوٹ بول دیا تھا کہ دوسری سپتال

www.paksociety.com
Azeem Paksitanipoint

"وہ خود گھر میں تھا یا اسے کوئی اٹھا لایا تھا؟"

"اجو دادا کے گھر ایک آدمی آیا ہوا ہے، وہ لایا تھا۔"

"لڑکے کا کیا حال ہے؟"

"اب ٹھیک ہے خان جی! زخم معمولی تھے۔"

"اجو دادا کون ہے؟"

"خواص کے پاس رہتا ہے۔"

"میرے ساتھ چلو۔"

انسپکٹر خالد کانسٹیبلوں کو ساتھ لیے اجو دادا کے گھر کی طرف چل دیا۔ سکوڑ والے دونوں لڑکے اس کے ساتھ تھے۔ انسپکٹر انہیں شناخت کے لیے ساتھ لے آیا تھا۔

جمیل گھر میں اکیلا تھا۔ ساجی ڈھور ڈنگر لے کر کھیتوں میں گئی تھی اور اجو دادا بھی گاؤں سے باہر چلا گیا تھا۔ جمیل ہونٹ کاٹ کر دانتوں سے سوج گئے تھے۔ آنکھوں کے قریب نیلے نیلے آبھرے ہوئے نشان۔ بائیں کان کے قریب کال کی طرف بھی نیلی سی سوجن تھی۔ ساجی نے گھر ہی رہنا چاہا تھا لیکن جمیل اور دادا نے اسے دبا لیا۔ دادا نے کہا تھا "آج خواصو کھلوا ہوا ہے۔ باش ہو گئی تو ڈھور ڈنگر جانے کتنے روز گھر ہی بند رہے۔" ساجی بادل نخواستہ چلی گئی تھی۔

نمبردار نے دادا کے دروازے پر دستک دی تو انسپکٹر خالد کواڑ کھول کر اندر چلا گیا۔ ساجی بھی دھڑکتے دل سے کمرے میں پہنچ گئے۔ جمیل اٹھ کے باہر آیا اور حیرت زدہ سا ہو کر انسپکٹر خالد کے سامنے آ رکا۔ انسپکٹر نے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس کے چہرے پر فتح کی رونق آ گئی۔

"یہی تھا۔۔۔ سکوڑ والے دونوں لڑکوں نے بیک وقت کہا۔

"یہ چوٹیں کس طرح آئیں؟" ۔۔۔ انسپکٹر خالد نے جمیل کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک آدمی سے لڑائی ہو گئی تھی" ۔۔۔ جمیل نے کہا۔

"کب؟"

"کل شام"

"وہ آدمی کون تھا؟ کہاں ہے؟"

"اللہ ہی جانتا ہے خاں جی!" ۔۔۔ جمیل نے بے پروا سا ہو کے کہا ۔۔۔ "میرے ساتھ لڑتے ہوئے میں گر پڑا تھا۔"

"تمہاری گھوڑی ہے؟"

"ہے؟"

کس رنگ کی؟"

"سیاہ رنگ کی۔"

انسپکٹر خالد نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو وہ جھکڑی لیے جمیل کی طرف بڑھا۔

اجو دادا جہاں کہیں گیا تھا وہاں سے بہت دیر بعد واپس آیا۔ پولیس جمیل کو گرفتار کر کے تھانے پہنچ چکی تھی اور گاؤں میں ہوم ہٹ چکا تھا۔ گلیوں سے گزرتے اجو نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ راہ چلتی عورتیں اور بچے اسے غیر معمولی سے گھور رہے ہیں۔ مرد اسے دیکھ کر یا تو ذرا پرے ہٹ جاتے ہیں یا بیگانہ سے لب بھینچے اور اجنبی انداز سے گزرتے ہیں۔

مسجد کے سامنے چند بچوں نے اسے گھیر لیا اور کہا ۔۔۔ "دادا! تمہارے گھر پولیس آئی تھی۔ تمہارے مہمان کو پکڑ کر لے گئی ہے۔"

تو دادا الاشی کا سہارا نہ لیتا تو اوندھے منہ گرتا۔ وہ بے جان ٹانگوں پر سنبھلتا پھر تیز برسوں کا کھایا ہوا جسم گھسیٹتا نمبردار اور چند اور آدمی آ گئے۔

"ہی خیر میں ساجی بھی موشیوں لے کے آ گئی ہے نمبردار اور ساجی کو یوں لگا جیسے گاؤں کا ایک ایک چھجہ، ایک ایک سایہ ایک اینٹ، گاؤں والوں کی گھورتی نگاہیں اور سرگوشیوں میں ہلتے ہونٹ کہہ رہے ہیں۔

نے ڈاکو کو پناہ دے رکھی ہے۔"

کے گھر چوری کا مال آتا ہے۔"

ی لیے تو اس کی پوتی مردوں کے کان کاٹتی ہے۔"

ی کو تیسے ہی نہیں بانہہ ہتی۔"

اکون تھا؟"

تھا، ڈاکو تھا، رہزن تھا۔"

لکا دور پار کا رشتہ دار تھا۔"

ڈاکو گھر آتا تھا؟"

وتی سے آشنائی تھی۔"

نے نمبردار اور علیش امام کو سن کر سناٹا دیا۔ جمیل ان کے گھر کس طرح آیا تھا اور اسے کس ارادے سے گھر میں شام کو جب بیٹھیں امام نے اذان دی تو اجو چونکا۔ تڑپ اٹھا جیسے مؤذن اس پر آواز سے کس رہا ہو۔ فجر کر لیا ہو کہ اجو ۔۔۔ "اللہ بہت بڑا ہے مگر اجو چوروں کا رکھوالا ہے۔"

تو معلوم تھا کہ جمیل نے اس شہر کی آدمی کو کیا کہا کی دشمنی کا [illegible]

www.paksociety.com

Azeem Paksitanipoint

"ان کا مجرم تو جرم نے پکڑ لیا ہے"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے کہا۔۔۔ "اور اس نے اقبالِ جرم بھی کر لیا ہے"۔

"سچ؟"

"جی ہاں! اور ہو سکتا ہے اسی سے مسٹر آفتاب کا سراغ بھی مل جائے"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے کہا۔ "ہم ابھی ابھی اسے موقعہ واردات سے لائے ہیں"۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل اندر آیا۔ انسپکٹر خالد نے اسے کہا۔۔۔ "اسے حوالات میں بند کر دو۔ رات گیارہ بارہ بجے کام شروع کریں گے۔ ہاں جاتے کا جامہ تلاشی لے لینا۔"

"تلاشی لے لی ہے"۔۔۔ کانسٹیبل نے کہا۔۔۔ "اس کی جیب سے یہ چھوٹا سا چاقو نکلا ہے اور یہ انگوٹھی اس نے پہن رکھی تھی۔ اتروالی ہے"۔

حوالات میں پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا ملزم کے پاس اور کوئی چیز نہیں چھوڑی جاتی چنانچہ وہ انگوٹھی جو ساجی نے پھمن روپوں پر خرید کر اسے پہنائی تھی وہ تھانے والوں نے اتار لی اور کہا کہ یہ جبسرِ میں درج ہو جائے گی اور واپس مل جائے گی۔

جمیل اس انگوٹھی کا نقوش سے اوجھل تو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن بے بس تھا۔ ہاں گیا اور انگوٹھی سپاہیوں کے حوالے کر کے کہا۔۔۔ "دیکھو دوستو! اگر میں پھانسی چڑھ گیا تو یہ انگوٹھی میری انگلیاں پہنا دینا"۔

کانسٹیبل نے چاقو اور انگوٹھی انسپکٹر خالد کے سامنے رکھ دی۔ نیلوفر نے انگوٹھی دیکھی تو وہ اچک کر لپکی اور انگوٹھی اٹھا کر اسے ہر پہلو سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ انگوٹھی کو ایک آنکھ تک لے گئی۔ انگوٹھی کے اوپر والے مخروطی حصے میں سفید ساجو موتی جڑا ہوا تھا، اسے آنکھ سے نکالا۔

"ٹک صاحب!"۔۔۔ نیلوفر چلائی اور لرزتے ہاتھوں سے انگوٹھی انسپکٹر خالد کو دیتے ہوئے کہا۔۔۔ "اس انگوٹھی میں دیکھئے۔ اس کو تاپی میں جما لیجئے"۔

انسپکٹر نے ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ موتی کے ساتھ لگائی پھر ہنکار نیلوفر کو دیکھا اور ایک بار پھر موتی سے جھانکنے لگا۔ اس کے چہرے سے تاثر بدلتا جا رہا تھا۔ نیلوفر کے ہونٹ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"اس کے اندر آپ کی تصویر ہے"۔۔۔ انسپکٹر نے نیلوفر سے کہا۔

"جی ہاں!"۔۔۔ نیلوفر بولی۔۔۔ "شادی کے فوراً بعد مسٹر آفتاب انگلینڈ گئے تھے۔ میری ایک تصویر ان کے پاس تھی۔ وہاں انہوں نے تصویر کو ذرا جتنے سائز میں کروا کر اس انگوٹھی میں فٹ کرا لیا تھا۔ کہتے تھے انگلینڈ میں یہی انگوٹھی کا بہت رواج ہے۔ یہ دراصل موتی نہیں شیشہ ہے جس سے چھوٹی چیز بڑی نظر آتی ہے۔ اندر تصویر تو ذرا جتنی ہے لیکن شیشے سے کتنی بڑی دکھائی دیتی ہے۔ مسٹر آفتاب ہر وقت یہ انگوٹھی پہنے رکھتے تھے اور رات کو بھی نہیں اتارتے تھے اُس رات بھی یہ ان کی انگلی میں تھی"۔

انسپکٹر نے دروازے میں کھڑے کانسٹیبل سے کہا اور جمیل کو لے آتے۔ تھوڑی دیر بعد جمیل جھکا جھکا سا اندر داخل ہوا۔ [illegible] کے ہونٹوں [illegible] اور [illegible] تھی۔ [illegible] کہا۔ "آفتاب!"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ بولا۔۔۔

"ان کا مجرم تو جرم نے پکڑ لیا ہے"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے کہا۔۔۔ "اور اس نے اقبالِ جرم بھی کر لیا ہے"۔

"سچ؟"

"جی ہاں! اور ہو سکتا ہے اسی سے مسٹر آفتاب کا سراغ بھی مل جائے"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے کہا۔ "ہم ابھی ابھی اسے موقعہ واردات سے لائے ہیں"۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل اندر آیا۔ انسپکٹر خالد نے اسے کہا۔۔۔ "اسے حوالات میں بند کر دو۔ رات گیارہ بارہ بجے کام شروع کریں گے۔ ہاں جاتے کا جامہ تلاشی لے لینا۔"

"تلاشی لے لی ہے"۔۔۔ کانسٹیبل نے کہا۔۔۔ "اس کی جیب سے یہ چھوٹا سا چاقو نکلا ہے اور یہ انگوٹھی اس نے پہن رکھی تھی۔ اتروالی ہے"۔

حوالات میں پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا ملزم کے پاس اور کوئی چیز نہیں چھوڑی جاتی چنانچہ وہ انگوٹھی جو ساجی نے پھمن روپوں پر خرید کر اسے پہنائی تھی وہ تھانے والوں نے اتار لی اور کہا کہ یہ جبسرِ میں درج ہو جائے گی اور واپس مل جائے گی۔

جمیل اس انگوٹھی کا نقوش سے اوجھل تو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن بے بس تھا۔ ہاں گیا اور انگوٹھی سپاہیوں کے حوالے کر کے کہا۔۔۔ "دیکھو دوستو! اگر میں پھانسی چڑھ گیا تو یہ انگوٹھی میری انگلیاں پہنا دینا"۔

کانسٹیبل نے چاقو اور انگوٹھی انسپکٹر خالد کے سامنے رکھ دی۔ نیلوفر نے انگوٹھی دیکھی تو وہ اچک کر لپکی اور انگوٹھی اٹھا کر اسے ہر پہلو سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ انگوٹھی کو ایک آنکھ تک لے گئی۔ انگوٹھی کے اوپر والے مخروطی حصے میں سفید ساجو موتی جڑا ہوا تھا، اسے آنکھ سے نکالا۔

"ٹک صاحب!"۔۔۔ نیلوفر چلائی اور لرزتے ہاتھوں سے انگوٹھی انسپکٹر خالد کو دیتے ہوئے کہا۔۔۔ "اس انگوٹھی میں دیکھئے۔ اس کو تاپی میں جما لیجئے"۔

انسپکٹر نے ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ موتی کے ساتھ لگائی پھر ہنکار نیلوفر کو دیکھا اور ایک بار پھر موتی سے جھانکنے لگا۔ اس کے چہرے سے تاثر بدلتا جا رہا تھا۔ نیلوفر کے ہونٹ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"اس کے اندر آپ کی تصویر ہے"۔۔۔ انسپکٹر نے نیلوفر سے کہا۔

"جی ہاں!"۔۔۔ نیلوفر بولی۔۔۔ "شادی کے فوراً بعد مسٹر آفتاب انگلینڈ گئے تھے۔ میری ایک تصویر ان کے پاس تھی۔ وہاں انہوں نے تصویر کو ذرا جتنے سائز میں کروا کر اس انگوٹھی میں فٹ کرا لیا تھا۔ کہتے تھے انگلینڈ میں یہی انگوٹھی کا بہت رواج ہے۔ یہ دراصل موتی نہیں شیشہ ہے جس سے چھوٹی چیز بڑی نظر آتی ہے۔ اندر تصویر تو ذرا جتنی ہے لیکن شیشے سے کتنی بڑی دکھائی دیتی ہے۔ مسٹر آفتاب ہر وقت یہ انگوٹھی پہنے رکھتے تھے اور رات کو بھی نہیں اتارتے تھے اُس رات بھی یہ ان کی انگلی میں تھی"۔

انسپکٹر نے دروازے میں کھڑے کانسٹیبل سے کہا اور جمیل کو لے آتے۔ تھوڑی دیر بعد جمیل جھکا جھکا سا اندر داخل ہوا۔ [illegible] کے ہونٹوں [illegible] اور [illegible] تھی۔ [illegible] کہا۔ "آفتاب!"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ بولا۔۔۔

"جی ہاں! آفتاب ہی ہے۔ آفتاب!"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ بولا۔۔۔

"یہ انگوٹھی کہاں سے لائے ہو؟"۔۔۔ انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔

"یہ میری اپنی ہے"۔۔۔ جمیل نے کہا۔۔۔ "کیوں؟ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"میں پوچھ رہا ہوں"۔۔۔ انسپکٹر نے کہا۔۔۔ "اور سلام نہیں ملا اور کیا کچھ پوچھوں گا۔ یہ انگوٹھی تم کہاں سے لائے ہو؟"

"کیا ہے اس انگوٹھی میں؟"

"اتنا سے ایک اور دم کا شوت"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے کہا۔۔۔ "ڈاکہ اور قتل، یہ انگوٹھی چوری کی ہے مقتول کی انگوٹھی"۔۔۔ اس نے ذرا آگے جھک کر جمیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور دھیمی مگر تھکنے آواز میں بولا۔۔۔ "یہ انگوٹھی تمہارے پاس کس طرح آئی؟"

جمیل کی نگاہوں میں ساجی، اس کا بھولا پن اور مسکراتا ہوا معصوم چہرہ گھوم گیا اور جس پیار سے اس نے اسے انگوٹھی پہنائی تھی، وہ اس کے سینے میں چبھنے لگا لیکن وہ کسی طور اسے کوئی نہ نقصان پہنچے، نہ کہیں سے چرا کر اسے انگوٹھی دی تھی۔ ساجی کا خیال آتے ہی اس کا خون کھول اٹھا اور سرفانگی بیدار ہو گئی۔

"بولو دوست بولو"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے اسے چپ دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "یہ انگوٹھی کہاں سے آئی ہے؟"

"میں نہیں بتاؤں گا"۔۔۔ جمیل پختہ اور پُرعزم لہجے میں کہنے لگا۔۔۔ "تم شرفوں والے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالو گے، گناہ اور ہم اپنی عزت پر لولہان ہو جائیں تو گنہگار۔ تم ہمارے بچوں کو جانور سمجھ کر گولی مار دو تو کوئی بات نہیں ہے اور ہم۔۔۔"

نیلوفر اسے بڑی غور سے دیکھ رہی تھی جب جمیل نے بدلے ہوئے پُروقار لہجے میں بات کی تو اسے جمیل کا چہرہ دادا کا سا ہو جاتا نہیں تھا۔ وہ چہرہ جو اس نے اُس وقت دیکھا تھا جب جمیل زخمی بچے کو اٹھائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے اسی لہجے میں آفتاب اور نیلوفر کو دھمکی دی تھی۔

"ٹک صاحب!"۔۔۔ نیلوفر کرسی سے اچھل پڑی اور بولی۔۔۔ "یہی تھا وہ۔ وہی ہے۔ اسی نے ہمیں دھمکی دی تھی اور کہا تھا، خون کا بدلہ خون ہے۔ اور یہی کہا تھا، تمہاری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔۔۔ یہی ہے۔۔۔ اُسی رات ہماری کوٹھی میں ڈاکہ بنا اور مسٹر آفتاب قتل ہوئے۔۔۔"

"بہت داد، دوست!"۔۔۔ انسپکٹر نے جمیل سے کہا۔ جمیل چپ چاپ حیران پریشان انہیں دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔۔۔ "ایک واردات کے فوراً بعد ایک اور واردات؟ پیشہ ور معلوم ہوتے ہو۔ ہوش اور پیشتر اس کے کہ جمیل کچھ کہتا۔ خالد نے کانسٹیبل سے کہا۔۔۔ "بند کر دو۔ رات کو باتیں ہوں گی"

اور جمیل کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"آپ کو یقین ہے کہ مسٹر آفتاب قتل ہو چکے ہیں؟"۔۔۔ نیلوفر نے پوچھا۔

"[illegible] مسٹر آفتاب!"۔۔۔ انسپکٹر خالد نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ بولا۔۔۔

www.paksociety.com

جو تھوڑے سے پیسے تھے اٹھوا لے کو دے دیئے اور یہاں آ پہنچی۔ یہاں آ کے چکا گئی صبح صبح پہنچ ہوں اور ماری ماری پھر رہی ہوں، ایک نوالا روٹی بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ بیٹی! ہاتھ کبھی پھیلایا نہیں، محنت مزدوری کی عادت ہے۔" اس نے نیلوفر سے رحم طلب سے لہجے میں پوچھا۔ "بیٹی! شاید تم نے دیکھا ہو، کالی گٹھڑی پر آیا تھا۔ بڑا خوبصورت جوان ہے۔"

وہ جمیل کی ماں تھی۔

"نہ اماں!" ۔۔۔ نیلوفر نے کہا۔ "ان دنوں آدھا پاکستان مری میں جمع ہے۔ چلنے پھرنے کو جگہ نہیں ہے، کون کسی کو پہچان سکتا ہے!" ۔۔۔ نیلوفر نے کچھ سوچا، وہ عورت گٹھڑی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "سنو اماں، تم ہمارے کوٹھی میں کیوں نہیں رہ جاتی۔ مجھے ملازمہ کی ضرورت ہے۔ تم بھی ضرورت مند ہو۔ تنخواہ دوں گی، روٹی دوں گی اور رہنے کو کمرہ دوں گی۔ گھر میں پھرنے کے بیٹے کو تدریش کرتی۔ بنا لیکن اماں! وہ اتنے پیسے کے بغیر مشکل سے ہی ملے؟ بھٹکی ہوئی، ماسٹر کی ماری ہوئی، بھوکی پیاسی ماں کے لیے یہی غنیمت ہے۔ بیٹا نہ ملا تو واپس جانے کے لیے چند پیسے ہاتھ آ جائیں گے اور اس وقت تک دو وقت روٹی اور ٹھکانے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"بیٹی!" ۔۔۔ اس نے کہا۔ "رہ جاؤں لیکن میں دیہاتی گنوار تیرے کس کام کی؟ تو تو بنگلے میں رہتی ہوگی۔"

نیلوفر کو ہنسی سی آ گئی بولی ۔۔۔ "بس تو رہ ہی جا اماں!"

جمیل نے کوئی ماری سے پہلے ماں کا خط لکھوایا تھا جسے جمیل کے گاؤں میں کوئی بھی نہ پڑھ سکا تھا، اس نے تو کہا دیا تھا جانے کون سی زبان میں لکھا ہے۔ یہ اردو زبان نہیں۔ اگلے روز ماں کی گڑھی سے بیماری گزر ہوا تو اس نے بڑی مشکل سے چند الفاظ پڑھ کر جمیل کی ماں کو بتایا تھا کہ تیرا بیٹا کوئی مری میں ہے اور مجھے بلا ہے لکھا ہے کہ کام بھی مل گیا ہے اور رہنے کو جگہ بھی، اور ماں اٹھ دوڑی تھی۔

رات کھانے کے بعد جمیل کی ماں نیلوفر کے کمرے میں فرش پر بیٹھی تھی۔

"بیگم صاحب جی!"

"نہ اماں!" ۔۔۔ نیلوفر نے ٹوک دیا۔ بولی ۔۔۔ "مجھے بیٹی ہی کہا کرو۔ مجھے کسی نے بیٹی کبھی نہیں کہا۔"

"تمہارے ماں باپ نہیں ہیں بیٹی؟"

"بچپن میں مر گئے تھے۔"

"تمہارے ساتھ اور کون رہتا ہے؟" ۔۔۔ جمیل کی ماں نے پوچھا۔ "شادی تو نہیں ہوئی ابھی؟"

"ہوئی تھی اماں!" ۔۔۔ نیلوفر نے آہ لے کر کہا۔ "لیکن ۔۔۔"

"لیکن کیا بیٹی؟"

"وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ کیا بتاؤں اماں!" ۔۔۔ نیلوفر نے ہچکی کر کہا۔ "شاید وہ قتل ہو گئے ہیں؟"

"ہائیں؟" ۔۔۔ جمیل کی ماں چونک اٹھی۔ "کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟ شاید قتل ہو گئے ہیں؟ شاید سے کیا مطلب

التہ تیرا سہاگ سر کرے میں بولوں نہ کہو ۔۔۔ کہو شاید قتل نہیں ہوئے ۔۔۔ بیوقوف کہیں بیٹی!"

جمیل کی ماں کے سب لہجے میں درد اور اداسی میں اپنا پن تھا۔ خلوص اور سادگی تھی جس سے نیلوفر ہمیشہ ناآشنا رہی تھی۔ وہ بنگلوں، کوٹھیوں اور مغربی طرز کے ہوٹلوں کی دنیا کے آداب سے واقف تھی۔ ان آداب میں تصنع اور فیشن پرستی تھی مگر اب اس کی روح کو یہ باتیں کڑوی کسیلی سی لگتی تھیں۔ اس کے جذبات مجروح ہوتے تھے اسے کسی نے نہیں کہا تھا کہ تو شاید قتل نہیں ہوئے۔

نیلوفر یقین ہونے لگا کہ اس کا خاوند قتل نہیں ہوا۔ اس نے ڈاکے اور خاوند کے اغوا اور قتل کی واردات سنا شروع کی تو جمیل کی ماں کا ردعمل ایسا تھا جیسے اس کی اپنی بیٹی گالھم اور سہاگ اجڑ گیا ہو۔ نیلوفر سناری تھی اور وہ سرکھ کر اس کے قریب ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ نیلوفر کے گھٹنے پر رکھ لیا تھا اور نیلوفر کو یوں قرار آ گیا تھا جیسے ماں نے اس کے دکھیارے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ نیلوفر ایک ایک تفصیل یوں سنانے لگی جیسے کوئی غم زدہ بیٹی اپنی ماں کے آگے سینے کے انگارے اگل رہی ہو۔

یہی کہانی اس نے پولیس والوں کو سنائی تھی لیکن سننے والوں کے دلوں میں درد نہیں سرکاری پن تھا۔ انہیں اس المیہ داستان سے استغاثہ کا ڈرامہ ترتیب دینا تھا۔ پھر یہی کہانی نیلوفر نے بارہا ملنے جلنے والیوں کو سنائی تھی لیکن سننے والیوں کے چہروں پر وہی تاثر تھا جو دادی اماں سے کوئی سنسنی خیز کہانی سننے وقت بچوں کے چہروں پر ہوتا ہے۔ صرف کلاردار تھا جسے اس کے ساتھ دلی وابستگی تھی لیکن اس نے کبھی اس سے تفصیلات نہیں پوچھی تھیں۔ زیادہ وہ پاس بیٹھا بھی تو مرد تھا۔ نیلوفر اسے لسوانی جذبات کی مظہر اور کیوں کر دکھائی دیتی۔ آج ایک عورت نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر، نم ناک آنکھوں سے باتیں کیں تو نیلوفر نے درد کی ٹیسوں میں بھی محسوس کی اور اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا دم گھٹ چلا تھا۔ اگر عورت نہ ہوتی تو شاید وہ بلبلے خبری میں ہی مر جاتی۔

"میرا خاوند بھی تین عرصہ ہو گیا تھا۔" جمیل کی ماں نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "جو ہم پر گزر رہی ہے وہ میرے سوا کون جان سکتا ہے بیٹی! لیکن جب تک لاش اپنی آنکھوں نہ دیکھ لو یقین نہ کرنا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔" اس نے دو پٹہ دونوں بازوؤں پر سلا کر کہا ۔۔۔ "اندر کمرے سے تو اپرا مالک زندہ ہوا در ظالموں کے پنجے سے چھوٹ آئے۔ خدا کا دیا کیا کرو بیٹی! دولت تو آنی جانی ہے۔ بڑا نام اللہ کا ہے صبح اٹھ کے قرآن مجید کی تلاوت کیا کرو۔ میں روز کا دیا کیا کروں گی۔ سورۂ مزمل نے دو دلوں کو زندہ کیا ہے بیٹی! اللہ کے کلام میں بڑا زور ہے۔ بہتے پانی کی رک جاتے ہیں۔ ان پڑھ سیاٹن کی باتیں نیلوفر کی رگ رگ میں اتر گئی تھیں۔ ماں کی حیات سلامت رہے کہ اس کی حیات ہی تھیں اور مر جو خاوند کی موت نے اس کی رگوں میں بھر دیا تھا، اس کی جان لیوا تلخی سرعت سے ختم ہونے لگی۔ جیسے کی ماں اسے یوں قابل احترام نظر آنے لگی جیسے وہ اس کے پاس خدا کا پیغام لے کے آئی ہو۔

اس کے جی میں آئی کہ اس عورت کو اپنے ساتھ آفتاب کے بستر میں سلا لے لیکن جمیل کی ماں کہہ رہی تھی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گرتی رہے۔ اس پر مقدس سا سحر طاری ہوتا جا رہا تھا۔

ساجی نے آنگن کی کھرلی پر بندھے مویشیوں کو دیکھا تو اسے خیال آیا کہ دھوبی ٹنگر باہر نکلے بہت دن ہو گئے ہیں جمیل کی گھڑی اسے سب سے سستی نظر آئی۔ وہ بہت دیر گھڑی کو دیکھتی رہی اور اٹھ بیٹھی۔ اس نے کوٹھیوں میں دودھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ دودھ جمالینی تھی اور بلو کو آٹھ دس روز سکھن جمع کر کے رسی بٹ کر گھی بنا کر کنستر میں ڈال دینی تھی۔ دادا نے کہا تھا کوئی گھر بیٹھے بٹھا جایا کرے گا لیکن شہر میں دور دودھ دینا نڑا۔

دھوپ نکھری ہوئی تھی اور بادلوں کے ٹکڑے وادیوں میں اترتے آتے تھے۔ ساون میں ایسی دھوپ کیساں! گھڑی دو گھڑی سورج نظر آتا تھا پھر دھند میں چھپ جاتا تھا۔

اُس روز دھوپ نکلی تو ساجی مویشیوں کو ہانک کر دمیں لے گئی جہاں وہ ہمیشہ چلا کرتی تھی۔ ساون کی بارشوں نے چند دنوں میں ہی گھاس کو اس قدر اونچا کر دیا تھا اور جھاڑیوں اور خودرو بیلیں اس قدر گھنی ہو گئی تھیں کہ ان میں گائے بھینسیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ ساجی کے دل پر ناگوار سا بوجھ تھا۔ جب وہ چراگاہ میں پہنچی تو دل کا بوجھ اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ یہی جگہ تھی جہاں اس نے پیار کا پہلا لفظ سنا تھا اور اس پر خمار طاری ہو گیا تھا۔ اس نے اسی جگہ انگوٹھی کی زبان میں جمیل کے ساتھ دلوں کا سودا کیا تھا۔

سینے میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ مویشی چرنے کے لیے بکھر گئے تھے۔ ساجی اسی پیڑ تلے جا بیٹھی جہاں جمیل کے سینے کی تپش اور ہونٹوں کے لمس نے اس پر آسمانوں کے پٹ کھول دیئے تھے۔ اس کے تصورات اس علاقہ میں بھٹکنے لگے جہاں جمیل بیٹھا کرتا تھا۔

وہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان کے پیار کی تماشائی ایک فاختہ تھی جو اُن کے سروں پر سایہ کیے ہوئے پیڑ پر گھونسلے میں بیٹھی رہتی تھی۔ آج وہ فاختہ بھی نہیں تھی۔ کل کے طوفان باد و باراں نے اس آشیاں کے تنکے بکھیر دیئے تھے۔ ساون کی ہوائیں گھنی ہریالی سے سسک سسک کر گزر رہی تھیں جیسے ساجی کے روگ میں سسکیاں لے رہی ہوں۔

ساجی نے سر ہاتھوں میں تھام لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جنگل کی اداس اداس سی "سال سال" سے سرگوشی اُبھری۔ "ساجی!"

ساجی نے اسے جنگل کی سرگوشی! اپنے سے ذہن کی صدا سے بازگشت سمجھ کر دھیان نہ دیا۔

جھاڑیاں زور سے کانپیں۔ سرسراہٹ سے۔ ساجی کو چونکا دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ جھاڑیاں پھر ہلیں تو ساجی کو خواب فادھو کے ہونے لگا ——— اس کے سامنے جمیل کھڑا تھا ——— اس کے چہرے پر بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ سر کے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ شربتی آنکھوں میں انوکھی سی چمک تھی۔ قمیض اور شلوار نما تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑا تھا اور ساجی اسے

بھر رہی تھی۔ اس نے جمیل کے سراپا کو واہمہ سمجھا اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

"ساجی!"

جمیل نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اٹھایا اور اس کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا ——— "ساجی! شاید تم نے مجھے فادھو سمجھ لیا ہے..... چلو جاؤں؟"

ساجی آنکھیں اور منہ حیرت اور خوف سے کھولے آہستہ آہستہ اٹھی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ وہ اس کو دیکھ دیکھ کر دیکھنا چاہتی تھی۔

"حیران نہ ہو ساجی!" ——— جمیل نے کہا ——— "میں ہی ہوں!"

"کہاں کھو گئے ہو؟ یہ کیا ہو گیا ہے جمیل؟" ——— اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے جمیل کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ہاتھوں کو دبا دبا کر محسوس کیا۔ جب یقین ہو گیا کہ یہ جیتا جاگتا جمیل ہے تو بولی ——— "اب آئے ہیں کوئی نہیں پکڑے گا۔ میں نے تھانیدار کو بتا دیا ہے۔" اور ساجی نے اسے بتایا کہ جمیل انگوٹھی سے دنیا کی نگینوں سے نوٹ بوٹوں میں پھینک دیا ہے۔ اس کا بھید کھل گیا ہے اور اب کوئی خطرہ نہیں۔ ساجی نے یہ بھی بتایا کہ پہلے والا تھانیدار کہیں چلا گیا ہے اور دو نئے تھانیدار آتے ہیں۔ ساجی نے بتایا کہ جس دکاندار سے انگوٹھی لی تھی وہ بھی دکان بند کر کے کہیں چلا گیا ہے اور اڑتے اڑتے سنی ہے کہ مارا گیا ہے یا اسے کوئی اٹھا لے گیا ہے۔

"اور جمیل!" ——— ساجی نے سہمی ہوئی رازداری سے کہا ——— "سنا ہے پہلے تھانیدار کو بھی ڈاکو اٹھا لے گئے ہیں۔ کہتے ہیں اس کا کوئی پتہ نہیں کہاں ہے۔"

جمیل چونکا ——— یہ انکشاف اس کے لیے انگوٹھی کا راز کھل جانے کے باوجود خطرناک تھا۔ اسے یہ احساس ستا رہا تھا کہ اور جیسے بادشاہ کے ساتھ وہ باہر آ کر ٹھہر نہیں لے سکے گا۔ اس نے تو کردار کو قتل ہی ہونا جانے وہ کیسے بچ گیا تھا۔

"میری ماں تو نہیں آئی؟" ——— جمیل نے پوچھا ——— "اسے خط تو مل گیا ہوگا؟"

"نہیں تو!" ——— ساجی نے کہا ——— "ابھی نہیں آئی۔"

"وہ ایسی نہیں کہ میرا خط ملے اور نہ آئے۔" ——— جمیل اداس سا ہو کے بولا ——— "مجھے اس کا بہت فکر ہے۔ جانے خط لکھنے والے نے کاؤں کا اتا پتا بھی صحیح لکھا تھا یا نہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں بھٹک نہ گئی ہو..... تو! ایک کام کرو۔ میری ماں کو ایک اور خط لکھا دو۔ لکھوانا کہ تم نہیں آئی تو اب نہ آنا۔ میں واپس آ رہا ہوں۔ اس کا جواب آنے تک میں یہیں کہیں چھپا رہوں گا۔ خط جوابی لکھوانا۔ ماں کا جواب آ جائے گا تو میں کافی دن جاؤں گا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

ساجی نے اس کی قمیض کے تار تار گریبان کو دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا جیسے کوئی غیبی قوت اس سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رطہ بہی ہو۔ ندی کا قہر ایسا ہی تھا۔ غضب ناک موجوں نے اسے کمرے سمیت کھینچنے دینے کی کوشش کی جو نے پرکشش ناکام بنادی۔ ندی کی موجیں اس کے اُوپر سے گزریں۔ جمیل سیلاب کو جیتا نگلا۔ ندی اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جمیل اس کے بہاؤ کے ساتھ بہا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دور آگے چل کر، آبشار کی طرح چالیس پچاس فٹ نیچے گرتی تھی۔

جمیل سیلاب سے لڑتا پار چلا گیا۔

بارش اور تیز ہوتی جا رہی تھی اور طوفان بڑا ہی تند و تیز تھا۔ بارش کے قطرے ہوا کی تندی سے جسم پر خلیے کی چھڑی ہوئی لکڑیوں کی طرح لگتے تھے۔ جمیل ان سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کے سینے سے جو جذبات کا طوفان اُٹھا تھا، وہ باہر کے طوفان سے کہیں زیادہ تیز و تند تھا۔ وہ یوں چلا جا رہا تھا جیسے میدان میں جا رہا ہو۔ اگر طوفان باد و باراں نہ ہوتا تو بھی رات کو یہ علاقہ اس قدر ڈراؤنا تھا کہ کوئی اور ہوتا تو اُس پر غشی طاری ہو جاتی۔

جمیل بارش کو چیرتا، طوفان کا مقابلہ کرتا، گرتا، اٹھتا، پہاڑیوں سے نکل گیا اور کشمیر لوانٹ کے قریب بلندی پر جا رکا۔ بارش کی دھند میں اسے کوٹھیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ طوفان اسے کھڑا نہیں ہونے دے رہا تھا۔ وہاں اس کا مانع اپنے غالب میں آنے لگا۔ تب اُس نے محسوس کیا کہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے اور کے دانت بج رہے ہیں۔ اس نے مرغی کی ٹیوں کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ عقل جذبات کی سے آزاد ہو گئی۔ وہ اس ارادے سے نکلا تھا کہ ساجی یا اس کے دشمنوں تک پہنچے گا۔ ساجی کے دشمن میں تھے۔

اس نے بائیں طرف دیکھا۔ دور نیچے اسے بلکی بلکی، مدھم مدھم وہ روشنیاں نظر آئیں جو صرف کوٹھی نظر آ سکتی تھیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ ساجی کا گاؤں ہے اور وہاں روشنی ہو گی۔ اس طوفان کی دھند میں بھی کسی اور کو وہ روشنیاں نظر نہیں آ سکتی تھیں۔ جمیل نے سوچا کہ ہو سکتا ہے ساجی گھر ہی ہو۔ تھانے کیا تو پکڑا جائے گا پھر وہ ساجی سے کسی کام نہیں آ سکے گا۔

عقل بیدار ہوتی تو اس کے احساسات بھی بیدار ہونے لگے۔ اسے ساجی کے گاؤں تک پہنچنا نظر آنے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ وہ اتنے دشوار علاقے سے اسی طوفان میں یہاں تک آ گیا ہے تو ساجی کے گاؤں تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ پکڑے جانے کا وہاں بھی خطرہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس گاؤں میں اس کے دادا کو چھوڑ کر سب اس کے دشمن ہیں۔ اسے یہ ڈھکی تھا کہ وہاں سی۔ آئی۔ ڈی پہنچے اور پولیس کہتے ہیں۔ کے آدمی بھی ہوں گے۔ مگر ساجی کو دیکھنے اور یقین کرنے کا ارادہ کہ وہ محفوظ ہے۔ تھا۔ سے طوفان اچھالنے لگا۔ اس کے دل سے دماغ کی طوفان تھم نہ جا سکے۔

باد و باراں کے اس قیامت خیز ہنگامے میں کمر سے کون کل سکتا تھا یہی فائدہ جمیل کو نظر آ کانپتا بلند ہی سے اُترا۔ سڑک پار کی اور وہ اُترائی اترنے لگا جس پر شک ہو اور وہاں کی روشنی میں بھی

محال تھا۔ وہ بیٹھ گیا، جھاڑیوں اور درختوں کو پکڑتا پاؤں پر نیچے کو سرکنے لگا۔ درختوں کے تنے بھیگ گئے تھے۔ ان پر ہاتھ جمتا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بارش کی تیزی اور طوفان کی تندی جمیل خودکشی کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں کلدار کی بھتیجی سے ملنا چاہتا ہوں"۔ تھانے میں انسپکٹر شاہ سی۔ آئی۔ اے کے اپنے ساتھی انسپکٹر حمید اللہ خان سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے ان کے درمیان کوئی ٹریڈ نظر آتی ہے۔ کلدار اور اس کی بھتیجی کے درمیان کچھ ہوا یا کوئی غلط فہمی ہے؟"

"شاہ جی!"۔ انسپکٹر حمید نے کہا۔ "آپ نے کلدار کی بھتیجی، کیا نام ہے اس کا... نیلوفر، کبھی غور نہیں کیا؟ اتنی حسین لڑکی اور ایسی جوان، کیا یہ چال چلن کی صاف ستھری ہو گی؟ اس کلاس کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ اپنے خاوند کو اس نے خود مروایا ہے اور اپنے آپ کو پوری طرح مظلوم ظاہر کرنے کے لیے ڈاکہ زنی بھی کرائی ہے۔ مگر حمید کی مدد کے بغیر ڈاکہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکہ آنے اور اُسی کمرے میں گئے تھے جہاں اُن کے مطلب کے فرنگ پڑے تھے اور اُنہوں نے میز کی دہی دراز کھولی جہاں اُن کے بانیڈر کے مطلب کے کاغذات رکھے تھے۔"

"کاغذات کا یہ لڑکی کیا استعمال کر سکتی ہے؟"

"اس کے آشنا کے کام کے ہوں گے"۔ انسپکٹر حمید نے کہا۔ "یہی راز معلوم کرنا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ کلدار کی سوسائٹی میں ہمارے جو مخبر ہیں وہ یہی بتا چکے ہیں کہ یہ لڑکی اپنی سوسائٹی کی عورتوں کی طرح بے چلن اور بے حیا نہیں"۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "مخبروں نے تمہاری موجودگی میں بتایا تھا کہ اس کا خاوند زندہ تھا اور اس کے ساتھ نظر آتی تھی۔ اس کے گھر اس سوسائٹی کے شہزادے اس طرح میں جاتے تھے جس طرح دوسری کوٹھیوں میں ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس لڑکی میں بے حیائی نہیں۔"

"جسے ہم بے حیائی کہتے ہیں، اسے یہ لوگ عیش کہتے ہیں"۔ انسپکٹر حمید نے کہا۔ "انگریز یہاں اپنا ہی تمدن چھوڑ گئے ہیں جس میں اتنی لذت ہے کہ ان لوگوں نے اسے اپنا کلچر بنا لیا ہے جو کسر رہ گئی تھی وہ امریکہ والے پوری کر رہے ہیں۔ جو یہاں مشیر اور نہ جانے کیا کیا بن کے آئے ہیں۔ میں یہ مان لیتا ہوں کہ یہ لڑکی بے حیا نہیں ہے اور سوسائٹی میں گم گشتی پھرتی ہے لیکن میں یہ نہیں مانوں گا کہ کسی ایک آدمی کے ساتھ اس کی آشنائی نہیں ہے۔ ہمیں اس لڑکی کو شاملِ تفتیش کرنا پڑے گا اور مخبروں سے اس کے متعلق مزید حالات معلوم کرنے ہیں گے۔"

"حمید بھائی!"۔ انسپکٹر شاہ نے کہا۔ "بہت دن ضائع ہو چکے ہیں۔ دیکھ رہے ہو کہ ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی ہمارا کیا حشر کر رہے ہیں۔ وقت زیادہ نہیں ہوا۔ میں ابھی نیلوفر کے گھر چلا جاتا ہوں۔"

"اس طوفان میں؟"

www.paksociety.com